

خدا

افق

سایه دار

طلوع اسلام (رجسٹرڈ) ٹرسٹ

بی گلیگ، لاہور ۲۵

خدا اور سرمایہ دار :-	نام کتاب
طلوع اسلام ٹرسٹ :-	شائع کردہ
25-B، گلبرگ 2، لاہور۔ 54660 :-	
خالد منصور نسیم :-	طابع
النور پرنٹرز و پبلشرز :-	مطبع
3/2 فیصل نگر۔ ملتان روڈ، لاہور۔ 54500 :-	
دوم 1996ء (بلا ترمیم) :-	ایڈیشن

(حقوق بحق طلوع اسلام ٹرسٹ محفوظ ہیں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فہرست

خدا اور سرمایہ دار

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۷	کے مطابق رکھ سکتے ہیں۔	۳	فہرست
۱۸	اس کے لئے جذبہ محرکہ کیا ہے۔	۷	پیش لفظ
۱۹	یہی اصل سوال ہے۔	۹	(۱) اسلام کے معاشرتی نظام کا خاکہ
۲۱	افراد کی ضروریات کا تعین کون کرتا ہے۔	۱۰	بھوک اور افلاس خدا کا عذاب ہے۔
۲۲	قرآن میں حدتہ۔ خیرات۔ وراثت	۱۲	دنیا میں بھی عذاب اور آخرت میں بھی
۲۳	وغیرہ کے احکام سے کیا مقصود ہے۔	۱۳	جنت کی زندگی رزق فراواں کی زندگی جس میں
۲۵	استفسارات اور ان کے جواب	۱۴	سب برابر کے شریک ہوتے ہیں۔
	(۲) ملکیت زمین	۱۵	تمام افراد کو رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری اسلامی
۲۶	قرآن کی روش سے زمین پر کسی کی ذاتی	۱۶	معاشرہ پر ہوتی ہے۔
۲۷	ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔	۱۷	اس لئے رزق کے چشمے انفرادی ملکیت کے بجائے
۲۸	لیکن مسلمانوں نے (بعد میں) اپنے ہاں	۱۸	معاشرہ کی تحویل میں رہنے چاہئیں۔
۲۹	غیر اسلامی نظام رائج کر لیا۔	۱۹	افراد اپنی محنت کی کمائی میں سے صرف اپنی ضروریات

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
	(۵) زرعی اصلاحات		(۳) زمینداری اور جاگیرداری
۷۵	ملکت پاکستان کی زرعی اصلاحات۔	۳۳	زمینداری اور جاگیرداری کا نظام اسلام کے
۷۶	مذہبی پیشوائیت کی طرف سے مخالفت۔	-	خلات ہے۔
۷۸	ان اصلاحات کا تجزیہ اور تبصرہ۔	۳۴	مصر کے منتر سید قطب (مروج) کی تحقیق۔
۸۰	یکس حد تک اسلامی ہیں؟	۴۰	عبد رسالت و خلفائے راشدین میں زمین کی
	(۶) اقبال اور اشتراکیت	-	حیثیت۔
۸۲	نکیر اقبال کا بنیادی حشر قرآن کریم تھا۔	۴۱	زمین، بٹائی یا کرایہ پر نہیں دی جاتی تھی۔
۸۳	اقبال نے قرآن کے معاشی نظام کا گہرا مطالعہ	۴۵	واقعہ خیر کی حقیقت۔
..	کیا تھا۔	۴۹	اسلامی نظام کا ما حاصل۔
-	اس کی منکری ارتقاء کے تین دور۔		(۴) قرن اول میں زرعی نظام
۸۴	معاشی دنیا کے تقاضوں کا تاثر۔	۵۱	زمین ملکیت کی تحویل میں وہی تھی۔
..	مزدور اور خواجہ کی کشمکش۔	۵۲	قطائع کاشت کے لئے دیئے جاتے تھے۔
۸۶	کمپوزنم کا فلسفہ اور اقبال	۶۱	حکومت کو ان کے دلپس لے لینے کا بھی حق
۸۸	ردس کے فلسفہ اشتراکیت پر تنقید۔	-	حاصل تھا۔
۸۹	اشتراکیت اور خدا کو یک جا کر دیا جائے تو	۶۳	راضی پر اختیار کئی ملکیت کو حاصل تھا
-	اس کا نتیجہ اسلام ہوگا۔	۶۴	انگہفتہ کی تصریح۔
	(۷) ربو کی بحث	۶۶	جو غیر مسلم اسلام لے آتے تھے ان کی اراضیات
۹۲	یہ بحث کہ سود جائز ہے یا ناجائز	-	کا معاملہ۔
..	قرآن نے ربو کو حرام قرار دیا ہے۔	۷۲	حضرت عمر نے مسلمانوں کو زمین اور جائیداد
۹۳	ربو کا شرعی مفہوم	-	رکھنے سے قانوناً منع کر دیا تھا۔
۹۴	ربو کے معنی سود ہی نہیں۔	۷۳	یہی قانون حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی
-	اس سے مراد سرمایہ پر منافع کے ہیں۔	-	جاری کیا تھا۔

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۱۷	ذہبی پیشوا اینٹ بچی سرمایہ داری کا ساتھ دیتی تھی۔	۹۵	قرآن کی رو سے معاوضہ محنت کا ہے۔ سرمایہ کا نہیں۔
۱۲۳	اسلام نے نظام سرمایہ داری کا تختہ الٹ دیا۔	۹۶	بیع (تجارت) اور رقبہ میں منق۔
۱۲۵	لیکن بعد میں مسلمانوں نے اسے پھر اختیار کر لیا۔	-	ہمارے ہاں سرمایہ پر منافع کی اور شکلیں جائز سمجھی جاتی ہیں اور صرف سود کو حرام بتایا جاتا ہے۔
۱۲۶	موجودہ اسلام وہی ہے جو دور سوئیت میں وضع کیا گیا تھا۔	-	حالانکہ اس منافع کی ہر شکل ناجائز ہے۔
-	لیکن حقیقی اسلام قرآن میں محفوظ ہے۔	۹۷	اس مشکل کا حل نثران کے معاشی نظام میں ہے۔
-	اور وہ نظام سرمایہ داری کا دشمن ہے۔	۹۸	ہے۔
	(۹) زکوٰۃ		(۸) خدا۔ اور سرمایہ دار
۱۲۹	زکوٰۃ کی موجودہ شکل۔	۱۰۳	حق اور باطل کی کشمکش ابتداء سے چلی آ رہی ہے۔
۱۳۰	اس پر اعتراضات۔	۱۰۴	حق، نوع انسان کے مفاد عامہ کا علمبردار ہے۔
۱۳۳	زکوٰۃ کا نثرانی مفہوم	-	باطل، گمراہہ بنانا مفاد کا متقاضی ہے۔
-	اسلامی مملکت کا فریضہ تمام افراد کے لئے	-	اسی کا دوسرا نام نظام سرمایہ داری ہے۔
-	سامان نشوونما پیدا کرنا ہے۔	-	دین، اس نظام کے خلاف چیلنج تھا۔
-	اسی سامان نشوونما کو زکوٰۃ کہتے ہیں۔	۱۰۵	انہی کے کرامت اس نظام کی مخالفت کرتے تھے۔
۱۳۴	لہذا، اسلامی مملکت "زکوٰۃ" دیتی ہے۔	-	اور نظام سرمایہ داری کے حامل انہی
-	یعنی نہیں۔	-	کرامت کی دعوت کے خلاف محاذ قائم
۱۳۵	اس کے لئے ہر زمانہ کی اسلامی حکومت	-	کر لیتے تھے۔
-	خود قواعد و ضوابط وضع کرے گی۔	-	حضرت نوح سے لے کر حضور خاتم المرسلین تک
	(۱۰) کمیونزم اور اسلام	-	یہی کشمکش رہی۔
۱۳۸	معاشی نظام کی اہمیت۔	۱۱۱	خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لئے کھلی رہنی چاہیے۔
۱۳۹	مفسی تو رہیں خداوندی کی مخالفت آتی ہے۔		

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۹۲	اس فلسفہ کا حبابزہ۔	۱۲۰	رزق بیا کرنے کی ذمہ داری معاشرہ پر ہے۔
۱۹۶	شر آئی فلسفہ حیات۔	۱۲۲	خدا اور معاشرہ کا باہمی تعلق۔
۲۰۸	مٹانوں اعداد۔	۱۲۴	زمین پر انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتی۔
۲۱۱	غیر متبدل قوانین۔	۱۲۴	کمانے کی استعداد میں فرق۔
۲۱۳	مستقل اقدار۔	۱۵۱	دولت کا اکتناز نہیں کیا جاسکتا۔
۲۲۳	فلسفہ کا اثر معاشی نظام پر۔	۱۵۳	فائزہ دولت کسی کے پاس نہیں رہ سکتی۔
(۱۳) ایک خط اور اس کا جواب		۱۵۴	ضروریات کا تعین کون کرے گا۔
۲۲۰	کیونٹزم کے حامیوں کے اعتراضات۔	۱۵۸	کام کرنے کا جذبہ مہر کہ کیا ہو سکتا ہے۔
۲۲۳	ان اعتراضات کے جوابات	۱۶۰	ہشتر کی نظام کی اساس کمزور ہے۔
(۱۴) اسلامی سوشلزم یا قرآن کا ہشتر کی نظام		۱۶۵	چند اعتراضات اور ان کے جواب۔
۲۵۹	مسلمان کسے کہتے ہیں۔	(۱۱) اساس حکم	
۲۶۰	خدا کی ذمہ داری کیسے پوری ہوتی ہے۔	۱۶۲	کیونٹزم کا معاشی نظام اور فلسفہ حیات۔
۲۶۱	ملکیت کا تصور۔	۱۶۳	اس کے فلسفہ حیات کی بنیادی کمزوری
۲۶۲	نہ سب پرستوں کی طرف سے اعتراضات۔	۱۶۴	مادی نظریہ حیات کچھ قسم کی اساس جیسا
۲۶۳	اس کا جواب۔		کرتی نہیں سکتا۔
۲۶۸	اسلامی سوشلزم کے داعی۔	۱۶۵	یہ اساس حکم و شرعی نظریہ حیات بیا کرتا ہے۔
۲۶۹	یہ اصطلاح مفالطہ انگریزی ہے۔	۱۶۸	اسی نظریہ حیات پر ہشتر کی نظام معیشت
۲۶۱	قرآن کا سوشل سسٹم۔		کی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔
(۱۵) نظام روہیت کب و کس نام ہوگا		۱۸۳	چین کے ہشتر کیوں کے لئے لمحہ و تکریہ
۲۶۶	بتیالی تنہا کے مظاہرے۔	(۱۲) ماؤزے سے تنگ اور قرآن	
۲۶۸	ضبطی عشق کے تقاضے۔	۱۸۴	کیونٹزم کا فلسفہ۔
۲۶۹	یہ انفرادی چیز نہیں	۱۹۱	علم کسے کہتے ہیں۔
۲۷۰	یہ اسلامی مملکت کی طرف سے نافذ ہو سکتا ہے۔		
۲۸۰	اس کیلئے قلب و مانع کا انقلاب ضروری ہے۔		

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

یوں تو معاشی مسئلہ تاریخ انسانیت کے جز و لازم کی حیثیت سے ساتھ کے ساتھ چلا آرہا ہے لیکن ہمارے زمانے میں اس نے ایسی اہمیت اختیار کر لی ہے کہ اسے کہتے ہی غصہ معیشت ہیں۔ اس وقت دنیا جن دو بلاکوں میں بٹ رہی ہے ان کی بنیاد بھی معاشی نظام کا اختلاف ہی ہے۔ یہ تصادم ہے نہ کہ نظام سرمایہ داری اور کمیونزم کے اشتراکی نظام کا۔ نظام سرمایہ داری کے متعلق اقبال نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ

گیا دور سرمایہ داری گیا نماشا دکھا کر مداری گیا

لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ بچتے جاتے بھی ہزار تباہی میں ڈھابھائے گا۔ چنانچہ اس وقت اس کی حرکت مذہبی جو خون کے پھینٹے اڑا رہی ہے اس سے زمین لالہ ہار ہو رہی ہے۔ اس کے مد مقابل اشتراکی نظام ہے جسکی ابتداء روس سے ہوئی اور وہاں سے آگے بڑھ کر وہ چین میں پہنچا۔ لیکن اس وقت اس نظام کے فلسفہ کے متعلق خود روس اور چین میں جس قدر اختلاف رونما ہو چکا ہے وہ اپنی شدت میں اس سے کم نہیں۔ جو نظام سرمایہ داری اور اشتراکی نظام میں وجہ نفاذ اور حیات بنا تھا اور جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اسلام کا دعوے ہے کہ وہ انسانی زندگی کے تمام بنیادی مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔

اس کے اس دعوے کے پیش نظریہ سوال سامنے آتا ہے کہ اسلام انسانی زندگی کے اس اہم ترین مسئلہ کا حل کیا پیش کرتا ہے؟ اسلامی شریعت کے علمبردار۔ یعنی ہماری مذہبی پیشوا میرٹ۔ جس معاشی نظام کو اسلامی کہہ کر پیش کرتے ہیں، وہ اس قسم کا سرمایہ دارانہ نظام ہے جسے خود نظام سرمایہ داری کی حامل تو ہیں بھی بہت پیچھے چھوڑ آئی ہیں اور جو اب زمانے کے تقاضوں سے حالت نزع میں ہے۔ اگر اسلام نے اس مسئلہ کا

یہی حل پیش کیا تھا تو اس کا نوع انسان کی نجات کا ضامن ہونے کا دعویٰ محل نظر قرار پا جاتا ہے۔ اور اگر نظام سرمایہ داری کے برعکس، اشتراکی نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے تو پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس نظام کے متعلق اسلام کا رد عمل کیا ہے؟ اور اگر اسلام ان دونوں سے الگ کوئی اور نظام پیش کرتا ہے تو اس نظام کی تفصیل کیا ہے اور اس کے اطمینان بخش ہونے کی ضمانت کیا؟

طلوع اسلام اس دعوے کا حامی ہے کہ قرآن کریم نوع انسان کے تمام بنیادی مسائل کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے اس بنا پر اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ معاشی نظام جیسے اہم ترین مسئلہ کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بنا لے۔ چنانچہ اس نے گزشتہ ہر سال میں اس موضوع پر ہزار ہا صفحات شائع کئے ہیں۔ ان میں نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد اور اشتراکی نظام کے فلسفہ اور معاشی نظم و نسق کا تجزیہ کر کے ان کا تقابلی مطالعہ کیا اور اس کے بعد شرح و بسط سے بتایا کہ قرآن کریم کو نسا فلسفہ زندگی اور اس پر متفرع کس قسم کا معاشی نظام پیش کرتا ہے اور ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے جو کچھ اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے اس کی اصل و حقیقت کیا ہے؟

ان مقالات کی اہمیت کے پیش نظر ہمیں مسلسل تقاضے موصول ہو رہے تھے کہ انہیں مرتب کر کے اس طرح یک جا شائع کیا جائے کہ اس مسئلہ کے تمام پہلو سامنے آجائیں۔ چنانچہ یہ مجموعہ (ضروری نظر ثانی کے بعد) پیش خدمت ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ اس اہم مسئلہ کے سمجھنے اور اس کو معنی کے سلجھانے میں مدد و معاون ثابت ہوگا۔

(۱) اس سے پہلے اس موضوع پر پرویز صاحب کی ایک خود مکتفی تصنیف، نظام رپوبلیک کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ جو احباب قرآنی نقطہ نگاہ کو زیادہ وضاحت سے سمجھنا چاہیں، اس کتاب کا مطالعہ ان کے لئے مفید رہے گا۔

(۲) اس کتاب کے اعلیٰ ایڈیشن کے ساتھ، عالم اشاعت کی غرض سے، چیمپ ایڈیشن بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

اکتوبر ۱۹۶۶ء

اسلام کے معاشی نظام کا خاکہ

(پرویز صاحب کی ایک تفسیر)

انسانی بچہ جب دنیا کی فضا میں پہلا سانس لیتا ہے تو بھوک سے چلاتا ہے اور اپنے رزق کے حصول کی طرف لپک کر جاتا ہے۔ اور جب انسان اس دنیا میں آخری سانس لیتا ہے تو بھی اس کے حلق میں کچھ ٹپکایا جاتا ہے تاکہ اسے کچھ نہ بچھ تو انسانی عمل کے۔ جب وہ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو کہنے والے یہی کہتے ہیں کہ اس کے حصے کا رزق ختم ہو گیا تھا۔ لہذا رزق کا معاملہ ایسا ہے جس سے انسان اپنی زندگی کے کسی سانس میں بھی تعلق نہیں رہ سکتا۔ انسانی زیست کے لئے اس سے زیادہ اہم مسئلہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جس شخص کو آرام سے بافراط کھانے پینے کو مل جاتا ہے اس کی زندگی کو بڑی کامیاب زندگی تصور کیا جاتا ہے۔ اور وہ خود بھی ایک ایک سانس میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے اسے رونے کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہونے دیا۔

انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر انسان کی اجتماعی زندگی پر غور کیجئے تو اس میں بھی یہی نظر آئے گا کہ قوموں کی تگ و تاڑ اور جدوجہد کے لئے سب سے زیادہ جذبہ محرکہ رزق کا سوال ہوتا ہے۔ رزق کی یہی اہمیت تھی جس کے پیش نظر مارکس اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ تاریخ انسانیت کی تعبیر ہی معاشی نقطہ نگاہ سے

کی جاسکتی ہے۔ جہاں تک سابقہ اقوام کی تاریخ کا تعلق ہے مارتس کا نظریہ معاشیات کی اہمیت صحیح ہو یا غلط اس کے متعلق تفصیلی گفتگو ذرا آگے چل کر کی جائے گی، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ چارے دوڑیں اس مسئلے نے اسی اہمیت اختیار کر رکھی ہے کہ آنے والا مورخ جب اس پر نگاہ ڈالے گا تو وہ اسے عصر معاشیات (AGE OF ECONOMICS) کے سوا کسی اور کے نام سے نہیں پکار سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج تہذیب، تمدن، معاشرت، سیاست، قومی مسائل اور بین الاقوامی معاملات سب کی باگ ڈور معاشیات کے ہاتھ میں ہے۔ اس وقت دنیا عملاً جن دو بلاکس (BLOCKS) میں بٹی ہوئی ہے، ان میں کبے کو تو خط امتیاز نظام حکومت ہے۔ یعنی ڈیکٹیشن اور جمہوریت۔ لیکن درحقیقت ان میں بنیادی اختلافات نظام معیشت (ECONOMIC ORDERS) ہی کا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ افراد ہوں یا اقوام، روٹی کے مسئلے نے دونوں کی ناک میں نیکیں ڈالی ہوئی ہے اور وہ انہیں بھڑھری چا ہے کشاں کشاں لگنے پھروا ہے۔

انسان نے اس اہم مسئلے کے حل کے لئے جب مذہب کے دروازے پر دستک دی۔ مذہب میری مراد ہے انسانوں کا خود ساختہ مذہب۔ تو اس نے یہ کہہ کر اپنا چھپا چھپا ایسا کہ ہمارا مقصد انسان کو مرنے کے بعد کی زندگی میں عذاب سے نجات دلانا ہے۔ اس دنیا کے مسائل سے جارا **مذہب اور روٹی** کوئی مسہرہ نہ بنے۔ یہ مادی دنیا، کثافت اور غلاظت سے بھری ہوئی ہے۔ اس خدا کے نیک بندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسے قابلِ نفرت سمجھیں اور جہاں تک ہو سکے اس سے بچیں۔ لیکن یہ محض فریب نفس تھا یا فرار کی راہ۔ اس لئے کہ انسان دنیا سے کتنی ہی دور کیوں نہ گیا اور اس طرح کتنا ہی بڑا ایشور کا بھگت کیوں نہ بن جائے، جب تک وہ زندہ ہے کھانے پینے کا محتاج ہے۔ وہ شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں بسیرا کر سکتا ہے لیکن خوراک کے مسئلے سے بھاگ کر نہیں نہیں جاسکتا۔ وہ خواہ چوہیں گھنٹے میں ایک مرتبہ ہی کیوں نہ کھائے۔ کھائے بغیر گزارہ ہو نہیں سکتا۔ بھوک ریشیوں میں کو بھی لگتی ہے اور پیروں نغیروں کو بھی۔ کھائے بغیر نہ "ایشور کے اذکار" زندہ رہ سکتے ہیں نہ اللہ کے مقرب۔ اس لئے انسانوں کے خود ساختہ "مذہب" کا یہ کہنا کہ اسے روٹی کے مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں، حقیقت کو بھٹلاتا اور لوگوں کو فریب دینا ہے۔ ایسے مذہب کے علمبرداروں کو روٹی کے مسئلے سے اس دلچسپی نہیں ہوتی کہ ان کی روٹی کا انتظام دوسرے لوگ کرتے ہیں۔

اسلام ہندسب نہیں بلکہ اللہ کے معنی ہیں نظام زندگی یا ضابطہ حیات۔ ظاہر ہے کہ جس نظام کا دعویٰ ہو کہ وہ انسان کی ساری زندگی کو اپنی آغوش میں لیتا ہے، اور جو ضابطہ حیات انسانی زندگی کے ہر گوشے کے لئے راہ نمائی دینے کا مدعی ہو، وہ انسان کے معاشی مسئلہ سے کس طرح چشم پوشی کر سکتا ہے۔ وہ روٹی کے سوال سے کس طرح آنکھیں بند کر سکتا ہے؟ چنانچہ قرآن نے اس مسئلہ کو پوری پوری اہمیت دی ہے اور اس کا ایسا حل بتایا ہے جو ان پریشانیوں کو نہایت آسانی سے دور کر دیتا ہے۔ جو انسان کو جہنم کی آگ کے شعلے میں گر چاروں طرف سے گھیرے رہتی ہیں۔

قرآن کریم نے معاشی مسئلہ کو کس قدر اہمیت دی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے کہا ہے کہ جس قوم کو روٹی

قرآن اور روٹی کا مسئلہ

کی فراوانی حاصل ہو، یہ سمجھو کہ اس پر خدا کا انعام ہے اور جو بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو، اس پر خدا کا غضب ہے۔ سورہ نحل میں ہے۔ **صَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا (۱۱۱) خذائتہیں مثال دے کر ایک بات سمجھانا ہے (مثلاً) قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ۔** ایک بستی تھی جو نہایت امن و اطمینان کی حالت میں تھی۔ اس کے کھانے پینے کا سامان (رزق) ہر جگہ سے بافراغت اس کے پاس چلا آتا تھا۔ **فَكَفَّرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ۔** اس نے اللہ کی ان نعمتوں کی ناشکر گزاری کی۔ تو ان کے اس جرم کی پاداش میں **فَأَذَانَهَا اللَّهُ لِيَبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۱۱۲) اللہ نے اسے بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا۔** یہ سب ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھا۔

آپ نے مذہبی حلقوں میں اس قسم کے فقرے سنے ہوں گے کہ انسان کو ہمیشہ احکام خداوندی کی اطاعت کرنی چاہیے جو شخص خدا کی نافرمانی کرے اس پر اس کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان سے پوچھے کہ وہ عذاب کیا ہوتا ہے تو وہ کہہ دیں گے کہ اس قسم کے انسان کو مرنے کے بعد جہنم میں بھیجا جاتا ہے اور وہ وہاں خدا کے عذاب کا مزہ اچھکتا ہے۔ مرنے کے بعد جہنم اور جنت سے کسی مسلمان کو الٹا نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرآن کریم قانون خداوندی سے اعراض برتنے (روگردانی کرنے) کا جو عذاب بتاتا ہے وہ اسی دنیا

میں سامنے آجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **وَمَنْ أَعْوَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا (۱۱۳)۔** ایاد رکھو، جو کوئی میرے قانون سے روگردانی

کرے گا تو اس کی روزی تنگ ہو جائے گی؟ اس سے ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی سے اعراض اور روگردانی کا نتیجہ رزق کی تنگی یعنی بھوک کا عذاب ہے۔

آپ نے بعض لوگوں کو کہتے سنا ہو گا کہ خدا اپنے بندوں کو عذاب میں ڈالتا ہے اور انہیں طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ انہیں کھانے کو روٹی نہیں ملتی۔ پینے کو کپڑا نہیں ملتا۔ مفلسی، تنگ دستی، بے کسی، بے چارگی انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔ وہ اس دنیا میں بڑی عسرت اور افلاس کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن ان کی عاقبت اتنی ہی زیادہ تابناک اور خوشگوار ہوتی ہے۔ لیکن قرآن کریم اس کے خلاف کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قوموں کی زندگی میں ایسے حوادث رونما ہوتے ہیں جن میں انہیں سخت مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مثلاً جنگ کے زمانے کی تکالیف اور مصیبتوں سے کون واقف نہیں جن میں بڑی بڑی خوش حال اور دولت مند قومیں بھی مبتلا ہو جاتی ہیں؟ لیکن یہ صرف ہنگامی حادثات ہوتے ہیں جو آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ لیکن عسرت اور فربوں حالی کسی فرد یا قوم کی زندگی کا معمول ہو جائے تو انہیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے کہ یہ خدا کے مقبول بندوں کی علامتیں ہیں۔

دنیا اور آخرت میں عذاب

یہ چند سزہ دنیاوی زندگی کے مصائب ہیں۔ اس کے بعد (آخرت کی زندگی میں) تمام خوشگواریاں اور سرفرازیاں انہی کے حصے میں آئیں گی۔ اس لئے کہ قرآن نے جہاں کہا ہے کہ مَنْ أَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا۔ (جو ہلکے قانون سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی) تو اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا ہے کہ وَ نَحْشُرُكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰی (۱۱۱)۔ اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے؟ اس سے ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی سے اعراض کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں رزق کی تنگی اور آخرت میں ذلت و رسوائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی رو سے زندگی ایک جوئے رواں ہے جو اس دنیا سے اس دنیا تک مسلسل چلی جاتی ہے اس لئے جن اعمال کے نتائج اس عاقبت کا اندھا

اور سترت آمیز نہیں ہو سکتے اس باب میں قرآن کا واضح فیصلہ ہے کہ

مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهِ اَعْمٰی فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۱۱۱)

جو اس دنیا میں اندھا یا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔

اقبال کے الفاظ میں۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں لکھتا

جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے

وہ قوم نہیں لاکت ہنگامہ فردا

جس قوم کی تفتدیر میں امر و نہی ہے

بہذا یہ دیکھنے کے لئے کہ کسی قوم کی عاقبت کی زندگی کیسی ہوگی یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کی اس دنیا کی زندگی کیسی

ہے۔ اگر اتنے سامانِ زینت کی فراوانی نصیب نہیں۔ اگر وہ رزق کی تنگی کے عذاب میں ماخوذ ہے۔ اگر وہ اپنی

روٹی کے لئے بھی دوسروں کے دروازے پر چھوٹی پھیلانے کے لئے مجبور ہے تو اس قوم کو عاقبت کی سرفرازیوں

اور سرہندیاں نصیب نہیں ہو سکتیں۔ یاد رکھئے! قرآن کی رو سے جنت اور جہنم کی زندگی یہیں سے شروع ہوتی

ہے اور آخرت تک مسلسل چلی جاتی ہے۔ قرآن نے انسان کی سرگزشت کو تفتدیر آدم کے تمثیلی انداز

میں بیان کیا ہے وہ اس میں بتاتا ہے کہ جب آدم جنت میں تھا تو اس سے کہہ دیا گیا تھا کہ اِنَّ لَكَ

جنت کی زندگی اَلْوَجْوَدَ فِيْهَا وَ لَا قَهْرٌ لَّيْ وَاَنْتَ لَوْ نَظَمْتَ اِيْنَهَا وَ لَا

نہ پیسا رہے اور نہ ہی دھوپ میں۔ یعنی اُس جنت کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کوئی فرد اپنی

بنیادی ضروریات زندگی (روٹی، پانی، لباس، مکان) سے محروم نہیں تھا۔ اس میں آدم اور اس کی بیوی

سے کہہ دیا گیا تھا کہ كُلْ مِنْهَا رَغَدًا رَحِيْمًا شَيْئًا مِنْهَا۔ تم اس میں سے جہاں سے چاہے باغ

کھاؤ و پیو، یعنی اس میں ہر ایک کے لئے ہر جگہ بافراط سامانِ رزق موجود تھا۔ یہ تھی وہ جنت ارضی جو ان

کی مفاد پرستیوں کی وجہ سے اس سے چھین گئی اور جسے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اسے خدا کی طرف سے راہِ نمانی

میلی اور اس سے کہہ دیا گیا کہ فَاِمَّا يَنْتَظِرُكُمْ مِّنْهُ هُدًى مِّنْ اَنْبِئَانَا اَمْ يَلْبَسُوْنَ

وَ لَا يَشْعُرُوْنَ (۱۰۰) سو جب تمہارے پاس میری طرف سے راہِ نمانی آئے۔ سو جو میری راہِ نمانی کا اتباع

کرے گا، تو نہ اس کی کوششیں رائیگاں جائیں گی اور نہ ہی وہ سامانِ زندگی سے محروم رہے گا۔ (اور

نہ ہی اسے ان کے حصول کیلئے جگر پاش مشتیں اٹھانی پڑیں گی)۔

فرزندانِ آدم کے لئے اس زمین پر ہی جنت کی دوبارہ تشکیل قرآن کا مقصود و نیت ہے۔

اسے قرآنی نظامِ ربوبیت یا (QURANIC SOCIAL ORDER) کہتے ہیں۔ قبل اس کے کہ

ہم یہ دیکھیں کہ قرآنی نظامِ ربوبیت قائم کس طرح ہوتا ہے اور اس میں انسان کو کیا کچھ حاصل ہوتا ہے

یہ دیکھنا ضروری ہے کہ قرآن کی رو سے روٹی کے مسئلہ کا حل مقصود بالذات ہے یا یہ کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے؟ یہ سوال بہت اہم ہے اس لئے کہ اسی بنیاد پر انسانی ہیئت اجتماعی کی پوری کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے اس کا اچھی طرح سمجھ لینا بہت ضروری ہے۔

زندگی کا ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی بچہ پیدا ہوتا ہے کھاپی کر پڑا ہوتا ہے۔ کام کاج کرتا ہے۔ کھانے پینے کا سامان حاصل کر کے۔ شادی کرتا ہے۔ صاحبِ اولاد ہوتا ہے۔ اولاد کو کلمنہ کے قابل بنادیتا ہے اور مر جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر زندگی کا مقصد اتنا ہی ہے تو پھر ایک حیوان اور انسان میں کچھ فرق نہیں۔ یہ کچھ بر حیوان کرتا ہی پیدا ہوتا ہے۔ کھاتا پیتا ہے۔ کام کاج کرتا ہے۔ اپنی نسل بڑھاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ قرآن اس زندگی کو کفر سے تعبیر کرتا ہے۔

حیوانی سطح کی زندگی

وَ الَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ۔ (۲۶) اور جو لوگ کفر کرتے ہیں، وہ (شعاعِ زندگی سے) فائدہ اٹھاتے ہیں اور حیوانات کی طرح کھاپی کر رہ جاتے ہیں، ان کا ٹھکانہ آگ ہے۔ اس کے برعکس، دوسرا تصور حیات یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم کا نام نہیں۔ انسان میں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جس کی ذات (HUMAN PERSONALITY) کہتے ہیں۔ انسان کی زندگی کا مقصد اس کی ذات کی نشوونما ہے جس سے ایک فرد اس دنیا میں بھی سرفرازی و سر بلندی کی زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں ارتقائے ذات کے مزید مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جو تمام نوع انسانی کو بھوک، خوف اور ظلم سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دے سکے۔

اس کا نام انسانی سطح کی زندگی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر افراد روٹی

انسانی سطح کی زندگی

سکتے ہیں لئے وہ کہتا ہے کہ ایسا معاشرہ قائم ہونا چاہیے جو افراد کو روٹی کی فکر سے آزاد کر دے تاکہ انہی کو انامیاں اور صلاحتیں، حیوانی سطح سے بلند ہو کر زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے فارغ ہو جائیں۔ قرآنی نظام ربوبیت افراد کو روٹی کی فکر سے آزاد کر کے انہیں انسانیت کی سطح پر لے آتا ہے۔ ہسلائی معاشرہ اس خدا کی ذمہ داریاں اپنے سر پر دینا ہوا جس کے قوانین کو عملنا مذکورہ کے لئے وہ وجود میں

رزق کی ذمہ داری آتا ہے تمام افراد معاشرہ سے، پورے حتم و یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ

غَنُّ بِرِزْقِكُمْ وَإِيَّاكُمْ (۱۵۱)

ہم تمہارے اور تمہاری اولاد کے رزق کی ذمہ داری لیتے ہیں۔

یہ ذمہ داری صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ اس مملکت کی حدود میں بسنے والے تمام ذی حیثیت کو محیط ہوتی ہے اس لئے کہ جس خدا کے نام پر یہ مملکت قائم ہوتی ہے اس کا اعلان ہے کہ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۵۲)۔ ”رودے زمین پر بسنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو“ اللہ کی یہ ذمہ داری اسلامی مملکت کے ہاتھوں کس طرح پوری ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے اس اعلان سے فرمائیے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ

اگر جلد کے کنارے کوئی کتابھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم عمر سے اس کی باز پرس ہوگی۔

اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد مملکت (بلکہ اس حدود میں بسنے والے تمام جانوروں تک) کے رزق کی ذمہ داری اپنے سر پر لے۔ جو مملکت اس ذمہ داری کو اپنے سر نہیں لیتی وہ اسلامی مملکت نہیں کہلا سکتی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مملکت ایسی عظیم ذمہ داری کو پورا کس طرح کر سکتی ہے؟ قرآن اس کا بھی جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس مملکت نے خدا کی ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے سر لیا ہے۔ رزق کے سرچشمے اور وسائل پیداوار

رزق کے سرچشمے مملکت کی تحویل میں

جو خدا کی ملک میں، اس مملکت کی تحویل میں

چلے جائیں گے تاکہ وہ ان کا ایسا انتظام کرے جس سے تمام افراد کی پرورش ہوتی چلی جائے۔ یہ وجہ ہے کہ اسلامی نظام روایت میں، رزق کے سرچشموں پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ نہ افراد کی اور نہ مملکت کی۔ مملکت بھی صرف ان کا انتظام کرتی ہے۔ رزق کے سرچشموں میں بنیادی حیثیت زمین (زمین) کو حاصل ہے جس سے نہ صرف اناج پیدا ہوتا ہے بلکہ تمام مصنوعات کے لئے خام مال بھی وہیں سے برآمد ہوتا ہے۔ زمین کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ اسے خدا نے مخلوق کی پرورش کے لئے

پیدا کیا ہے وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ (۲۱)۔ اس لئے اس کا انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ اس کا پیدا کردہ رزق تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلا رہے۔ سَوَاءٌ لِلنَّاسِ أَلْبَانٌ (۲۲)۔ اس لئے کہ یہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ (۲۳) ہے۔ یعنی بھوکوں کے لئے سامانِ زندگی۔ اسے اسی مصرف میں لانا چاہیے۔ اگر یہ افراد کی ملکیت میں چلی جائے تو اس سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے اسے معاشرہ کی اجتماعی تحریک میں رہنا چاہیے تاکہ جس مقصد کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے وہ مقصد پورا ہوتا رہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے سورہ الواقعہ میں بڑے دل نشین پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے اَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ۚ کیا تم نے اس پر بھی غور کیا جسے تم بوتے ہو؟ تم اتنا ہی کرتے ہو کہ زمین میں ہل چلائے ہو۔ اسے کاشت کے قابل بناتے ہو۔ پھر اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اس کے بعد سوچو کہ عَرَأَيْتُمْ تَزْرَعُوهُمْ أَمْ غِنَى الزَّارِعُونَ ۚ کیا اس بیج میں سے پودا تم پیدا کرتے ہو یا ہمارا قانون پیدا کرتا ہے؟ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكُهُونَ ۚ إِنَّ مَعْرُومُونَ ۚ بَلْ عَجَنْتُمْ عَجْرَتَكُمْ وَمُؤْنِكُمْ ۚ اگر ہمارا قانون اس کے خلاف چاہتا تو ہم اس کھیتی کو خشک سالی سے چورا چورا کر دیتے اور تم حیرت میں گم ہو جاتے کہ یہ کیا ہو گیا؟ ہم پر مفت میں چینی پڑ گئی۔ فصل، تو ایک طرف، ہم بیج سے بھی محروم ہو گئے۔

پھر آگے بڑھو اَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۚ کیا تم نے اس پانی پر بھی غور کیا جو تمہارے لئے زندگی کا سامان اور تمہاری کھیتی کے گنے کا ذریعہ بنتا ہے؟ ءَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ۚ کیا اسے باروں سے تم برساتے ہو یا ہم برساتے ہیں؟ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ لُجَاجًا فَلَوْ لَا تَشْكُرُونَ ۚ اگر ہمارا قانون دوسری طرح چاہتا تو ہم اسے ایسا بھارنا بنا دیتے جسے نہ تم پی سکتے نہ اس سے تمہاری کھیتیاں اُگ سکتیں۔ سو تم اس کے نذر دان کیوں کیا ہوتے؟

اور آگے بڑھو اَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۚ کیا تم نے اس آگ پر بھی غور کیا جسے تم جلاتے ہو۔ ءَأَنْتُمْ أَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ۚ کیا اس درخت کو جس سے آگ کا سامان ملتا ہے تم اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں۔

ذرا سوچو کہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس میں تمہارے لئے عبرت دہنوعظمت کی ہزار داستانیں

پوشیدہ میں شَعْنٌ جَعَلْتُمْهَا تَنْزِيحًا اِس سے سبق حاصل کرو۔ یہ سبق کہ یہ سب کچھ تمہارا پیدا کردہ نہیں۔ ہمارا پیدا کردہ ہے۔ تم اس میں صرف محنت کرتے ہو۔ اس لئے اس کھیتی میں تمہارا حصہ تمہاری محنت کے بقدر ہے۔ باقی سب کچھ ہمارا ہے۔ اسے ہم نے مَتَّعْنَا لِلْمُسْلِمِيْنَ ۵ (سورہ بقرہ ۲۶۷)۔ بھوکوں کے لئے سامانِ زیست بنایا ہے۔ اس لئے اس مالِ تُوْرزق کو ان کی ضروریات کے لئے کھلا رکھو۔ سارے کا سارا اپنی ملکیت نہ سمجھو۔

اِتِّبَالِ كَالْفَاظِ فِي غُورٍ كَرُوْهُ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاونچی میں کون
کون لایا کھینچ کر کچھم سے پلو ساز گا
کس بھری موتیوں سے خوشہ گندم کی حبیب

کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سدا
خاک یہ کس کی ہے کس کا یہ تو رافقا
موجوں کس نے کھلائی ہے غمے انقلا

وہ خدا یا نبی زمین تیری نہیں، تیری نہیں

تیرے آبا کی نہیں۔ تیری نہیں۔ میری نہیں (بال جبریل)

جو کچھ شرآن نے یہاں زمین اور اس کی پیداوار کے متعلق کہا ہے۔ وہی کچھ دوسرے مقامات پر عام روایت کے متعلق بھی کہا ہے۔ تارون کو شرآن نے نظام سرمایہ داری کے ناپیدہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تارون کی ذہنیت یہ تھی کہ وہ کہتا تھا کہ اِنَّمَا اُوْتِيْتُمْ عَلٰی عِلْمِكُمْ عِنْدِيْ (سورہ مائدہ) میری تمام دولت میری اپنی ہنرمندی کی وجہ سے ملی ہے۔ تارون کہتا ہے کہ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلٰكِنْ اَكْثَرُ هُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۵ (سورہ بقرہ ۲۶۷) یہ ذہنیت بڑی غلط تھی اور گمراہی پر مبنی ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے اور یہی کہے جاتے ہیں کہ جو کچھ انسان کماتا ہے وہ اس کی اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ حالانکہ اس میں کتنے ایسے بھی عنصر شامل ہوتے ہیں جن میں انفرادی طور پر اسے کچھ دخل نہیں ہوتا۔ مثلاً اس کی پیداگشی صلاحیتیں، تعلیم و تربیت۔ ماحول کے اثرات، معاشرہ کا نظم و نسق۔ مناسب مواقع OPPORTUNITIES کا ملنا وغیرہ۔

یہ تو رہا اس مسئلہ کا اصولی پہلو۔ جہاں تک اس کے عملی پہلو کا تعلق ہے۔ شرآن اسے نہایت عمدگی سے حل کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب افراد کی تمام ضروریات زندگی اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کیلئے سامان و ذرائع کی فراہمی کی ذمہ داری ملکیت اپنے سر لے لے تو دولت فرد اور ملکیت کا معاہدہ

فرد اور ملکیت کا معاہدہ

کا افراد کی ملکیت میں رہنا بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں انفرادی

اور مملکت میں ایک معاہدہ ہوتا ہے جسے قرآن نے نہایت مختصر لیکن جامع انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ اِنَّ
 اُمَّةً اَشْتَرْتَنِي مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۱۱۱) افراد معاہدہ
 اپنی جان اور مال اللہ (یعنی اس مملکت) کے سپرد کر دیتے ہیں جو خدا کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے قائم ہوتی
 ہے اور مملکت انہیں الجنۃ کی ضمانت دے دیتی ہے۔ الجنۃ کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جہاں
 اس دنیا میں خستی زندگی کا تعلق ہے، اس میں تمام سامان زیت اور ضروریات زندگی با فراغت ملتی چلی جاتی ہیں۔
 افراد اور مملکت کا یہ معاہدہ یونہی ذہنی طور پر نہیں ہوتا بلکہ اس سوسائٹی کا ممبر وہی بن سکتا ہے (بالفاظ دیگر میل
 ربی ہو سکتا ہے) جو برضا و رغبت بغیر کسی قسم کے جوڑا کرادہ کے، اس معاہدہ پر دستخط کرے۔ اس معاہدہ
 کی رو سے، ہر فرد اپنی محنت کے ما حاصل سے اپنے پاس صرف اتنا رکھ سکتا ہے جتنے میں اس کی ضروریات
 پوری ہو جائیں۔ باقی سب نوع انسانی کی پرورش کے لئے کھلا رکھنا ہے۔ اور مملکت کے فیصلے کے مطابق
 صرف کرتا ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے يَسْئَلُوْكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوُ (۱۱۶)۔ یہ تجھ سے پوچھتے
 ہیں کہ ہم (اپنی محنت کی کمائی میں سے) کس قدر دوسروں کے لئے دیدیں۔ ان سے کہو کہ میں قدر تمہاری
 ضرورت سے زائد سے سب کا سب۔ اس طرح قرآن، فاضل دولت (SURPLUS MONEY) کسی
 کے پاس نہیں رہنے دیتا۔ اور نظام سرمایہ داری کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ کیونکہ اس نظام کی بنیاد ہی فاضل
 دولت پر ہے۔

اس نظام پر یہ سوال سامنے آتا ہے جس کا رنظاہر، کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملتا اور جسے
 نظام سرمایہ داری (CAPITALISTIC SYSTEM) کی تائید میں بطور دلیل محکم پیش کیا جاتا ہے۔
 یہی وہ کھنور ہے جس میں روس کے معاشی نظام کی کشتی بری طرح بھنس رہی ہے اور اسے اس میں سے
 نکالنے کی کوئی تہ سیردہاں کے ارباب حل و عقد کے ذہن میں نہیں آتی۔ سوال یہ ہے کہ جب افراد معاشرہ
 کو یقین ہو جائے کہ وہ کام کریں یا نہ کریں ان کی ضروریات زندگی پوری ہوتی رہیں گی۔
جذبہ محرکہ اور انہیں اس کا بھی پتہ ہو کہ وہ کتنا ہی کام کیوں نہ کریں، ان کی ضروریات سے زائد دولت
 ان کے پاس رہ نہیں سکتی۔ تو اول تو وہ کام ہی کیوں کریں۔ اور اگر ان سے کسی طرح کام لیا بھی جائے
 تو وہ پوری محنت سے کام کیوں کریں؟ جس دولت کے متعلق وہ جانتے ہوں کہ ان کے پاس نہیں رہ سکتی
 وہ اس کے حصول کے لئے جان کیوں کھپائیں؟ لہذا اس قسم کے نظام کا نتیجہ یہ ہو گا کہ لوگ محنت سے

جی چرائیں گے اور ملک کی پیداوار اور قومی دولت روز بروز کم ہوتی جائے گی۔ روس اس وقت اسی مصیبت میں مبتلا ہے۔ کمیونزم نے غریبوں اور مزدوروں کو یہ کہہ کر انقلاب کے لئے ابھارا کہ تم اٹھو اور دو لاکھ مزدوروں سے ان کی دولت چھین لو۔ لیکن جب یہ مرحلہ گزر گیا اور جن دو لاکھ مزدوروں کے خلاف عوام کے دل میں نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکانی گئی تھی وہ باقی نہ رہے تو عوام کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔ اب وہاں کوئی جذبہ محرکہ ایسا نہیں ملتا جو عوام کو جانفروشانہ طور پر محنت پر آمادہ کر سکے۔ کمیونزم کی یہی بنیادی کمزوری ہے جس کی وجہ سے نظام سرمایہ داری کے حامل یہ کہتے ہیں کہ جب تک افراد کو اس لگاتار نہ ہو کہ وہ جو کچھ کمائیں گے ان کی ملکیت میں رہے گا وہ کبھی پوری محنت سے کام نہیں کریں گے، لہذا نظام سرمایہ داری ہی قابل عمل نظام ہے۔ کیونکہ اس میں (PRIVATE ENTERPRISE) کی عام اجازت اور حدود و قیاس و سوت ہوتی ہے۔ حالانکہ اگر بغور دیکھا جائے تو نظام سرمایہ داری کا یہ کہنا کہ اس میں افراد کی ساری دولت افراد کی ملکیت میں رہتی ہے، فریب اور سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ کمیونزم محنت کشوں سے زیادہ دولت براہ راست چھینتی ہے۔ کیونکہ نظام زیادہ دولت مختلف قسم کے (TAXES) کے ذریعہ کھینچ لیتا ہے۔ استبداد دونوں جگہ کارفرما ہوتا ہے۔ کیونکہ نہ اشتراکی نظام میں محنت کش اپنی فائدہ کمائی برضا و رغبت اسٹیٹ کے حوالے کرتے ہیں۔ نہ نظام سرمایہ داری میں لوگ بطیب خاطر ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

لہذا سوال یہ ہے کہ وہ جذبہ محرکہ کیا ہے جس کی رُو سے افراد زیادہ سے زیادہ محنت کریں اور اپنی فائدہ کمائی برضا و رغبت نظام کے حوالے کر دیں۔ پروفیسر (HWTREY) نے کہا ہے کہ جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبہ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

یہ جذبہ محرکہ صرف تران سے مل سکتا ہے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ تران کی رُو سے زندگی کا مقصد انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ انسانی

جسم کی پرورش کے لئے قانون یہ ہے کہ جسم کی پرورش ان چیزوں سے ہوتی ہے جنہیں ایک فرد خود کھانا یا استعمال کرتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ دوسروں کو کھلانے جائیں اور جسم آپ کا تنومند و توانا ہوتا جائے۔ لیکن اس کے

عکس، انسانی ذات کی نشوونما کے لئے قانون یہ ہے انسانی ذات کی نشوونما کا قانون کہ ایک فرد کی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے

جسے وہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے۔ لہذا جس قدر کوئی فرد دوسروں کی پرورش کے لئے دیتا جائیگا اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس شخص کی زندگی کا مقصود اپنی ذات (PERSONALITY) کی نشوونما (DEVELOPMENT) ہو وہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے کامیگا۔

اس میں سے صرف اپنی ضروریات کے لئے رکھے گا اور باقی سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے گا۔ ایسے شخص سے محنت کرنے کے لئے ڈنڈا یا منتر تو ایک طرف کسی وعظ و نصیحت کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ نیز وہ جو کچھ دوسروں کو دے گا اس کے لئے بدلہ یا معاوضہ تو کجا شکر یہ تک کا بھی خواہاں نہیں ہوگا، کیونکہ انہیں جو کچھ دیتا ہے خود اپنی ذات کی منفعت کے لئے دیتا ہے۔ ان پر احسان نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جب دوسروں کی پرورش کا انتظام کرتے ہیں تو ان سے کہہ دیتے ہیں اِنَّمَا نَطْعُمُكُمْ لَوَجْهِهِ اَللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّ لَا شُكْرًا ۝ (۳۳)۔ ہم تمہاری پرورش کے لئے جو انتظام کرتے ہیں تو یہ صرف قانون خداوندی کے اتباع میں کرتے ہیں (کہ ایسا کرنے سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے) اس لئے ہم تم سے معاوضہ تو ایک طرف، شکر یہ تک کے بھی خواہاں نہیں۔ یہ لوگ اپنی ذات کی نشوونما کے لئے اس قدر بے تاب ہوتے ہیں کہ یُوْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَّ لَوْ كَانَتْ بِهِنَّ خَصَاصَةٌ وَّ تَنَبُّهُمُ وہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ انہیں تنگی ہی میں گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس لئے کہ دُ جَانْتُمْ هِيَ اَمْ مَنْ يُّؤْتِيْكُمْ نَفْسَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۳۴)۔ کھیتیاں انہی کی پرا چڑھتی ہیں جو مفاد پرستانہ جذبات سے محفوظ رہیں۔

یہ ہے وہ جماعت جو دنیا میں نظامِ ربوبیت قائم کرنے کی ذمہ داری سنبھالتی ہے۔ انہی کو عبادتِ مومنین یا حقیقی معنوں میں مسلمان کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ پوری پوری محنت کرتے ہیں اس لئے کہ یہ جانتے ہیں کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝ (۲۳)۔ انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔ کوشش کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح پیہم محنت اور مسلسل سعی و کادوش سے انہیں جو

ملتا ہے، وہ اُس میں سے بعد ضرورت اپنے لئے رکھتے ہیں اور باقی سب مملکت کی تحویل میں دے دیتے ہیں تاکہ وہ اس سے خدا کی عالمگیر ربوبیت کی عظیم ذمہ داری کو پورا کرے۔ اپنی ضروریات کے تعین میں بھی وہ نہ ہزار سے کام لیتے ہیں۔ نہ تہذیر سے۔ یعنی نہ ضرورت سے زائد خرچ کرتے ہیں نہ

ضروریات کا تعین

بلا ضرورت دولت صنائع کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اِنَّهُ لَا يَخْبُثُ الْمُسْرِفِينَ ۝ (۲۴۰) خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا اِخْوَانَ الشَّيْطَانِ (۲۴۱)۔ دولت صنائع کرنے والے شیاطین کے بھائی بند ہیں۔

یہ ہے وہ معاشی نظام جسے قرآن قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس نظام میں آپ دیکھئے کہ نہ صرف انسان کا معاشی مسئلہ ہی نہایت اطمینان بخش طریق سے حل ہو جاتا ہے بلکہ انفرادی مفاد پرستی کی وجہ سے جس قدر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا بھی خود بخود استیصال ہو جاتا ہے۔ جب انسان کی ضروریات زندگی خود بخود پوری ہوتی جائیں گی تو کوئی شخص ان ناپسندیدہ کاموں کے لئے تیار نہیں ہوگا جو اسے موجودہ غلط معاشرے میں محض روٹی کی خاطر کرنے پڑتے ہیں اور جب وہ فاضلہ دولت اپنے پاس نہیں رکھ سکے گا۔ تو اسے بدویا نئی۔ چور بازاری۔ نفع خوری۔ سمگنگ۔ فریب دہی کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اُس وقت نہ زمیندار اور کاشتکار کے تھکے ہوئے ہوں گے نہ مزدور اور کارخانہ دار کے تنازعے۔ نہ صاحب جاہ و مال اور کرایہ دار کے مناقشات ہوں گے نہ گاہک اور دوکاندار کے قہقہے۔ اُس وقت نہ تقسیم درآمد کی مقدم بازی ہوگی۔ نہ بین دین کی تکلفیہی۔ اُس وقت ہر شخص ضروریات زندگی سے بے نیاز ہوگا اور اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف۔

کہہ دیا جائے گا کہ صاحب! حسین خواب (UTOPIA) اور شاعرانہ تخیل ہے۔ اس قسم کا معاشرہ کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔ خود غرضی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ آپ

حسین خواب

اس جذبہ کو دل سے نکال نہیں سکتے۔ انسان کبھی ایسے نیک نہیں بن سکتے جیسی ان کی تصویر کھینچی جا رہی ہے۔ انسان شروع سے ایسا ہی رہا ہے اور ایسا ہی رہے گا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ تمہاری غلط نگہی ہے۔ انسان بد فطرت نہیں ہے۔ اس کی درحقیقت کوئی فطرت ہی نہیں۔ فطرت، جمادات، نباتات و حیوانات کی ہوتی ہے جسے وہ بدل نہیں سکتے۔ انسان کو کچھ بننے کی صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ اگر ان صلاحیتوں کی صحیح تربیت کر دو تو وہ اچھا انسان

بن جائے گا۔ ان کی غلط تربیت کرو تو وہ بُرا انسان بن جائے گا۔ ہم غلط معاشرہ قائم کرتے ہیں۔ اس میں انسانی بچوں کی تعلیم و تربیت غلط خطوط پر کرتے ہیں۔ جب اس قسم کے معاشرے پر دو چار صدیاں گزر جائیں تو ظاہر ہے کہ وراثت اور ماحول کے اثرات سے اس میں اُسی قسم کے انسان پیدا ہونے لگ جائیں گے۔ ہم اس قسم کے خود غرض اور بدنیت انسان پیدا تو خود کرتے ہیں، لیکن رنج و بری الذمہ ہونے کے لئے کہہ دیتے ہیں کہ انسان کی فطرت ہی ایسی ہے۔ اگر ہم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت صحیح تصورات زندگی کے مطابق کریں اور اس طرح دو چار نسلوں تک کرتے جائیں تو پھر نظر آئے گا کہ ہمارے معاشرے میں کس قسم کے انسان پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نظام ربوبیت کے قیام کے لئے ان افراد کی تعلیم و تربیت نہایت ضروری (بلکہ لاینفک) قرار دیتا ہے جن کے ہاتھوں اس نظام کا قیام عمل میں آتا ہے۔

خواب نہیں حقیقت

کرتے ہیں کہ انسان کی فطرت ہی ایسی ہے۔ اگر ہم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت صحیح تصورات زندگی کے مطابق کریں اور اس طرح دو چار نسلوں تک کرتے جائیں تو پھر نظر آئے گا کہ ہمارے معاشرے میں کس قسم کے انسان پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نظام ربوبیت کے قیام کے لئے ان افراد کی تعلیم و تربیت نہایت ضروری (بلکہ لاینفک) قرار دیتا ہے جن کے ہاتھوں اس نظام کا قیام عمل میں آتا ہے۔

عملی طریق

کہتا ہے ہے کہ تم اس نظام کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے کر اس کے لئے ذہنی فضا کو سادگار بناؤ۔ اس کے ساتھ ہی تم اپنی آنے والی نسلوں کی صحیح تعلیم و تربیت شروع کر دو۔ جو جوں ان آنے والی نسلوں کا قلب دو ماغ صحیح (مترآنی) قالب میں ڈھلتا چلا جائے، اس نظام کو تدریج آگے بڑھانے جاؤ۔ تاکہ یہ اپنی آخری منزل تک پہنچ جائے۔

قرآن چونکہ انسانی زندگی کے ہر دور کے لئے راہ نمائی دیتا ہے۔ اس لئے اس نے جہاں اس منزل کا پورا پورا تعارف کرا دیا ہے۔ جہاں پہنچ کر نظام ربوبیت اپنی مکمل شکل میں قائم ہوتا ہے، وہاں اس نے اس عبوری دور (TRANSITORY PERIOD) سے متعلق بھی احکامات و عنوانات دیدیئے ہیں جس سے گذر کر یہ تدریج آخری منزل تک پہنچتا ہے۔ اس عبوری دور کے

عبوری دور کے احکام

احکام و قوانین بھی ایسے ہیں جو معاشرہ کو رفتہ رفتہ آخری منزل تک پہنچنے کے لئے تیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں خیرات و صدقات کی ترغیب، بخل اور حرص کی مذمت، ربو کی ممانعت، زراعت و زری کی مخالفت، وراثت کے احکام، سب اس عبوری دور سے متعلق ہیں۔ کہیں اس کا ارشاد ہے کہ وَ الْبَنِينَ يَكْفُرُونَ الدَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۹۰)۔ جو لوگ چاندی اور سونا جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں کھلا نہیں رکھتے، تو انہیں دردناک عذاب سے آگاہ کر دے۔ اور کہیں وہ کہتا ہے کہ تمہارے

تباہی کی وجہ یہ ہے کہ تَاْكُلُوْنَ لِلتَّرَاثِ اَكْلًا نَّكَآةً وَتَخْتَبُونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۱۹) تم وراثت کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور دولت سے اس قدر محبت رکھتے ہو کہ چاہتے ہو کہ سب کا مال تمہارا ہی پاس آجائے۔ کہیں وہ کہتا ہے کہ تباہی ان لوگوں کے لئے ہے جن کی ذہنیت یہ ہے کہ اِذَا اَكْنَا كُوْا عَلٰی النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ نِعْمًا وَ اِذَا كَانُوْهُمُ اَوْ ذَرُوْهُمُ يَخْسِرُوْنَ (۲۰)۔ جب وہ دوسروں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انہیں ماپ یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں یہ کہیں وہ مالیات کے مشیروں سے کہتا ہے کہ دولت کی تقسیم اس طرح نہ کرو کی لَا يَكُوْنُ دُوْلَةً بَيْنَ الْأَعْيُنِ مِنْكُمْ (۲۱) کہ وہ تم میں سے دولت مندوں کے طبقہ ہی میں گردش کرتی رہے۔ اور کہیں قارون صفتوں سے کہتا ہے کہ تم یہ نہ سمجھ لو کہ جس قدر ماں و دولت تمہارے پاس جمع ہو رہا ہے اِنَّمَا اُوْتِيْتُمْهُ عَلٰی عِلْمِ عِبَادِی (۲۲)۔ یہ سب ہماری ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس پر ہمیں کامل تصرف حاصل ہے کہ جس طرح جی چاہے اسے صرف کریں، اس قرآن کے یہ احکام و ضوابط اپنی اپنی جگہ مستقل راہ نمائی کا کام دیتے ہیں۔ لیکن جب نظام رقبیت اپنی مکمل شکل میں قائم ہوتا ہے تو اس میں چونکہ ضروریات ہر ایک کی پوری ہو جاتی ہیں اور فاضل دولت کسی کے پاس رہتی نہیں، اس لئے اس وقت اس جماعت ریا معاشرہ کے لئے عبوری دور سے متعلق احکام کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس طرح، قرآن بتا دیکر اس نظام کو ان اذراء کے ہاتھوں قائم کیا دیتا ہے جو صحیح تعلیم و تربیت سے اسے چلانے کی صلاحیتیں اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں۔



لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر ایسی جماعت پیدا نہ ہو جو اس نظام کے قیام کی کوشش کرے، تو قدرت چپکے بیٹھی منہ دکھتی رہتی ہے۔ دنیا میں غلط نظام ہائے زندگی کی تخریب اور ان کی جگہ صحیح نظام کے قیام کے لئے خدا کا کائناتی قانون اپنے طور پر مصروف عمل رہتا ہے۔ اسی کوشش میں حق و باطل کہا جاتا ہے جو کائنات میں سلسل جاری و ساری رہتی ہے۔ اس میں باطل کی شکست کا نسائی قانون اور حق کا غلبہ لازمی ہوتا ہے۔ لیکن اس کی رفتار اس قدر سست ہوتی ہے کہ قرآن کے الفاظ میں، اَمْسُ كَا اَبَدٍ اَبَدٍ دُنِیَّ حَسَابٍ دُشْمَارٍ سَعِیْ ہَزَارِ ہَزَارِ سَالٍ كَا ہُوْتَلَبِی۔ یہ ہی کائناتی قانون کی کار فرمائی ہوتی ہے جس کی رو سے (مثلاً) قرآن کہتا ہے کہ اَوَّلُ لَمْرٍ مِزْوَا اَنَا نَاتِي

الْأَرْضَ نُنْقِصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا وَ اللَّهُ يَحْكُمُ لَكُمْ لَكُمْ بِهِ وَ هُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ (۱۳۱)۔ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم کس طرح زمین کو اس کے بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے لے کر کم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ان معاملات کے فیصلے خدا رکات قانون (کریٹیا) کے فیصلے (کو رو کرنا تو ایک طرف اس پر نظر ثانی کرنے کا بھی کسی کو اختیار حاصل نہیں۔ وہ بہت جلد حسا کرنے والا ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اس کا ”بہت جلد حساب کرنا“ بھی ہمارے حساب و شمار سے سینکڑوں برس لے لیتا ہے۔ لیکن اگر انسان چاہے کہ خدا کا یہ قانون ہمارے حساب و شمار سے مطابق نتائج مرتب کرے تو اس کا طریق یہ ہے کہ انسان اس قانون کے ساتھ تعاون کرے اور اسے آگے بڑھانے کے لئے اس کا دست دباؤ نہ جائے۔ انسان اگر اس طرح خدا کے قانون کی مدد کرے گا تو اس کا قانون خود انسان کا مدد و معاون بن جائے گا۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ (۱۳۲) کے یہی معنی ہیں۔ اس طرح غلط نظام کی صنیں دنوں میں اُلٹ جائیں گی۔ اور اس کی جگہ صحیح نظام کی بساط بچھتی چلی جائے گی۔ نبی اکرمؐ اور حضورؑ کے رفتار (رفتہ) کی جماعت نے یہی کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ چند دنوں کے اندر ایک ایسا عظیم انقلاب برپا ہو گیا جس کی مثال چشم فلک نے کبھی نہ دیکھی تھی اور جس کے سبب و علل معلوم اور متعین کرنے کے سلسلہ میں دنیا بھر کے مؤرخ آج تک انگشت بدنداں ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں نے اس قانون کا ساتھ چھوڑ دیا اور اسی نظام زندگی کو اختیار کر لیا جسے شانے کے لئے قرآن آیا تھا تو خدا کا کائناتی قانون پھر اپنی رفتار سے چلنے لگ گیا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری تھا۔ آپ آٹھ ہزار سال کی تاریخ پر نگاہ ڈالنے اور دیکھنے کہ کس طرح **دنيا از خود ادھر آرہی ہے** انسان اپنے ناکام تجارت کے بعد رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر قرآنی نظام زندگی کے مختلف اجزاء کو اپنائے جلا آرہا ہے۔ لیکن اس تبدیلی کی رفتار بہت کم ہے۔ میری کوشش یہ ہے کہ ہم اس نقطہ زمین میں، جسے ہم نے حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا تھا کہ ہمیں اسلام کا صحیح نظام قائم کریں۔ خدا کے کائناتی قانون کی رفتار کا فریضہ سرانجام دیں تاکہ اس کے نتائج ہمارے حساب و شمار سے برآمد ہونے شروع ہو جائیں۔ اس کا پہلا قدم یہ تھا **میری کوشش** کہ اس منکر کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے تاکہ قرآن کا جو تصور زندگی اپنے عرصے سے نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے وہ پھر ہمارے سامنے آجائے تشکیل پاکستان کے بعد

اپنی تمام مساعی کو اسی نقطہ پر مرکوز کر رکھا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اس کے نتائج بڑے حوصلہ افزا ہیں۔ اب اگلا مرحلہ یہ ہے کہ پاکستان کا مجوزہ آئین انہی خطوط کے مطابق مرتب ہو جائے اور اس طرح کاروانِ ملت اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائے جو اسے قدم بقدم متراقی نظامِ ربوبیت کی آخری منزل تک لیجائے اگر ایسا ہو گیا تو آپ دیکھیں گے گا کہ غلط نظام ہائے زندگی کا ستیا یا ہوا انسان کس طرح کٹاں کٹاں نظام کے حیات پر ورسایہ عاطفت میں پناہ لینے کے لئے آتا ہے اور کس طرح پھر یٰۤاٰ خَلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اٰلِهٖ اَنْوَابًا (۳۱۷)۔ کاکیت آدڑ منظرِ وجہ بالیدگی قلب و نظر ہو جاتا ہے۔ وَ اَشْرَقَتْ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۱۹)۔ (زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی) کی بشارت کس طرح ایک زندہ شہادت بن کر سامنے آجاتی ہے۔

جو لوگ قرآن کے نظامِ ربوبیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں؛ کیا ان کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کوشش کریں کہ آئینِ پاکستان اس نظام کا مظہر ہو اور مملکتِ پاکستان تمام افراد معاشرہ کو اس کی نعمات دے کہ

مَنْ نَزَرْنَا مِنْكُمْ وَ اِيَّا هُمْ (۳۱۷)۔

ہم تمہارے رفق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رفق کے بھی۔

استفسارات

تقریب کے بعد سامعین کی طرف سے کچھ سوالات کئے گئے جن کے وہیں جواب دیئے گئے۔ ان میں سے اہم سوالات اور ان کے جوابات درج ذیل کئے جلتے ہیں۔

۱۔ سوال ہم بھوک کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ اس میں بیمار آلوی تصور نہیں تو پھر ہم بلا تصور عذاب خداوندی میں مبتلا کیوں کر دیئے گئے ہیں؟

جواب اجتماعی جرائم اور ان کے نتائج کا سلسلہ انفرادی غلطیوں کی پاداش سے مختلف ہے۔ ایک قوم غلط نظام قائم کرتی ہے یا غلط روش اختیار کرتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ذلت اور پستی، بھوک اور افلاس کے عذاب میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ عذاب آئندہ نسلوں تک برابر جاری

رہتا ہے۔ یعنی اس قوم کی ہر نسل شروع ہی سے بھوک اور افلاس کے عذاب میں مبتلا ہوتی ہے۔ یہ نسل کی پیش رو نسلوں کے اجتماعی اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے جسے اس نسل کو بھگتنا پڑے گا۔ بعینہ جس طرح اگر کسی قوم کی ایک نسل اچھے کام کرتی ہے تو وہ قوم خوش حال ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد اس کی آنے والی نسلیں خوشحال پیدا ہوتی ہیں۔ انفرادی طور پر سمجھنا ہو تو یوں سمجھئے کہ تندرست ماں باپ کا بچہ پیدائشی طور پر تندرست ہوتا ہے اور جس بچے کے والدین کسی متعدی مرض میں مبتلا ہوں اُسے وہ مرض پیدائش کے ساتھ وراثت میں مل جاتا ہے اور عمر بھر اس کا ڈکھ سہتا رہتا ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے اس کے لئے تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ ہماری سابقہ نسلوں نے غلطی کی اور اس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں۔ ہم نے تشکیل پاکستان کے بعد خود غلط نظام قائم کیا اور ہم سے ملے جرائم بھی مسلسل سرزد ہوتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم بھوک اور افلاس کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ لہذا ہمارے قصے میں تو یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ہم بلا تصور عذاب خداوندی میں مبتلا ہیں۔ البتہ اگر ہم نے اپنی سابقہ غلطیوں کی تلافی نہ کی تو ہماری آنے والی نسلیں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گی کہ ہم اپنے اسلاف کے جرائم کی سزا بھگت رہے ہیں۔

یہ بے اجتماعی جرائم کا فلسفہ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی رُوسے، "قومیں" جہنم میں داخل ہوتی ہیں روکھئے سجدہ اعراف۔ آیت ۱۷۔

۲۔ سوال یہ ٹھیک ہے کہ ہم اپنی سابقہ نسلوں کے جرائم کی پاداش میں بھوک کے عذاب میں گرفتار ہیں لیکن اس سے ہمارا کیا عاقبت کیوں خراب ہو؟

جواب اگر ہم اپنی موجودہ حالت پر مطمئن رہیں اور اس عذاب سے نکلنے کی کوشش نہ کی تو ہمارے اس جرم کی پاداش میں ہماری عاقبت خراب ہوگی۔ لیکن اگر ہم نے یہاں صحیح نظام قائم کرنے کی کوشش کی تو پھر ہماری عاقبت خراب نہیں ہوگی خواہ یہ نظام ہماری زندگی میں قائم ہو جائے یا اس کے بعد۔ اگر نظام ہماری زندگی میں قائم ہو گیا تو ہماری یہ زندگی بھی خوش حال ہو جائے گی اور اگلی زندگی بھی سرسبز و شاداب۔ لیکن اگر یہ نظام ہمارے بعد قائم ہوا تو ہم بے شک عسرت کی زندگی بسر کرتے ہوئے مرجائیں گے لیکن ہماری اگلی زندگی شاداب ہوگی۔ اور ہماری آنے والی نسل کی زندگی خوش حال۔ اگر انھوں نے اس نظام کے استحکام کے لئے کوشش کی تو اس دنیا کی خوش حالی کے ساتھ ان کی آخری زندگی بھی شادکام ہوگی۔ لیکن اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کی موجودہ زندگی تو آسانی سے گزر جائے گی لیکن آخرت تباہ ہو جائے گی۔

۳۔ سوال آپ نے کہا ہے کہ جس قوم کی دنیاوی زندگی عسرت اور بد حالی کی ہوتی ہے۔ اس کی آخرت بھی تباہ و برباد ہوتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس قوم کی اس دنیا کی زندگی خوش حالی میں گذرتی ہے اس کی آخرت بھی سنور جاتی ہے۔ اقوام مغرب کی موجودہ زندگی بڑے عیش و آرام میں گذرتی ہے کیا وہ آخرت میں بھی اسی طرح عیش کریں گے؟

جواب آپ نے مندرجہ بالا نتیجہ اخذ کرنے میں عجلت کی ہے۔ صورت یہ ہے کہ اس دنیا کی رزق کی کثاد خدا کے طبعی قوانین سے وابستہ ہے۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق تسویفِ فطرت کرے گی اس کی زندگی خوش حالی میں گذرے گی۔ وہ قوم مسلم ہو یا غیر مسلم۔ قرآن کہتا ہے کہ اس باب میں خدا کسی میں تفریق نہیں کرتا کُلًّا نُنَزِّلُ لَّهُمْ لَقَاءً وَ لَّهُمْ لَقَاءٌ مِّنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ؕ وَ فَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ؕ (پلے)۔ جو چیزیں خدا نے نوع انسانی کی پرورش کے لئے مفت عطا کی ہیں۔ یعنی سانا رزق۔ وہ زمین کے دسترخوان پر کھلی پٹری ہیں جس کا جی چاہے ہا تھ بڑھا کر اٹھالے۔ جو قوم ان کے حاصل کرنے میں جس قدر محنت کرے گی۔ اسے اسی قدر مل جائے گا۔ یہ نہیں کہ خدا نے غیر مسلموں کے رستے میں بند لگا دی ہوں کہ وہ آگے بڑھ کر انہیں حاصل نہیں کر سکتے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس دنیا کی متاع ہر قوم کو باندازہ سعی و عمل مل جاتی ہے۔ لہذا اگر کوئی غیر مسلم قوم اس کے لئے محنت کرتی ہے تو اسے دنیا میں خوش حالی نصیب ہو جاتی ہے۔ جماعت مومنین کی زندگی کے ہر شعبہ میں قوانین خداوندی کا اتباع کرتی ہے اس لئے اس کی دنیاوی زندگی یقیناً سرفرازی اور سر بلندی کی زندگی ہوتی ہے اور چونکہ اس کے نزدیک زندگی اسی دنیا کی نہیں بلکہ وہ موت کے بعد بھی مسلسل آگے بڑھتی ہے اس لئے اس کی آخری زندگی بھی تابناک ہوتی ہے۔

جو غیر مسلم قوم دنیاوی متاعِ زلیت کے لئے کوشش کرتی ہے اس کی دنیاوی زندگی خوش حال ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ وہ زندگی کو اس دنیا تک محدود سمجھتی ہے اور انسانی ذات کی نشوونما سے متعلق قوانین خداوندی پر یقین نہیں رکھتی اس لئے اس کی آخری زندگی ناکام رہتی ہے۔ اقوام مغرب کی یہی حالت ہے۔ لیکن جو قوم بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو اور اس سے نکلنے کی کوشش نہ کرے، اس کی دنیاوی زندگی بھی عذاب میں گذرتی ہے اور آخری زندگی بھی عذاب میں۔ ہم (بد قسمتی سے) اسی شوق میں آتے ہیں۔

۴۔ سوال کیا اسلامی مملکت کے نظامِ ولوبیت میں غیر مسلموں کا بھی حصہ ہوگا؟

جواب قرآنی نظامِ ربوبیت میں ہر فردِ زند آدم کا حصہ ہوگا خواہ اس کا مذہب و مشرب کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ جس ملک میں حالت یہ ہو کہ اگر ایک کتابھی بھوک سے مر جائے تو اس کی ذمہ داری معاشرہ پر عاید ہو۔ اس میں کسی انسان کی بھوک کو کیسے برداشت کیا جاسکتا ہے؛ خدا کی رب العالمین (عالمگیرِ ربوبیت) انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتی۔

۵۔ سوال جب نظامِ ربوبیت میں تمام انسانوں کی بنیادی ضروریات زندگی پوری ہو جائیں تو پھر قرآنی نظام کے سامنے کیا پروگرام ہوگا؟

جواب جیسا کہ دورانِ تقریر میں بتایا گیا ہے قرآن کی رُو سے انسانوں کو بنیادی ضروریات کی پریشانیوں سے اس لئے فارغ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کی نشوونما کا مکمل اطمینان اور سکون سے کر سکیں۔ انسانی ذات کی ممکنات جن کی نشوونما مقصودِ حیات ہے، اتنی وسیع ہیں کہ ہم اس وقت جبکہ ہمیں شعور ذات تک بھی نصیب نہیں۔ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یہ بہت بڑا پروگرام ہے۔ معلوم جب افراد انسانیہ کی ذات میں نشوونما ہوگا تو یہ دنیا کیا سے کیا بن جائے گی۔

یہ تو رہا انسانی ذات کی نشوونما کا قصہ۔ ویسے اگر محض بنیادی ضروریات کے پورا کرنے کے پروگرام کو لیا جائے تو وہ بھی اتنی جلدی ختم نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے اس نظام کو صرف انسانوں کی ضروریات تک محدود نہیں رکھا۔ اس نے "دابۃ" کہا ہے جس کے معنی ہر ذی حیات یا ہر چلنے والا ہے۔ نیز "دابۃ" کے متعلق اس نے کہا ہے کہ وہ اسی زمین میں نہیں، اجرامِ فلکی میں بھی موجود ہیں (وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا مِنْ دَابَّةٍ رُحُومٍ)۔ یورپ کے سائنسدان کے سامنے صرف اجرامِ فلکی کا مسخر کرنا ہے اور وہاں کے سیاسی مدبروں کے پیش نظر ان جدید دنیاؤں میں اپنی استعماریت کی توسیع۔ لیکن قرآنی نظام ان حالات میں یہ سوچے گا کہ ان اجرام میں بسنے والے "دابۃ" کی پرورش کی ذمہ داری بھی اُس کے ذرائع میں شامل ہو جائے گی کیونکہ اُس کے خدا نے اپنے آپ کو رب العالمین کہا ہے۔ اور عالمیت میں پوری کائنات آجاتی ہے۔ بہر حال آپ گھبرائیے نہیں۔ قرآنی نظام کا پروگرام اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو جائے گا کہ آپ کے کرنے کے لئے کوئی کام ہی نہ رہے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارمناں

ہزار بادہ ناخوردہ در رگ تاک است

۶۔ سوال

پاکستان میں قرآنی نظام رلوبیت کے لئے کیا کرنا چاہیے؟

جواب

سب سے پہلے اس فکر کو عام کرنا چاہیے کہ دین کا مقصد اس نظام کا قیام ہے

اور اسلامی مملکت اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس فکر کے عام کرنے سے مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے نئے آئین میں یہ بات درج ہو جائے کہ تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات اور ان کی ذات کی نشوونما کے لئے اسباب و ذرائع فراہم کرنا مملکت کی ذمہ داری ہے۔ جب مملکت اس فریضہ کو اپنے ذمہ لے لے گی تو اس نظام کا قیام عمل میں آجائے گا۔ اس کے لئے وقت ضرور لگے گا۔ آئین میں اس نکتہ کے شامل ہو جانے سے ہماری متزل کا تعین تو ہو جائے گا۔ آپ اس فکر کے عام کرنے میں جس قدر کوشش کریں گے، اسی قدر اس نظام کے قیام کے امکانات روشن ہوتے جائیں گے۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ملکیت زمین

قرآن کریم کی رو سے زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں (بلکہ تمام ذی حیات) کو پیدا کیا تو اس کے ساتھ ہی (بلکہ ان کی پیدائش سے بھی پہلے) ان اسباب و ذرائع کو بھی پیدا کر دیا جن پر ان کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ پانی، ہوا، روشنی، حرارت۔ اور زمین جس سے خوراک حاصل ہوتی ہے۔

(۲) حیوانات ریایوں کہئے کہ انسان کے علاوہ دیگر ذی حیات) چونکہ تمدنی زندگی بسر نہیں کرتے اس لئے ان کے لئے کسی ایسے خارجی نظام کی ضرورت نہ تھی جو ان اسباب و ذرائع زلیست (یعنی رزق کے سرچشموں) کا انتظام اس انداز سے کرے کہ ان سے ان سب کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ لیکن ان کو تمدنی زندگی بسر کرنا تھی اس لئے اس کی صورت میں ایسے نظام کی ضرورت تھی۔ اس نظام کو مملکت کہتے ہیں۔ چنانچہ اس مملکت کا بنیادی فریضہ یہ مترار دیا گیا کہ وہ زمین کا انتظام اس انداز سے کرے کہ اس سے تمام افراد انسانہ کی بنیادی ضروریات زندگی اطمینان اور سکون سے پوری ہوتی رہیں۔ اس مقصد کیلئے زمین، اسلامی مملکت کے کنٹرول میں رہتی ہے۔ اب یہ اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، ایسا انتظام کرے جس سے زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو اور اس پیداوار کی تقسیم اس انداز سے ہو کہ کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ ہونے پائے۔ یہ ہے قرآن کریم کی رو سے زمین کی پوزیشن۔ ظاہر ہے کہ اس میں زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

تفصیل ان امور کی آگے چل کر ملے گی)۔ اسی سلسلہ میں اکثر یہ پوچھا جاتا ہے کہ عہد رسالت کا اور خلافت راشدہ میں زمین کے انتظام کی شکل کیا تھی۔ اسی سلسلہ میں چند ایک بنیادی حقائق کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) یہ ہمارا ایمان ہے کہ محمد رسول اللہ والذین معہہ کی زندگی نثران کریم کے مطابق بسر ہوتی تھی اس لئے جو نظام انہوں نے قائم کیا تھا وہ لامحالہ نثران کی تعلیم کے مطابق ہوگا۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ نثران کی منشا کے خلاف اپنا نظام قائم کرتے۔

(۲) اس عہد کی تاریخ اس زمانے میں مرتب نہیں ہوئی۔ یہ تاریخ اس زمانے سے دو تین سو سال بعد اس طرح مرتب ہوئی کہ اس کے لئے کوئی تحریری مواد موجود نہیں تھا۔ اس کا تمام انحصار صرف نثرانی روایات پر تھا جو لوگوں میں عام طور پر چلی آرہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح سے مرتب شدہ تاریخ میں صحیح اور غلط ہر قسم کی باتیں درج ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک عہد محمد رسول اللہ والذین معہہ کا تعلق ہے، یہ پرکھنے کے لئے کہ اس تاریخ میں کون سی بات صحیح اور کونسی غلط ہے، ایک ہی معیار قابل اعتماد ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اس میں جو بات نثران کریم کی تعلیم کے خلاف ہو، اس کے متعلق سمجھ لیا جائے کہ وہ صحیح نہیں۔

(۳) اسلام کی اولیٰ مملکت جس سرزمین میں قائم ہوئی تھی (یعنی عرب کا ملک) وہ عام طور پر غیر ذریعہ تھا۔ یعنی اس کی معیشت زرعی نہیں تھی۔ اس لئے اس مملکت نے زرعی معیشت کے متعلق کوئی ایسا جامع و مانع نظام متعین نہیں کیا تھا جو دنیا کے موجودہ حالات پر من و عن منطبق ہو سکے۔ اس میں زرعی نظام کے سرسری اور ابتدائی خط و خال ہی مل سکتے ہیں۔

(۴) اسلامی مملکت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے نظام کے مختلف شعبوں کی ابتدا اس ماحول کے تقاضوں کے مطابق کرتی ہے جس میں وہ جنم لیتی ہے اور پھر اس کے بعد بتدریج اس نظام کو منہدی تاکہ پختہ ہے۔ یہی انداز ہمارے قرن اول کی اسلامی مملکت نے اختیار کیا تھا۔ لیکن ہماری تاریخ میں رجسی کچھ بھی وہ ہے، واقعات کے ریکارڈ کرنے میں، اس امر کا التزام نہیں کیا گیا کہ جس ترتیب سے وہ رونما ہوئے تھے۔ اسی ترتیب سے وہ درج کئے گئے ہوں۔ یہ واقعات گڈ ٹڈ شدہ شکل میں سامنے آتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ ایک ہی موضوع پر اکثر اوقات متضاد باتیں تاریخ میں لکھی جاتی ہیں اور ان شمش دپنچ میں پڑ جاتا ہے کہ ان میں سے کسے قبول اور کسے مسترد کرے۔ انہی سے ایک ہی مسئلہ کے موافق اور مخالف سندت پیش کر دی جاتی ہیں۔ اگر یہ واقعات اسی ترتیب سے مذکور ہوتے جن کے مطابق یہ رونما ہوئے تھے تو واضح ہو جاتا کہ اس

اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ وہ مملکت، ہر شعبہ زندگی میں اپنے نظام کو بتدریج آگے لے جا رہی تھی۔ اس تدریج میں اس کا قدم، قرآن کے مقرر کردہ اصولوں سے تو ادھر ادھر نہیں بٹتا تھا لیکن ان اصولوں کو بروئے کار لانے کے لئے جو طریق کار اختیار کیا جاتا تھا اس کی مختلف کڑیوں میں جزئی فرق ناگزیر تھا۔ ہمارے لئے غیر متبادل وہ اصول ہیں جو قرآن کریم میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ ہم ان اصولوں کو اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں اپنے طریقوں کے مطابق بروئے کار لائیں گے۔ یاد رکھئے۔ کاروان انسانیت کے لئے وہ منزل غیر متبادل ہے جسے قرآن نے متعین کیا ہے۔ ذرائع و طرق سفر غیر متبادل نہیں۔ بسنا اگر تاریخ سے یہ معلوم بھی ہو جائے کہ کسی زمانے میں قرآن کے اصولوں پر عمل کس طرح سے ہوا تھا تو یہ چیز میں صرت تاریخی فائدہ دے گی۔

(۵) زمین کے انتظام کے سلسلہ میں، قرن اول کی اسلامی مملکت نے کیا طریق کار اختیار کیا تھا، تاریخ میں اس کے متعلق جو کچھ ملتا ہے اسے آئندہ دو عنوانات میں سامنے لایا گیا ہے۔ آپ ان کا مطالعہ اس مہم کی روشنی میں کریں۔

زمینداری اور جاگیرداری

(شائع شدہ اپریل ۱۹۵۳ء)

قرآن کریم کی رو سے اگر دیکھا جائے تو یہ امر نہایت وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتا ہے کہ اسلام میں مروجہ زمینداری و جاگیرداری نظام کے لئے قطعاً کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے ہم سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلام میں انفرادی ملکیت کا تصور بھی موجود ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اس کی حیثیت کیا ہے؟ نیز اس امر کو بھی دیکھنا ہوگا کہ اسلام انفرادی ملکیت کو جائز رکھتا ہے تو بلا تخصیص و تحدید ہر قسم کی چیزوں میں اس کو جائز رکھتا ہے یا اس ضمن میں کچھ حدود و قیود عائد کرتا ہے۔ اس میں کچھ مستثنیات تو نہیں ہیں۔ قرآن کی ہدایت اس باب میں کس قدر واضح ہے سہر دست ہم اس سے بحث نہیں کریں گے کیونکہ قرآن کی رو سے اسلام کا نظام رو بہ بیت کیا ہے۔ اس موضوع پر ایک تفصیلی تعریف محترم پروفیسر صاحب کے ذریعہ ترتیب ہے جس سے اس کے تمام گوشے نکھر کر سامنے آجائیں گے۔ اس فرصت میں ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہم سے پہلے اور حضرات اس موضوع پر کیا کچھ لکھ چکے ہیں اور ان کے نتائج و فکر اس باب میں کیا ہیں؟

اس موضوع پر ہم سب سے پہلے مہر کے شہر و فخر علامہ سید قطبؒ کا خیال پیش کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی کتاب العداۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام میں بیان کیا ہے۔ ان کی اس بحث کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

”یہ صحیح ہے کہ اسلام نے بعض اموال میں انفرادی ملکیت کے حقوق کو تسلیم کیا ہے مگر اس کے لئے کچھ حدود اور قیود عائد کی ہیں ساتھ ہی کچھ ایسے اموال بھی ہیں جن کے لئے اسلام انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتا ہے ان کی حیثیت بھی عینی ملکیت کی ہرگز نہیں ہے بلکہ اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو فرد کی حیثیت ان اموال میں بھی جماعت کی طرف سے ایک گونہ دیکھ کر ہی کی جاتی ہے۔ ورنہ مال علی العموم جماعت ہی کی ملکیت میں داخل ہے اور جماعت بھی دراصل حقیقی مالک نہیں ہے بلکہ وہ خدا کی طرف سے نیا شہ اس میں تصرفات کرنے کا حق رکھتی ہے ورنہ ہر چیز کا مالک حقیقی سوائے خدا کے اور کوئی نہیں ہے۔“

قرآن کریم وضاحت کے ساتھ اس اصل عظیم کو واضح کر دیتا ہے۔ چنانچہ سورہ حدید میں ہے۔
 اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَقْرِفِيْنَ فِيْهِ (۵۶)
 اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جن اموال میں اس نے تمہیں خلیفہ بنایا ہے ان کو مصالح عارکے لئے کھلا چھوڑ دو۔

اس آیت میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ جو معنی ہم نے اس سے سمجھے ہیں اس کے لئے یہ نص صریح ہے کہ انسان کے ہاتھ میں جو اموال ہیں وہ دراصل خدا کے اموال ہیں اور انسان ان اموال میں دیکھتا ہے، اصل نہیں ہے ایسے ہی سورہ نور میں جہاں مکاتبتین (وہ غلام جو مکاتبت کر کے آزادی حاصل کرنا چاہیں) کی امداد و اعانت کا حکم دیا گیا ہے وہاں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَ اتُوْهُم مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْ اٰتٰكُمْ (۲۳)

اور ان مکاتبتین کو خدا کے اس مال میں سے دو جو اس نے تمہیں دیا ہے۔

یہاں دیکھئے کہ مالدار لوگ ان مکاتبتین کو اپنا مال نہیں دیتے ہیں بلکہ اللہ کا مال دیتے ہیں۔ دینے والے بعض درمیان کا واسطہ بنتے ہیں۔ تیسری آیت جو سورہ نحل کی ہے وہ ان سے بھی زیادہ صریح ہے۔

وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ؕ فَمَا الَّذِيْنَ فَضَّلُوْا

بِرِزْقِيْ رِزْقِيْهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ

اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ؕ (۱۱)

خدا نے تمہیں رزق کے ضمن میں بعض کو بعض سے زیادہ صلاحیتیں دی ہیں۔ لہذا جو لوگ زیادہ

مال کما سکتے ہیں وہ زیادہ مال کو اپنے زیر دستوں کی طرف کیوں نہیں لے لیا دیتے کیونکہ یہ مال انہی کا

ہے۔ یہ لوگ ایسا اس خیال سے نہیں کرتے کہ اس طرح برابر ہو جائیں گے ایسا خیال کرنے میں وہ خدا کی نعمت سے انکار کرنا چاہتے ہیں؟

یہاں قرآن کریم نے یہ چیز ثابت کر دی ہے۔ کہ دولت مند لوگ اپنے ہاتھ کے نیچے کے لوگوں کو جو کچھ دیتے ہیں وہ دراصل ان مالداروں کے مال کا کوئی حصہ نہیں ہوتا جو وہ ان ضرورت مندوں کو دیتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ دراصل خود ان کا اصلی حق ہوتا ہے جسے یہ لوگ پورا کرتے ہیں کیونکہ اس مال میں وہ اور یہ سب برابر ہیں۔ ان میں سے ہرگز وہ دوسرے کے مثل حقدار ہے کیونکہ مال کا سرچشمہ ایک ہی ہے جو کچھ یہ لوگ لیتے ہیں اس کا حق ایسا ہی ہے جیسے ان لوگوں کا جو دیتے ہیں، اس کے بعد سوال انکاری ہے کہ کیا یہ لوگ خدا کی نعمت کا انکار کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ مال جو ان کے قبضہ میں ہے درحقیقت ان کی اپنی ملکیت تو نہیں ہے بلکہ خدا کا تفضل و انعام ہی تو ہے۔

اس سے بھی زیادہ صریح قرآن کا وہ حکم ہے جو سورہ نسا میں موجود ہے جس سے انفرادی ملکیت کی حقیقت بالکل ہی واضح ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ملکیت کتنے سے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد تصرف اور انتفاع کی ملکیت ہی ہے۔ اگر کسی کو کسی مال میں تصرف اور انتفاع کا حق نہیں تو وہ اس کا مالک نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے بعد دیکھئے کہ قرآن کریم ہر فرد کو اپنے اموال میں تصرف کا حق نہیں دیتا بلکہ اس کے لئے فتلاہ تصرف کی شرط عائد کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص تصرفات میں حماقت و سفاہت کا ثبوت بہم پہنچا لگے تو وہلی یا جماعت اس کے حق تصرف کو واپس لے سکتی ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا
وَأَرْزُقُوا هُمْ فِيهَا وَالْكَسْبُ لَهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا (۲۰)

اور سفیہ لوگوں کو تم اپنے اموال نہ دو جنہیں خدا نے تمہارے لئے قیام کا باعث بنایا ہے بلکہ اس میں انہیں کھانے پینے کے بقدر ہی دو۔

اس آیت میں یہ امر واضح کر دیا گیا ہے کہ تصرف کا حق انسان کو ہی وقت مل سکتا ہے جبکہ وہ ہوش و خرد کے

لہ یہاں اموالکم کا لفظ مزید دعوت فکر دے رہا ہے۔ سفیہ کے اموال کو قرآن ان کے اموال قرار نہیں دیتا بلکہ (اموالکم) جماعت کے اموال قرار دیتا ہے۔

ساتھ اس فرض کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر کسی مالک میں یہ صلاحیت نہیں ہے تو ملکیت کے طبعی ثمرات یعنی حقوق تصرف موقوف ہو جاتے ہیں۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جس شخص کا کوئی بھی وارث نہ ہو تو امام ہی اس کا وارث ہوتا ہے یعنی وہ جماعت کا مال ہے جس پر فرد کو قبضہ حاصل تھا۔ جب اس کے بعد وہ منقطع ہو جاتا ہے تو مال اپنے اصلی سرچشمہ کی طرف لوٹ آتا ہے۔

یہ چیز واضح طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ فرد کے اندر یہ شعور ہی کہ وہ اس مال میں جو دراصل جماعت کی ملکیت ہے محض جماعت کی طرف سے نائب یا ذکیل ہے۔ ان فرائض کو قبول کرنے پر مجبور کر سکتا ہے جو ایک نظام اس کے ذمے عائد کرتا ہے اور ان قیود کو منوا سکتا ہے جس سے وہ اس کے تصرفات میں حد بندیاں لگا سکتا ہے۔ ساتھ ہی جماعت کا یہ شعور کہ وہی اس مال کی اصلی مالک ہے، جماعت کو فرائض عائد کرنے اور حدود قائم کرنے کی جرات دلا سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام میں عینی ملکیت کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں بلکہ بعض اموال میں تو درحقیقت اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر زمین کو لے لیجئے۔ عقل اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی کہ کوئی انسان خود زمین کا مالک ہو سکتا ہے۔ انسان دراصل اس کی پیداوار اور غلہ کا مالک ہوتا ہے نہ کہ خود زمین کا۔ تو اعتبار محض انتفاع کا ہے۔ نہ کہ عینی ملکیت کا۔

اس کے بعد ایک اور بنیادی مسئلہ پر بھی غور فرمائیے کہ اسلام مال سے انتفاع کے لئے بھی اس کا واداء نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے ایک خاص گروہ میں قید ہو کر رہ جائے کہ ہر پھر کر انہیں میں گھومتا رہے اور دوسرے لوگ اس کو نہ پاسکیں۔ سورہ حشر کی اس آیت پر غور فرمائیے۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (۵۹)

تاکہ مال تم میں سے صرف دو لہتمندوں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔

اس نص کے ساتھ ایک واقعہ متعلق ہے جسے سمجھ لینے سے آیت کو سمجھ لینے میں ہمیں سہولت ہوگی۔ آپ کو معلوم ہے کہ مکہ مکرمہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہاجرین نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی، جو تنگ دست تھے وہ اپنے ساتھ کیا مال لے کر آتے لیکن جو دولت مند تھے وہ بھی اپنا مال ساتھ نہیں لاسکے۔ لہذا دوسرے تنگ دستوں کی طرح یہ بھی تنگ دست ہی تھے۔ انصاف نے امتہانی سخاوت کا مظاہرہ کیا اور اس بخل سے اپنے آپ کو بلند کر کے دکھا دیا جو انسانی نفس میں پوشیدہ ہے۔ انہوں نے ان ہاجرین کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم کئے اور ہر اس چیز میں جو ان کی ملکیت میں تھی ان کو برابر کا شریک کر لیا، حتیٰ کہ

مخصوص ترین اشیاء تک میں بھی۔ یہ سب کچھ انہوں نے کسی جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ نہایت خوش دلی اور سزاخ و صلگی کے ساتھ کیا۔ سورہ حشر میں ہے۔

يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً
مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْتُونَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَلَا كَانَ لَهُمْ خَصَاصَةٌ ۗ (۲۵)

جو لوگ ان کی طرف ہجرت کر کے آئے ہیں انصار ان سے محبت کرتے ہیں اور جو اموال ان کو دیئے گئے ہیں ان کو مہاجرین کے حوالہ کر دینے سے اپنے سینوں میں تنگی محسوس نہیں کرتے، بلکہ اپنی غمخواری پر ان کی ضرورتوں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ درحقیقت وہ خود ان چیزوں کے انتہائی محتاج ہیں۔

صحیح اعتقاد انسان کو کیلئے کیا بنا دیتا ہے حضرات انصار رضی اللہ عنہم اجماعاً اس کا ایک کامیاب نمونہ تھے۔

مگر مدینہ منورہ کے مالداروں اور فقرا مہاجرین میں پھر بھی عدم توازن کی ایک طبعی حالت تھی۔ نبی صلعم انصار کی سخاوت اور درواری کو دیکھ رہے تھے لہذا آپ اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے کہ جو کچھ وہ غریب کر رہے ہیں اس سے زیادہ کا ان سے مطالبہ کریں۔ تا آنکہ واقعہ بنی نضیر پیش آیا جس میں جنگ نہیں ہوئی۔ اس کا تمام فائدہ اللہ اور رسول (مرکز ملت) کی ملکیت قرار پایا۔ اس وقت حضور کی رائے ہوئی کہ مسلمانوں کی جماعت میں مالی اعتبار سے کسی قدر توازن قائم کر دیں چنانچہ بنی نضیر کا تمام فائدہ خصوصیت کے ساتھ مہاجرین ہی کو عطا کیا گیا۔ انصار میں سے فقط دو آدمی تھے جنہیں اس میں حصہ دیا گیا تھا کیونکہ وہ دونوں واقعی ضرور تمند تھے۔ واقعہ کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے:

مَا آفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى فَلِلَّهِ وَاللِّرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ؕ كَىٰ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ؕ وَمَا اتَّكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ ؕ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ؕ وَاتَّقُوا اللَّهَ ؕ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۗ
لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أَخْرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَآمَوُوا بِمَشَارِقِ الْأَرْضِ ؕ أُولَٰئِكَ كَانَ مِنْكُمْ مَنْ حَفِيَ عَلَىٰ قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ فَمَا كَانُوا يَفْقَهُوا قَوْلَهُ ؕ وَلِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالُهُمْ يُنْفِقُونَ ؕ أُولَٰئِكَ سَمِعُوا لِقَاءَ رَسُولِ اللَّهِ وَرَضُوا ۗ وَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْ قَوْمِكَانَ أُولَٰئِكَ سَمِعُوا لِقَاءَ رَسُولِ اللَّهِ وَرَضُوا ۗ وَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْ قَوْمِكَانَ أُولَٰئِكَ سَمِعُوا لِقَاءَ رَسُولِ اللَّهِ وَرَضُوا ۗ

مختلف آبادیوں کے جو اموال بطور فے کے حاصل ہوں وہ صرف اللہ اور رسول (مرکز ملت) اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہیں۔ یہ حکم اس لئے ہے تاکہ دولت تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتی رہے (بلکہ معاشرہ میں مالی توازن قائم رہے) لہذا رسول جو کچھ تمہیں دیدے وہ لے لو، جو نہ دے اس سے باز رہو اور تقویٰ شعار بنو۔ (یاد رکھو خدا کا عذاب (نافرمانوں کے لئے) بڑا ہی سخت ہے۔ یہ اموال فے صرف ان ضرورت مند ہاجرین کے لئے ہیں جن کو اپنے شہروں اور اموال و دولت سے بے دخل کر کے نکال دیا گیا ہے۔ وہ خدا کے فضل و رضا کے طالب اور خدا کے دین اور رسول کے (مشن کے) مددگار ہیں۔ یہی لوگ اپنے دعوئے ایمان میں سچے ہیں۔

رسول اللہ صلعم کا اموال بنی نضیر میں یہ تصرف کہ انہیں صرف ہاجرین ہی میں تقسیم کرنا۔ قرآن کی طرف سے اس تصرف کی تصدیق و تائید اور پھر اس کی علت بیان کرنا کہ ایسا اس لئے ہے تاکہ دولت صرف چند دولت مند ہی میں سمٹ کر نہ رہ جائے کہ صرف ان کے درمیان ہی گردش کرتی رہے۔ مسئلہ کی حقیقت کو بالکل واضح کرتا ہے جس کے مزید بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں سے صراحتاً یہ اصول مستنبط ہو جاتا ہے کہ اسلام بنیاداً طور پر اس کے خلاف ہے کہ دولت جماعت کے اندر چند ہاتھوں میں محبوس ہو کر رہ جائے اس کے برعکس اسلام کا منشا یہ ہے کہ جماعت کے مختلف اوضاع میں ایک قسم کا ایسا اعتدال پیدا کر دے کہ ملت میں مکمل توازن قائم رہے اور دولت صرف دولت مند لوگوں ہی میں گردش نہ کرتی رہے کیونکہ ایک جہت میں مال و دولت کے انبار جمع ہو جانا اور دوسری جہت سے بالکل سمٹ جانا بہت بڑے اجتماعی مفسد کا باعث بن جاتا ہے جس سے جماعت کے مختلف طبقات میں حسد، کینہ، اور بغض و عناد کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ کچھ ایسے اموال بھی ہیں جن سے مفاد عام وابستہ ہوتا ہے اور افراد کے لئے ان کو کسی جہت سے بھی اپنے لئے مخصوص کر لینا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم نے اس قسم کی تین چیزوں کی تصریح فرمادی ہے۔ یعنی پانی، چارہ، اور آگ۔

الناس شرکاء فی ثلث، الماء، الکلا والنار

تمام لوگ تین چیزوں میں شریک ہیں۔ پانی، چارہ، اور آگ۔

چونکہ عرب کے قدیم تمدن میں یہ تین چیزیں حیات اجتماعی کی ضروریات ہیں شمار ہوتی تھیں لہذا ان تین چیزوں سے تفریق حاصل کرنا پوری جماعت کا حق شمار کیا گیا ہے مگر ظاہر ہے کہ اجتماعی حیات کی ضروریات نہ ہر تمدن میں یکساں ہوتی ہیں نہ ہر زمانہ میں۔ قیاس، جو تشریح اسلامی کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے اس کی گنجائش رکھتا ہے کہ جو چیزیں بھی اس حکم میں داخل ہوں وہ تطبیق کے وقت اس میں شامل کر لی جائیں۔

لہذا اسلام میں انفرادی ملکیت کی طبعی حقیقت کا خلاصہ یہ قانون نکھرا کہ مال عموماً جماعت کی ملکیت ہے اور انفرادی قبضہ مالکانہ نہیں بلکہ محض وکالت ہے جس کے لئے بہت سی شرطیں اور قیود ہیں۔ نیز بعض اموال کا شمار اموال عامہ میں ہو گا جن پر کسی شخص کی انفرادی تحویل بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ ان انفرادی تحویل کا بھی ایک حصہ ایسا ہے جو جماعت کا حق ہے اور جماعت اس حصہ کو افراد سے واپس لے کر ان طبقات پر خرچ کر دیتی ہے جنہیں اس کی ضرورت ہونا کہ وہ اپنی حالت کو درست کر سکیں اور ان کی حالت کی درستگی سے جماعت کی مجموعی حالت درست ہو سکے۔“

(یہ ہے خلاصہ علامہ قطب کی بحث کا)



مذکورہ بالا بحث سے جو نتائج ہمارے سامنے آئے ہیں انہیں ایک مرتبہ پھر دہرایجئے تاکہ آگے بڑھنے میں آسانی ہو۔

- (۱) اسلام نے اموال پر انفرادی ملکیت کے حق کو عینی ملکیت کی حیثیت سے قطعاً تسلیم نہیں کیا۔
- (۲) جو اموال انفرادی تحویل میں ہوں ان پر افراد کو کالٹی حیثیت سے تصرف کا حق رکھتے ہیں ورنہ وہ سب جماعت کی ملکیت ہوتے ہیں۔
- (۳) اموال کی دو قسمیں ہیں۔

(ا) جن پر وکالتی تحویل کا حق تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

(ب) جن پر یہ حق بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

(۴) جو اموال ایسے ہوں کہ ان سے مفاد عامہ وابستہ ہو ان پر انفرادی تحویل کا حق تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

اب سے چودہ سو سال پہلے عرب کے قدیم تمدن میں حضور اکرم صلعم نے اس ضمن میں تین چیزیں۔

(پانی۔ چارہ۔ آگ) کی تعیین و تخصیص فرمادی تھی۔

(۵) اجتماعی حیات کی ضروریات تمام تمدنوں اور تمام زمانوں میں یکساں نہیں ہو سکتیں۔ ان تین چیزوں پر انفرادی تحویل کا حق تسلیم نہ کرنے کی علت چونکہ ان سے مفاد عام کا وابستہ ہونا ہے لہذا قیاس کو کام میں لاتے ہوئے اگر کسی دوسرے تمدن یا کسی دوسرے زمانے میں کچھ اور چیزیں ایسی ہوں جن سے جامعیت عام کا مفاد وابستہ ہو تو ان کو بھی قیاساً اسی ذیل میں شامل کیا جائے گا۔

اس تہید کے بعد آئیے ہم دیکھیں کہ زمین کے متعلق عہد رسالت مآب اور خلافت راشدہ میں کیفیت

کیا تھی۔

عہد رسالت و خلفائے راشدین

زمین کی حیثیت

جیسا کہ معلوم ہے اسلامی نظام کی پہلی تجربہ گاہ سرزمین عرب

تھی۔ اگر ہم اس کو اور مختصر کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ پہلی

منورہ کی سرزمین تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ عرب کی سرزمین زیادہ تر سنگلاخوں اور ریگستانوں پر مشتمل ہے۔ پانی

کی قلت۔ بلکہ سیلوں تک نمایاں کی بنا پر سرسبز نہیں دیکھنے کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ پورے جزیرہ عرب

میں طائف کا ایک حصہ ایسا ہے جسے سرسبز کہا جاسکتا ہے۔ مدینہ منورہ میں کھجوروں کے کچھ باغات اور کہیں

کہیں جو کے چند کھیت نظر آسکتے تھے۔ باغات اور کھیت کے لفظ سے آپ اپنے ذہن میں اپنے ہاں کے باغات

اور کھیتوں کا تصور نہ لے آئیں۔ مدینہ منورہ کے باغات ایسے ہی تھے کہ کہیں کہیں کھجوروں کے

چند درخت لگا دیے گئے اور اس کو باغ کہہ دیا گیا۔ مدینہ منورہ کی یہ سرزمین آج بھی زائرین کے لئے وجہ شادابی

قلب و نگاہ ہے اس کی زرعی حیثیت ایسی نہیں ہے جس کا آج اندازہ نہ کیا جاسکے۔ یا جو حیثیت اس کو عہد رسالت

میں حاصل تھی وہ آج بدل گئی ہو۔ مدینہ منورہ کے دو طرف کالے پتھروں کا وسیع و غریب سنگستان ہے جو

حرفہ کہلاتا ہے۔ یہ تمام علاقہ زراعت کے ناقابل اور بخر ہے۔ باقی حصہ ایسا ہے کہ اس میں درخت وغیرہ لگا

جاسکتے ہیں مگر یہ حصہ بھی مسلسل ایسا نہیں ہے۔ کہیں کہیں قابل زراعت ٹکڑے آجاتے ہیں۔ بہر حال یہ وہ

سرزمین تھی جسے اسلامی نظام کی اولین تجربہ گاہ بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس زمین کا تصور اپنے ذہن میں

رکھئے اور سوچئے کہ کیا اس علاقہ اور اس سرزمین کو مثال بنا کر اپنے موجودہ خمد کے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ

نظام کے لئے وجہ جواز نکالی جاسکتی ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ اس امر کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جن لوگوں

کے پاس یہ زمینیں تھیں وہ بشکل خود ان کی ضرورتوں کو پورا کر سکتی تھیں۔ یہ لوگ خود ہی اپنے ہاتھوں سے

ان میں کام بھی کرتے تھے۔ زمین کے مالک بن کر کام کئے بغیر زمین سے استفادہ کا طریقہ ان میں شمولاً مروج

نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مدینہ کو کھیتی باڑی کرنے والے کسان، کاشتکار وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا۔ قریش مکہ جو خود کو ایک تاجر قوم کے افراد سمجھتے تھے مدینہ والوں کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتے تھے۔ عام لڑائیوں میں مبارزت کے وقت قریشی بہادروں نے انصار مدینہ سے دد و باہتہ کرنا بھی گوارا نہیں کیا اور جواب میں ہی کہا کہ ہم ان کسانوں سے مقابلہ کرنے میں اپنی کسر شان سمجھتے ہیں ابو جہل کو مرتے دم اگر افسوس تھا تو یہی کہ وہ کسانوں کے لونڈوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ چنانچہ اہل مدینہ کے اس پیشہ کے متعلق صحاح ستہ میں ابو ہریرہؓ کا یہ قول موجود ہے۔

کان یشغلہم عمل اراضیہم

ہمارے انصاری بھائیوں کو اپنی زمینوں پر کام کرنے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ مدینہ منورہ کے دواہم قبیلوں اوس و خزرج میں سے قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ کے متعلق امام سرخسیؒ نے نقل کیا ہے کہ

کھیتوں اور نخلستانوں میں کدال اور پھاؤڑ سے کام کرنے کی وجہ سے ان کی بختیلیوں میں گرتے پڑ گئے تھے۔

کتاب الکسب للسرخی منبہ مسبوط جلد ۳ صفحہ ۲۴۵

جس قوم کے سرداروں کا یہ حال تھا ان کے عوام کا حال معلوم۔ البتہ مدینہ منورہ میں بنو حارثہ کا ایک قبیلہ ضرور ایسا موجود تھا جن کے قبضہ میں اپنی ضرورت سے زیادہ زمینیں تھیں۔ چنانچہ خود اس قبیلہ کے ایک فرد حضرت ابان بن خدیجؓ کا یہ قول بخاری میں موجود ہے۔

کنا اکثر الا نصار من راعا ربحاری

تمام انصاری سب سے زیادہ زرعی زمینیں ہمارے پاس تھیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قبیلہ کے لوگ اپنی زمینوں کو بٹائی پر دینے کے بھی عادی تھے۔ بہر حال اگرچہ چھوٹے پیمانے پر ہی سہی مگر زمینداری سسٹم ان کے اندر موجود تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس قبیلہ کے سربراہ اور وہ لوگوں کو طلب فرمایا۔ بخاری میں حضرت ظہیر رافع ابن خدیجؓ کے چچا کا یہ قول موجود ہے۔

رسول اللہ نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ اپنی زرعی زمینوں کے ساتھ تم لوگ کیا کرتے ہو؟

وہاں سے واپس آ کر ظہیر اور ان کے بھائی نے اپنے خاندان کے لوگوں کو جو حضورؐ کا حکم پہنچایا ہے اس کے

الفاظ یہ ہیں۔ رافع بن خدیجؓ کہتے ہیں۔

میں نے اپنے دونوں چچاؤں (ظہیر اور مہیر) سے سنا جبکہ وہ دونوں اپنے محلہ والوں سے کہہ رہے تھے کہ زمین کو کرایہ پر بند و بست کرنے کی رسول اللہ ﷺ نے مانعت فرمادی ہے۔ (صحیح ستہ) رافع ابن خدیجؓ اپنے ماموں سے نقل کرتے ہیں۔

میرے ماموں ایک دن آئے اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسی بات سے منع فرمادیا ہے جو تم لوگوں کے لئے زیادہ نفع بخش تھی مگر اللہ اور رسول کی فرمائندگی ہمارے اور تمہارے لئے کہیں زیادہ نفع بخشا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تہائی اور چوتھائی پر اور کرایہ پر زمینیں دینے سے بالکل منع فرمادیا ہے۔

(کنز العمال۔ صفحہ ۱۷)

شمس الائمہ حسینی نے امام محمدؒ کے حوالے سے اسید بن حضیر صحابیؓ یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

اے بنو عارثہ والو! آج تم پر پیری مصیبت ٹوٹ پڑی۔ کرایہ پر زمینوں کا بند و بست کرنے سے

رسول اللہ ﷺ نے مانعت فرمادی ہے۔ (مبسوط جلد ۲۳ صفحہ ۱۷)

رافع ابن خدیجؓ کی یہ روایتیں تمام صحاح ستہ میں مختلف الفاظ کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں یہ الفاظ ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے زرعی زمینوں کو کرایہ پر بند و بست کرنے سے منع کر دیا ہے۔ (بخاری)

کہیں ان الفاظ میں ہے

رسول اللہ ﷺ نے منع فرمادیا ہے کہ زمین کو بند و بست کر کے زمین کے مقابلہ میں کوئی معاوضہ یا

کسی قسم کا کوئی حصہ لیا جائے۔ (مسلم وغیرہ)

کہیں یہ تصریحات ہیں۔

رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا تنخواہ بہت اناج بھی کاشتکار سے زمین کا مالک نہیں

لے سکتا؟ فرمایا نہیں، پھر سوال کیا گیا کہ اچھا غلہ نہ سہی بھوسا تو لے سکتا ہے؟ فرمایا

نہیں۔ (نسائی)

کہیں یہ بھی تفصیلات دی گئی ہیں۔

زمین کو چوتھائی، تہائی، یا اناج کی مقررہ مقدار پر بھی بند و بست کرنا جائز نہیں

ہے۔ (ابوداؤد۔ و مسند احمد۔ و کنز العمال)

رہ گئی یہ صورت کہ زمین کو نقد رقم کے مقابلہ میں بندوبست کیا جائے تو اس کے متعلق رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے کچھ نقل نہیں کرتے۔ وہ محض اپنی رائے بیان کرتے ہیں اور ان کی یہ رائے مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے۔ کبھی وہ فرماتے ہیں:-

دینار اور درہم کی شکل میں زمین کو کہہ کر ایہ پر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (بخاری)

مگر ساتھ ہی جب ان کے پوتے عمران بن سہل ان سے آکر عرض کرتے ہیں:-

کہ دادا جان! میں نے دو سو درہم پر اپنی زمین کرایہ پر دیدی ہے۔

تو وہ بایں الفاظ ان کو منع فرمادیتے ہیں:-

اس طریقہ کو چھوڑ دو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمینوں کو کرایہ پر لینے

سے منع فرمایا ہے۔

اس اختلاف رائے کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نقدی بندوبست کا رواج نہیں تھا اس لئے صراحتہ حضور سے اس کی مانعت مروی نہیں تھی۔ لہذا کبھی وہ یہ خیال کرتے تھے کہ جس چیز سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتہ منع نہیں فرمایا اس سے ہم کیوں منع کریں اور کبھی وہ اسولی مانعت کو سامنے رکھتے ہوئے اس سے منع فرمادیتے تھے۔ بخاری میں موجود ہے کہ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے نقدی بندوبست کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ

سو نے چاندی پر بندوبست کرنے کا اس زمانہ میں رواج نہیں تھا۔

بہر حال جہاں رافع ابن خدیج رضی اللہ عنہ سے اس کی اجازت نقل کی جاتی ہے وہ ان کا اپنا قول ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں۔ یہی بات کہ بعض روایتوں میں رافع ابن خدیج رضی اللہ عنہ نے اس اجازت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی منسوب کیا ہے تو اس کے متعلق حافظ ابن حجر نے تصریح کی ہے۔

در اصل راوی کو سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے ورنہ درحقیقت یہ سعید بن المسیب کا قول ہے جسے راوی نے

کچھ اس طرح غلط ملط کر دیا ہے کہ یہ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم معلوم ہوتا ہے۔

(فتح الباری - جلد ۵ - صفحہ ۲۰)

رافع ابن خدیج رضی اللہ عنہ کے علاوہ اسی مضمون کی حدیثیں دوسرے صحابہ سے بھی مروی ہیں۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

کچھ صحابہ کے پاس زائد از ضرورت زمینیں تھیں۔ پس رسول اللہ صلعم نے فرمایا جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ زمین ہو اسے وہ خود ہی کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو بخش دے یا اپنی زمین کو روک رکھے۔

(بخاری مسلم)

دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں۔

عطاء بن جابر سے نقل کرتے ہیں کہ لوگ تہائی چوتھائی اور نصف بٹائی پر زمینیں کاشت کے لئے دیا کرتے تھے۔ اس پر نبی صلعم نے فرمایا جس کے پاس زمین ہو اسے وہ خود کاشت کرے یا کسی کو بخش دے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اپنی زمین کو روک رکھے۔

(بخاری مسلم)

بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے بھی ایسی قسم کے الفاظ منقول ہیں۔ اسی مضمون کی روایات حضرت زید بن ثابت اور ثابت بن الضحاک اور ابوسعید خدری سے بھی نقل کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو مسلم۔ ابوداؤد۔ طحاوی وغیرہ یہاں تک آپ نے دیکھ لیا کہ رسول اللہ صلعم کے زمانے میں صورت حالات کیا تھی۔ زمین بے جا سلتے کہ اس سے انسان اپنی غذا پیدا کریں غذا پیدا کرنے کے لئے زمینیں لامحالہ کسی نہ کسی کی تحویل میں ضرور دیکھائیں گی ورنہ وہ خود پٹری پٹری غذا اگلنے سے رہیں چنانچہ آپ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو جن لوگوں کے قبضہ میں زمینیں چلی آ رہی تھیں آپ نے ان کو انہی کی تحویل میں رہنے دیا کیونکہ عام طور سے لوگوں کے پاس اپنی ذاتی ضرورتوں سے زیادہ زمینیں نہیں ہوتی تھیں اور جن لوگوں کے پاس زمینیں ہوتی تھیں وہ اپنے ہاتھوں سے اس میں کام کاج کرتے تھے۔ مدینہ منورہ میں صرف بنو حارثہ کا ایک قبیلہ ایسا تھا جن کے قبضہ میں اپنی ضرورت سے زیادہ کچھ زمینیں تھیں اور وہ بٹائی پر لوگوں کو زمینیں دیا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلعم کو معلوم ہوتا ہے تو آپ اس کو فوراً بند فرمادیتے ہیں۔ بٹائی پر دینے سے بھی اور کسی دوسری صورت میں گرایہ پر دینے سے بھی۔ نقد بندوبست کا اس زمانہ میں رواج موجود نہیں تھا لہذا اس کی مانع صراحتاً آپ سے نقل نہیں کی گئی لیکن نھی عن کراء الارض - نھی عن اہزار عنہ وغیرہ عمومی ارشادات سے اس صورت کا حکم بھی صاف طور پر معلوم ہو سکتا ہے۔ زمین کو غلہ کی مقدار پر کاشت کے لئے دیا جائے یا روپیہ پیسے پر روح دونوں جگہ ایک ہی ہے لہذا حکم میں کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔ رافع بن خدیج نقد بندوبست کے متعلق حضور کی مانع کی نفعی کرتے ہیں جس کی وجہ وہ خود ہی بتا دیتے ہیں کہ آپ کے زمانہ میں اس کا رواج ہی نہیں تھا لیکن جب عملی طور پر خود ان کا پوتا ایسا کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کو اس سے روک دیتے ہیں اور استدلال میں حضور کا وہی

عمومی حکم نقل فرماتے ہیں۔

یہ تھا نقشہ حضورؐ کی زندگی میں مدینہ منورہ کی زمینوں کا جس سے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کی بوجہ نہیں

آتی۔

بے محل نہ ہوگا اگر اسی سلسلہ میں واقعہ خیبر کا تذکرہ بھی کر دیا جائے جو بہت سی غلط فہمیوں کا موجب بنا اور آج تک بنا چلا آرہا ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کا تذکرہ امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحبان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

(۲) ابن عمرؓ کی روایت ہے اور عبداللہ بن عباسؓ اور انس بن مالکؓ کی روایات اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ نبی صلعم نے خیبر پر حملہ کیا اس کا کچھ حصہ صلحاً فتح ہوا اور کچھ بزرگ شمشیر منسوب ہوا۔ آنحضرتؐ نے آدھے علاقہ کو حکومت کی ضروریات کے لئے مخصوص فرما دیا اور آدھے علاقہ کوہ اقطاعات میں تقسیم کر کے ان مجاہدین پر بانٹ دیا جو غزوہ خیبر میں شریک تھے یعنی بحساب ۱۰۰-آدی فی قطفہ) پھر آپ نے ارادہ فرمایا کہ معاہدہ کے مطابق یہودیوں کو وہاں سے نکال دیں۔ مگر یہودیوں نے آکر عرض کیا کہ آپ ہمیں یہاں رہنے دیں۔ ہم آپ کی طرف سے یہاں کاشت کریں گے آدھی پیداوار آپ لے لیجئے گا اور آدھی ہم لے لیں گے۔ آنحضرتؐ نے یہ دیکھ کر کہ آپ کے پاس کام کرنے والے آدمیوں کی کمی ہے، ان کی بات مان لی، اور ان سے فرمایا کہ ہم جب تک جاہل ہیں گے تم کو رکھیں گے اور جب جاہل گے تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔ چنانچہ ان شرائط پر آپ نے ان سے معاملہ طے کر لیا۔ وہ کاشتکاروں کی حیثیت سے خیبر میں کام کرتے تھے۔ آدھی زمین کی مالک حکومت تھی اور بقیہ نصف کے مالک وہ ۵۰ سو حصہ دار تھے جن پرہ اقطاعات تقسیم کئے گئے تھے۔ بٹائی کے معاہدہ کی رو سے جو نصف پیداوار وہاں سے آتی تھی اس کو حکومت اور جبہ دارانہ کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ نبی صلعم کا اپنا حصہ بھی عام حصہ داروں کے ساتھ تھا۔ چنانچہ آپ اس میں سے ہر سال ایک خاص مقدار میں فتلہ اور کھجوریں اپنی ازواج مطہرات کو برابر برابر دیا کرتے تھے۔ یہ بندوبست حضورؐ کے آخر حیات تک جاری رہا۔ اسی پر حضرت ابو بکرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں عمل کیا۔ اسی پر حضرت عمرؓ اپنے ابتدائی زمانہ میں کاربند رہے۔ پھر جب یہودیوں نے خیبر میں پیہم شرارتیں کیں اور حضرت عمرؓ کی رلے یہ ہوئی کہ معاہدہ کے مطابق

ان کو وہاں سے نکال دیا جائے تو آپ نے اعلان کیا کہ خیر میں جس جس کا حصہ ہے وہ جا کر اپنی اپنی زمین بنھالے۔ ازواج مطہرات کے سامنے حضرت عمرؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ میں سے جو چاہیں وہ اتنی زمین لے لیں جس کی پیداوار اسی قدر ہو جس قدر غلہ اور مٹرہ آپ کو نبی صلعم کے زمانہ سے ملتا آ رہا ہے اور جو چاہیں اپنے حصہ کی زمین حکومت کے انتظام میں رہنے دیں اور اتنا ہی غلہ اور مٹرہ حکومت سے لیتی رہیں۔ اس تجویز کے مطابق بعض ازواج مطہرات نے غلہ اور مٹرہ پسند کیا اور حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ رضی اللہ عنہما نے زمین لینی اس کے بعد حضرت عمرؓ نے یہودیوں کو خیبر سے منتقل کر کے تیمار اور رجا میں بسا دیا۔

(بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

یہ عہد نبوت و خلافت کے مشہور ترین واقعات میں سے ہے اور اس کی صحت میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں صریح طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ نبی صلعم نے خود بٹانی پر زمین کاشت کے لئے دی ہے اپنی طرف سے بھی حکومت کی طرف سے بھی اور ان پندرہ سو افراد کی طرف سے جن کا حصہ خیبر میں تھا۔ اس طریقہ پر آپ اپنے آخری لمحہ حیات تک عامل رہے اور آپ کے بعد شیخین کا عمل بھی اسی پر رہا۔ کیا اس کے بعد بھی کسی کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اسلامی قانون میں بٹانی پر زمین کاشت کے لئے دینا ممنوع تھا؟ (مسئلہ ملکیت زمین)

امیر جماعت اسلامی کی اس جسارت پر ہم کیا کہیں؟ انہیں شاید معلوم ہو کہ یہی واقعہ خیبر ہے جس سے لفظ مخاہیرہ بنا یا گیا ہے۔ مخاہیرہ کے معنی ہوتے ہیں خیبر جیسا معاملہ کرنا۔ اس سے پہلے خود مودودی صاحب صحاح ستہ کے حوالوں سے حضرت زید بن ثابت، جابر بن عبد اللہ، رافع بن خدیجؓ کی روایتوں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک نقل کر چکے ہیں کہ ”نھی رسول اللہ صلعم عن المخاہیر“ جس کا ترجمہ ہوا۔ ”رسول اللہ صلعم نے خیبر جیسا معاملہ کرنے سے منع فرمایا ہے“۔ یہ روایات متعدد صحیح سندوں سے متعدد صحابہؓ سے خود صحیحین تک میں موجود ہیں۔ ان روایات میں مخاہیرہ کا لفظ خود بتلا رہا ہے کہ خیبر کا یہ واقعہ اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا اور اس معاملہ ہی کے پیش نظر عربی زبان اسی واقعہ سے ایک لفظ بھی وضع کیا جا چکا تھا جو عام طور سے مستعمل تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ لفظ یہ بھی بتا رہا ہے کہ خیبر کے معاملہ کی حیثیت کچھ اور تھی۔ وہ بٹانی پر بندوبست کرنا نہیں تھا اور نہ مخاہیرہ کے اس نئے لفظ کو استعمال کرنے کی

کوئی ضرورت ہی نہیں تھی جبکہ عربی زبان میں محافلہ - مزارعہ جیسے دوسرے بہت سے الفاظ پہلے سے موجود تھے۔

آنحضرت مسلم نے مجھوروں اور زمین کی پیداوار کے نصف کی جو شرط عالم کی تھی وہ جزیرہ کے طور پر تھی اذ
اس کی دلیل یہ ہے کہ تاریخ میں یہ کہیں موجود نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے اس کے
علاوہ کوئی جزیرہ لیا ہو یہاں تک کہ آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور ابو بکرؓ و عمرؓ نے بھی
نہیں لیا حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے ان کو جلاوطن کر دیا۔ اگر یہ جزیرہ نہ ہوتا تو آیت جزیرہ کے نزول کے
بعد ان سے جزیرہ ضرور لیا جاتا۔
(بحوالہ عینی شرح بحاری صفحہ ۷۲۴)

آپ اس نکتہ کو پھر سمجھ لیجئے کہ مووودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ جنگ خیبر کے بعد یہودیوں کی زمین
مسلمانوں کی ملکیت میں آگئی تھی اور انہوں نے (مسلمانوں نے) اسے یہودی کاشتکاروں کو بٹائی پر
دیدیا تھا۔ اس سے وہ زمین کو بٹائی پر دینے کی سند پیش کرتے ہیں۔ لیکن (جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے)
اس زمین کو مسلمانوں نے اپنی ملکیت میں نہیں لیا تھا۔ وہ یہودیوں ہی کی ملکیت میں رہی تھی۔ اسلامی حکومت
نے ان سے ذمی ٹیکس (نقدی کے بجائے) پیداوار کی شکل میں وصول کیا تھا۔ یہ بات رکہ زمین یہودیوں
کی ملکیت میں رہی تھی، خود مووودی صاحب کو بھی تسلیم ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب الجهاد فی الاسلام
میں لکھتے ہیں۔

یہودیوں کے اخراج کا فیصلہ ہو گیا۔ لیکن ان مجرموں کو اس طرح جلاوطن نہ کیا گیا کہ ان کے
اموال داراھنی پر قبضہ کر کے انہیں بیک بینی و دو گوش نکال دیا گیا ہو۔ جو کچھ وہ چھوڑ گئے اس کا
پورا پورا معاوضہ بیت المال سے دیا گیا۔
(طبع دوم - صفحہ ۲۶۳)

اس سے واضح ہے کہ جنگ خیبر کے بعد یہودیوں کی زمین ان کی ملکیت ہی میں رہی تھی اس لئے جب حضرت عمرؓ
کے زمانے میں انہیں خیبر سے نکالنا پڑا تو انہیں اس زمین کی قیمت ادا کی گئی۔ چنانچہ مشہور مصری مصنف
محمد حسین ہیکل، اپنی کتاب عمر فاروق میں لکھتے ہیں کہ

یہی کچھ ان یہودیوں کے ساتھ کیا گیا جو خیبر اور فدک میں باقی رہ گئے تھے۔ انہیں وہاں سے
جلاوطن کر کے شام بھیج دیا گیا۔ ان کی زمینوں کی قیمت انہیں دیدی گئی اور ان میں سے کسی کے
ساتھ بدسلوکی نہیں کی گئی۔
(صفحہ ۵۷۸)

یہ حقائق اس کی شہادت دیتے ہیں کہ جنگ خیر کے بعد، یہودی اپنی زمین کے بدستور مالک رہنے دیئے گئے تھے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب وہ اپنی زمین کے مالک تھے تو ان سے بٹائی کا معاملہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بٹائی کا معاملہ مزارع مالک زمین سے کرتا ہے۔



یہاں تک کی تفصیلات سے آپ نے دیکھ لیا کہ رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک میں لوگوں کے پاس دو قسم کی زمینیں تھیں۔

(۱) وہ زمینیں جو اسلام لانے سے پہلے لوگوں کے قبضہ میں چلی آ رہی تھیں۔

(۲) جو بعد میں ضرورت کے لحاظ سے مرکزِ ملت کی طرف سے ضرورتمند مسلمانوں کو عطا ہوئیں۔

(۳) پہلی قسم کی زمینیں زیادہ تر اتنی ہی تھیں جو بمشکل اپنے قابض لوگوں کی ضروریات کو کافی ہوتی تھیں۔

(۴) صرف بنو حارثہ کے پاس ضرورت سے زیادہ زمینیں موجود تھیں اور وہ اپنی زمینیں بٹائی پر دینے کے عادی تھے۔

(۵) بٹائی پر دینے کے سسٹم کو رسول اللہ صلعم نے قطعاً بند فرما دیا اور حکم دیا کہ جس کے پاس قبیل زمینیں ہوں وہ اپنے دوسرے بھائیوں کو بخش دیں۔

(۶) حضرات صحابہؓ کی اطاعت و فرمانبرداری کو دیکھتے ہوئے یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ صحابہؓ نے اس پر عمل نہیں فرمایا ہوگا۔ اس لئے ایسا یقین کر لینے میں کوئی مانع نہیں ہے کہ ضرورت سے زیادہ زمینیں ضرورتمندوں کو فوراً دیدی گئی ہوں گی۔

(۷) جن لوگوں کے پاس زمینیں تھیں وہ خود ہی ان میں کام کرتے تھے۔

(۸) مرکزِ ملت کی طرف سے جن لوگوں کو زمینیں دی گئی تھیں وہ بھی خود ہی ان میں کام کرتے تھے۔ ان کو بٹائی پر نہیں دے سکتے تھے۔

(۹) خیر کی زمینیں مسلمانوں میں تقسیم کر دی گئی تھیں اور وہ اپنی مقدار کے لحاظ سے ضرورت سے زیادہ زمینیں نہ تھیں۔

(۱۰) خیر کی زمینیں وہاں کے یہودی باشندوں کو مرکزِ ملت کی طرف سے بٹائی پر دی گئی تھیں مگر

یہ معاملہ بٹائی کا معاملہ نہیں تھا بلکہ خراج یا جزیہ وغیرہ کا کوئی معاملہ تھا۔

(۱) چونکہ خیر کے اس معاملہ سے شبہ ہو سکتا تھا اس لئے رسول اللہ صلعم نے صراحت کے ساتھ صحابہؓ کو خیر جیسا معاملہ کرنے کی ممانعت فرمادی تھی۔

اب اس کے بعد آپ یہ دیکھتے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جن لوگوں کے پاس یہ زمینیں تھیں ان کی حیثیت کیا تھی؟ وہ ان پر بحیثیت کاشتکار کے قابض تھے یا بحیثیت مالک کے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ یہ زمینیں افرادِ ملت کی ملکیت تصور ہوتی تھیں یا مرکزِ ملت کی؟

اصولی طور پر ہم یہ چیز پہلے وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ زمین تو زمین اسلام کسی قسم کی چیز میں بھی انفرادی ملکیت کو عینی ملکیت کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا۔ وہ انتفاع اور استفادہ کے لئے افراد کی تحویل میں وکالتی حیثیت سے اموالِ دیدینے میں مضائقہ نہیں سمجھتا مگر ملکیت بہر حال جماعت ہی کی رہتی ہے زمین بھی اسی طور پر اس سے خارج نہیں ہے لیکن خصوصی طور پر زمین کے متعلق بھی ہمیں اس قسم کے اشارات ملتے ہیں جن سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ یہ زمینیں جو ان افراد کی تحویل میں تھیں وہ مرکزِ ملت ہی کی ملکیت تصور ہوتی تھیں نہ کہ انفرادی۔

(۱) عہدِ نبویؐ میں قابل کاشت زمینوں کی خرید و فروخت کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔

(۲) جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ زمینیں تھیں ان کو رسول اللہ صلعم نے تین باتوں کا اختیار دیا تھا۔ رافع ابن خدیجؓ کی یہ روایت پہلے گزر چکی ہے جس میں رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے۔

جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ زمین ہو اسے وہ خود ہی کاشت کرے۔ یا اپنے کسی بھائی کو بخش دے۔ یا اپنی زمین کو یونہی پڑا رہنے دے۔

تیسرا اختیار تو محض تہدید کی نوعیت کا ہے اصل میں دو ہی اختیار تھے یا وہ خود کاشت کریں یا اپنے کسی بھائی کو بخش دیں۔ اگر زمینوں کی بیع و فروخت بھی مشروع ہوتی تو تیسرا تہدید پہلو اختیار کرنے کے بجائے سیدھی بات یہ ہوتی کہ یوں کہا جاتا کہ وہ دوسرے کسی بھائی کو قیمتاً فروخت کرے یہ صورت زیادہ سہل، آسان اور قابل قبول ہو سکتی تھی مگر اس صورت کا اختیار نہیں دیا گیا۔

(۳) عہدِ رسول اللہ صلعم میں ملکیت کا قانون یہ تھا کہ جو شخص تین سال تک اپنی زمین کو بیکار و معطل

پھوڑے رکھے، حکومت اس زمین کو واپس لیلے اور کسی دوسرے آدمی کے حوالہ کر دے۔ چنانچہ علامہ ابن علیہ لکھتے ہیں۔

ایک صحابی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین عطا کی تھی لیکن وہ اس کو آباد نہ رکھ سکے۔ اس وجہ سے حضرت عمرؓ نے یہ زمین ان سے واپس لے لی اور حاجتمندوں میں تقسیم کر دی۔

(کتاب الاموال لابن علیہ صفحہ ۲۹۰)

قرن اول میں زرعی نظام

[ہماری تاریخ میں 'قرن اول کے زرعی نظام کا جو خاکہ ملتا ہے مولانا محمد تقی امینی صاحب کے اس مضمون میں اسے سامنے لایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس مہتید کو پیش نظر رکھئے جو سابقہ مضمون کے شروع میں لکھی گئی ہے۔]

ہسلام ایک عالمگیر انقلاب کی شکل میں اسات و عدالت، افادیت و رحمت انوت و مساوات اور انیقا و قربانی کا پیام لے کر وادی "غیر ذی زرع" سے نمودار ہوا اور کچھ ہی عرصہ کے بعد اس نے دنیا کی زہریلی بہاؤں کو نسیم سحر کے جھونکوں میں تبدیل کر دیا اور ایک فضا پیدا کر دی کہ نہ تو ملکیت کی آڑ میں جو رو استبداد کی گنجائش باقی رہ گئی اور نہ روٹی کی خاطر انسان غیر اللہ کی غلامی پر مجبور رہا۔ اس نے ذرائع پیداوار کی تنظیم و تقسیم میں مذہب و ملت کا فرق کئے بغیر ضرورت و صلاحیت اور حسن عمل کو ملحوظ رکھا۔ اور اپنے زمانہ کے زمیندار آ و جاگیر دارانہ نظام کو ختم کر کے ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی جس میں زمین کی ملکیت کا تصور نہیں بلکہ اس کے آثار ہونے کا تصور غالب تھا۔

چنانچہ خلافت الہی میں ایک قسم ان اراضی کی ملتی ہے جو مفاد عامہ کے پیش نظر خلافت کی جانب سے لوگوں کو دی جاتی تھیں جس کو عربی زبان میں "قطاع" کہتے ہیں۔ اس انتظام کی دو صورتیں رائج تھیں۔

(۱) کاشت کے لئے کسی کو زمین دی جاتی تھی اور وہ خود اس زمین پر کاشت کرتا تھا۔

(۲) اگر مفاد عامہ کی کوئی خدمت سپرد ہونے کی بنا پر وہ خود کاشت نہ کر سکتا تو دوسرے کے ذریعہ

کاشت کرتا تھا اور آمدنی یا پیداوار میں دونوں شریک ہوتے تھے۔

خلافت کی جانب سے اس عطیہ کی کبھی تو یہ شکل ہوتی کہ اس کو صرف زمین کی منفعت کا مالک بنا دیا جاتا اور ذاتین پر کسی قسم کے تصرف بیع ہبہ وغیرہ کا اختیار نہ ہوتا تھا۔ اور کبھی زمین اور اس کی منفعت دونوں کا مالک بنا دیا جاتا تھا۔ اس آخری صورت میں ہر قسم کے تصرفات بیع ہبہ وغیرہ کے اختیارات بھی اس کو حاصل ہوتے تھے۔

لیکن قطائع کی کوئی شکل بھی سرکاری قانون اور ٹیکس سے مستثنیٰ نہ تھی بلکہ اجتماعی مفاد کے لئے خلیفہ کے اختیارات بہ نسبت دوسری زمینوں کے "قطائع" پر زیادہ ہوتے تھے۔ چنانچہ اپنی اختیارات کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے بعض قطائع کو جلیل القدر صحابیوں سے واپس لے لیا تھا اور اس واپسی میں مفاد عامہ کے علاوہ اور کوئی جذبہ کلام نہ رہا تھا۔ جس طرح رسول اللہ نے مفاد عامہ کی خاطر "قطیہ" دیا تھا اسی طرح حضرت عمرؓ نے اسی کے پیش نظر واپس لے لیا تھا۔ دراصل قطائع دینے اور ان کے واپس لینے دونوں میں مفاد عامہ کی روح کام کر رہی تھی۔

اس بحث کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہے تاکہ زمانہ خلافت کے "قطائع" کی اصل حقیقت واضح ہو سکے اور یہ بھی معلوم ہو سکے کہ بعد میں اس کی اصل حقیقت کس قدر مسخ ہوئی اور اب اس لفظ کو موجودہ زمینداری و جاگیرداری کی حمایت میں کس بری طرح آلہ کار بنایا جا رہا ہے۔

زمانہ خلافت کے قطائع کی اصل شکل | خلافتِ الہی میں قطائع کی جو نوعیت تھی اس کو سامنے رکھ کر ان کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے "مفاد عامہ کی خاطر غیر آباد زمین کو آباد کاری کے لئے کسی کو دینا اور حسب حاجت و مصلحت اس سے سرکاری ٹیکس وصول کرنا"۔

سندھ ذیل تصریحات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔
 اِلَّا قِطَاعٌ اَعْطَاءُ الْاَرْضِ لِلْاَحْيَاءِ سَوَاءٌ وَجَبَ فِيهِ الْحَشْرُ
 اَوْ لِحُرَابٍ

"اقطاع" کسی کو آباد کاری کے لئے زمین دینا خواہ اس میں عشر واجب ہو یا حشر۔

علامہ مقرئ نے اس سلسلہ میں کلام عرب کا یہ محاورہ نقل کرتے ہیں۔

أَقْطَعَهُ نَهْرًا أَوْ أَرْضًا أَبَاحَ لَهُ ذَلِكَ

نہریا زمین "قطیعتہ" دیا۔ یعنی اس کے لئے مباح کر دیا۔

علامہ بدرالدین عینی "شارح بخاری فرماتے ہیں۔

"قطاع" قطعہ کی جمع ہے۔ خلیفہ کے قطاع دینے کی یہ شکل ہے کہ جس شخص میں وہ ^{اہل}بیت

وصلاحیت دیکھے اللہ کے اموال میں سے کچھ حصہ خلافت کی جانب سے اس کو عطا کر دے۔

اکثر اس لفظ کا استعمال زمین کے بارے میں آتا ہے اور اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔

(۱) یا تو زمین کی ذات اور منفعت دونوں کا مالک بنا دیا جاتا ہے۔

(۲) یا صرف زمین کی منفعت کا مالک بنایا جاتا ہے ذات کا نہیں۔

قاضی ابوبکر بن علی "شارح ترمذی" کہتے ہیں۔

"قطاع" ہبہ ہے جس میں ایک حصہ دوسرے شرکاء سے جدا کر دیا جاتا ہے کیونکہ اصولاً آرا

میں تمام لوگ برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا بیان ہے۔

وَالسُّلْطَانُ إِقْطَاعُهُ عَلَى الْمَلِكِ وَكَذَا عَلَى عَدَمِهِ

خلیفہ کو قطاع دینا جائز ہے چاہے تو زمین کا مالک بنا دے اور چاہے تو مالک نہ بنے (صرف

انتفاع کا موقع دے)۔

ان تمام تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خلافت الہی میں "قطاع" کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ کسی شخص

کو آباد کاری کے لئے خلافت کی جانب سے زمین دی جاتی تھی اور وہ زمین سرکاری قانون اور ٹیکس سے مستثنیٰ نہ

ہوتی تھی بلکہ خلیفہ کے اختیارات اس پر بہ نسبت دیگر اراضی کے زیادہ ہوتے تھے۔ بعض متأخرین نے "قطاع"

کی یہ تعریف کی ہے۔

هُوَ تَمْلِيقُ الْأَرْضِ مَزْدُونًا عَنِ الْمَوْلَى فَلَا يَكُونُ فِيهَا الْعَشْرُ وَالْخَرَاجُ

"قطاع" کسی کو زمین کا اس طرح مالک بنا دینا کہ اس پر ٹیکس وغیرہ نہ عشر کی صورت میں واجب ہو اور

نہ خراج کی صورت میں۔

ظاہر ہے کہ قطائع کی یہ تعریف مذکورہ بالا تعریفوں سے کتنی مختلف اور حقیقت سے کس قدر دور ہے، زمانہ خلافت میں نہ اس قسم کی تنظیم کا کوئی ثبوت ملتا ہے اور نہ یہ مزاج اسلامی ہی کے موافق سمجھتی ہے۔ اسلام تو دراصل اسی قسم کی زیادتیوں کو ختم کرنے کے لئے آیا ہے نہ کہ ان کو باقی رکھنے اور رواج دینے کے لئے۔ احادیث و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تین قسم کی اراضی ایسی تھیں جو خلافت کی جانب سے لوگوں کو بطور قطیعہ دی جاتی تھیں۔

(۱) بنجر زمین جو ہمیشہ سے غیر مزدور اور غیر آباد چلی آتی تھی۔ ایسی زمینوں کی دیرانی اور سختی دیکھ کر عام لوگوں کو انہیں قابل کاشت بنانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ خلافت نے ایسی زمینوں کی طرف توجہ کر کے انہیں قابل کاشت بنانے کے لئے لوگوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ چنانچہ، نبتع میں جو زمین حضرت زبیر کو دی گئی تھی وہ اسی زمین سے تھی۔

(۲) افتادہ زمین جس میں قابل زراعت ہونے کے باوجود کسی وجہ سے کاشت نہ ہوتی تھی اس میں تمام وہ زمینیں شامل تھیں جو بستیوں کے اجاڑ ہو جانے کے بعد بیکار پڑی رہتی تھیں اور انہیں کوئی آباد کرنے والا نہ رہ جاتا تھا۔ مدینہ کی وہ زمینیں بھی اسی میں شامل تھیں۔ جو آپاشی کی دشواری کی وجہ سے رسول اللہ کے حوالہ کر دی گئی تھیں اور ان کو آپ نے لوگوں میں زراعت کی خاطر تقسیم کر دیا تھا۔ چنانچہ بلال بن حارث کو رسول اللہ نے وادی قبیق اسی زمین سے عطا فرمائی تھی۔

(۳) خالصہ زمین اس میں مفتوحہ علاقوں کی تمام وہ زمینیں شامل ہوتی تھیں جو خلافت کے لئے خالصہ قرار دی جاتی تھیں۔ ایسی زمینوں کی کئی قسمیں تھیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ جن زمینوں کے مالک جنگ میں مارے جاتے۔

ب۔ یا بھاگ جاتے۔

ج۔ شاہی جاگیریں جو بادشاہ کے صرف خاص کے لئے "خالصہ" ہوتی تھیں۔

د۔ شاہی خاندان اور امیران کی جاگیریں۔

۴۔ ترائی، جھیلیں، جھاڑیاں وغیرہ۔

یہ اور اسی قسم کی تمام وہ زمینیں جن پر چند افراد قابض ہو کر عیش کرتے تھے اور اسلامی غلبہ کے بعد

ان کا کوئی مالک اور آباد کرنے والا نہ رہ جاتا تھا۔ اسی تمام زمینیں خلافت کے لئے "خالصہ" ہو کر مفاد عامہ کے لئے وقف ہو جاتی تھیں۔

ابو عبید خالصہ زمین کی تفصیل بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

فَلَمْ يَبْقَ بِهَا سَاكِنٌ وَ لَهَا عَامِرٌ فَكَانَ حُكْمُهَا إِلَى الْإِمَامِ

مذکورہ خالصہ زمینوں میں نہ کوئی رہنے والا باقی رہتا تھا اور نہ آباد کرنے والا اس لئے ان کا مالک خلیفہ کے سپرد ہو جاتا تھا۔

قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں۔

وَ ذَلِكَ بِمَنْزِلَةِ الْمَالِ الَّذِي لَمْ يَكُنْ لِأَحَدٍ وَ كَافِيَ يَدِ أَحَدٍ

اسی زمین کی حیثیت اس مال جیسی ہوتی تھی جو نہ کسی کا ہو اور نہ کسی کے قبضہ میں ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ زمانہ خلافت میں اپنی زمینوں سے "قطاع" دینے جاتے تھے جو نہ تو کسی کے قبضہ میں

ہوتیں اور نہ کوئی ان کا مالک اور وارث ہوتا۔ نہ کسی کے آباد کرنے کا کوئی نشان ہوتا اور نہ اسی زمین ہوتی جو قانوناً کسی کو نہ دی جاسکتی تھی مثلاً چراگاہ، جنگل، نمک کی جھیل وغیرہ اور نہ اسی صورت ہوتی جس میں کسی کے نقصان کا سوال پیدا ہوتا۔

اسی زمینوں کے متعلق دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ یا تو وہ بیکار پڑی رہتیں اور حقوق عامہ جو زمین سے

متعلق ہیں وہ پائمال ہوتے رہتے (۲) اور یا وہ صورت اختیار کی جاتی جو مفاد عامہ کے لحاظ سے مناسب اور بہتر ہوتی۔

خلافت نے نفع خلق کے پیش نظر دوسری صورت اختیار کی تھی یہ اسی انتظام کا نتیجہ تھا کہ زمانہ خلافت

میں تمام بخر و فسادہ زمینیں آباد ہو گئی تھیں اور آباد شدہ زمینوں سے غلہ اگلنے لگا تھا۔

حکومت الہی میں قطاع دینے کا مقصد زیادہ

سے زیادہ پیداوار حاصل کرنا اور خلق اللہ کا عام مفاد ہوتا تھا۔ جب تک یہ مقصد پورا ہوتا رہتا خلافت کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی تھی لیکن اگر اس کا

کو تباہی ہوتی یا اور کوئی عمدہ صورت اراضی کے تنظیم کی سامنے آتی جس میں نفع خلق زیادہ معلوم ہوتا تو خلافت کو بے دخل کرنے کا پورا حق حاصل ہوتا تھا۔

چنانچہ تاریخ میں چند ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں بلا پس و پیش اسی نظریہ کے ماتحت صاحب زمین کو بیدخل کر دیا گیا تھا۔ چند واقعات یہ ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث کو پوری "دادی عقیق" دیدی تھی لیکن وہ اس کا بڑا حصہ آباد نہ کر سکے تھے۔ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا کہ رسول اللہ نے آپ کو یہ زمین اس لئے نہ دی تھی کہ نہ خود آباد کریں اور نہ دوسروں کو آباد کرنے دیں لہذا اجتناباً زمین آپ آباد کر سکتے ہوں اپنے پاس رکھئے اور بقیہ خلافت کے حوالہ کر دیجئے۔

یہ سن کر حضرت بلالؓ نے کہا کہ میں رسول اللہ کی دی ہوئی زمین کبھی واپس نہ کروں گا خواہ میں اسے آباد کروں یا نہ کروں۔ حضرت عمرؓ نے واپسی پر اصرار کیا اور بالآخر آباد شدہ حصہ کو چھوڑ کر بقیہ زمین واپس لے لی۔ اس موقع پر قابلِ غور بات یہ ہے کہ بلال بن حارثؓ فرسوں کے قریب ترین صحابی تھے اور زمین کا عطیہ خود رسول اللہ نے عطا فرمایا تھا جس کی بنا پر اس عطیہ کے ساتھ خصوصی لگاؤ ہونا نظری بات تھی۔ مگر حضرت عمرؓ نے مفاد عامہ کے لئے بلالؓ جیسے جلیل القدر صحابی کا خیال کیا اور نہ اس جذبہ کا کہ رسول اللہ کا دیا ہوا عطیہ کس طرح واپس لیا جائے۔

اس واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حکومتِ الہی میں خلیفہ اللہ کے سامنے خلق اللہ کا عام مفاد ہوتا تھا۔ وہ اس کے لئے نہ اپنے بزرگ ساکھتوں کے ساتھ کسی قسم کا ترجیحی سلوک کرنے کے لئے تیار ہوتا تھا اور نہ محض جذباتی امور سے متاثر ہو کر عام مفاد کو نظر انداز کر سکتا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ جب رسول اللہ کا دیا ہوا عطیہ مفاد عامہ کے پیش نظر بلالؓ جیسے جلیل القدر صحابی سے واپس لیا جا سکتا ہے تو دیگر نا اہل لوگوں کے پاس سے بیکار زمین یا ان کی ضرورت سے زائد زمین واپس لینے میں کیسے غور و فکر کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ اور اس میں حقوقِ ملکیت کا "گورکھ دھندا" کیسے حائل بن سکتا ہے۔

(۲) رسول اللہ نے ایک اور شخص کو زمین دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے زمین کے آباد شدہ حصہ کو چھوڑ کر بقیہ زمین لے لی تھی۔

(۳) قوم بکبیلہ کا واقعہ ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ حضرت عمرؓ نے خالص

زمین کا کچھ حصہ انہیں دیدیا تھا، اور دو تین سال تک وہ اس کو آباد کرتے رہے تھے لیکن جب خلق خدا کے نفع کی اس سے عمدہ صورت سمجھ میں آئی تو خلافت نے بلائیں و پشیں وہ زمین ان لوگوں سے واپس لے لی تھی۔

(۴) حضرت عمرؓ اور عمر بن عبدالعزیزؓ کا عام قانون کے ماتحت مسلمانوں کو زمین کی جائیداد سے بیدخل کر ان کا وظیفہ مقرر کر دینا اس بات کی شہادت کے لئے کافی ہے کہ حکومت الہی میں قطاقع دینے کا سلسلہ عام مفاد کے پیش نظر ہوتا تھا جب تک یہ مقصد پورا ہوتا رہتا قطاقع باقی رکھے جاتے تھے ورنہ جس صورت کے اختیار کرنے میں نفع خلق زیادہ نظر آتا حتی الامکان ذاتی مفاد کو ملحوظ رکھ کر وہی صورت اختیار کرنے کی پوری گنجائش ہوتی تھی۔

اس نظریہ کی مزید وضاحت ان اصول سے ہوتی ہے جو قطاقع کے بارے میں ناقد تھے اور اس طرز عمل سے بھی ہوتی ہے جو خلفاء کا اس سلسلہ میں تھا۔

قطاقع کن لوگوں کو دیئے جاتے تھے | حکومت الہی میں انہی لوگوں کو قطاقع دیئے جاتے تھے جو کاشتکار ہوتے یا جن کے ذمہ مفاد عامہ کی کوئی خدمت سپرد ہوتی تھی جس کی بنا پر وہ خود کاشت نہ کر سکتے بلکہ دوسروں سے کاشت کر کے اس کے ذریعہ اپنی گذر بسر کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں علامہ مقرر زری اور قاضی ابویوسف یہ کلیہ بیان کرتے ہیں۔

قَدْ أَقْطَعُ رَسُولُ اللَّهِ وَتَأَلَّفَ عَلَى الرَّسُولِ أَقْوَامًا وَاقْطَعُ
الْمُخْلَفَاءُ مِنْ زُرَاؤِ أَنْ فِي اقْطَاعِهِ صَلَاحًا

پیغمبر اسلام اور آپ کے جانشینوں نے انہی لوگوں کو قطاقع دیئے تھے جن کے دینے میں ملک و ملت کی بھلائی ہوتی تھی اور قطاقع دینے میں اہلیت قلوب مقصود ہوتی تھی۔

علامہ بدرالدین عینی فرماتے ہیں: "خلیفہ کے قطاقع دینے کی شکل یہ ہے کہ اللہ کے مال سے وہ ان لوگوں کو عطا یا دے جن میں اس کی اہلیت و صلاحیت دیکھے۔"

زمانہ خلافت میں جن کو قطاقع دیئے جاتے تھے ان کی تفصیل یہ ہے:-

۱۔ جن میں آباد کاری اور کاشتکاری کی صلاحیت ہوتی تھی۔

۲۔ جن کے سپرد مفاد عامہ کی کوئی خدمت ہوتی تھی۔

۳۔ فوجی اور تمام وہ لوگ جو ملک و قوم کی حفاظت پر مامور ہوتے تھے۔

۴۔ نو مسلموں کو تالیفِ قلوب کے لئے قطاق دیئے جاتے تھے۔

یسا اذقات لوگ اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو نادار اور محتاج پاتے تھے اور ان کے پاس گزرو بسری کی کوئی شکل نہ رہ جاتی تھی۔ ایسی صورت میں خلافت انہیں قطاق دے کر کسبِ معاش کے قابل بناتی تھی۔ اس حُسنِ سلوک سے ایک طرف تو یہ ہوتا تھا کہ نو مسلموں کو اسلام قبول کرنے کے بعد معاشی پریشانیوں سے دوچار نہیں ہونا پڑتا تھا اور وہ مطمئن ہو کر خدمتِ خلق اور رحمتِ الہی کو عام کرنے میں اپنی توجہ خرچ کرتے تھے اور دوسری طرف یہ کہ غیر مسلم کو حُسنِ سلوک دیکھ کر سوچنے اور سمجھنے کا موقع ملتا تھا اور اسلام قبول کرنے کے لئے راہیں کھلتی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خلافت کے پیشِ نظر، قطاق کا مقصد اللہ کی مخلوق کے لئے زیادہ سے زیادہ پیداوار بڑھانا اور عام خوشحالی کی فضا پیدا کرنا ہوتا تھا اس لئے بالعموم انہی لوگوں کو قطاق دیئے جاتے جو زمین کو زیرِ کاشت لاکر پیداوار بڑھا سکتے تھے۔ اور اگر کوئی خدمت سپرد ہونے کی بنا پر خود کاشت نہ کر سکتے تو دوسروں کے ذریعہ کاشتِ برا کے اس مقصد کو پورا کرتے تھے۔ جیسا کہ قاضی ابویوسف نے فرمایا۔

وَلَوْ لَا ذَلِكَ لَمْ يَأْتُواكُمْ وَ لَمْ يُقَطِّعُوا حَقَّ مُسْلِمٍ وَلَا مَعَاهِدٍ

گر یہ مقصد نہ ہوتا تو رسول اللہ اور خلفاء کسی کو کسی مسلمان یا معاہد کا حق نہ دیتے (اس لحاظ سے کہ زمین میں سب شریک ہیں)۔

باقی رہی یہ بات کہ زمانہ خلافت میں ایک شخص کو زمین کی کتنی مقدار دی جاتی تھی اس سلسلہ میں تاریخِ خلافت کا مطالعہ کرنے سے پہلے بنیادی حیثیت سے چند باتیں لائقِ توجہ ہیں۔

۱۔ اس زمانہ میں بنجر اور آفادہ زمینیں بکثرت تھیں اور آباد کرنے والے کم تھے۔

۲۔ پیداوار آج کے مقابلہ میں کم تھی خصوصاً عرب کی زمینوں کی۔

۳۔ رسول اللہ اور ابوبکر رضی اللہ عنہما کے زمانہ خلافت تک فوجیوں اور دیگر کارپردازوں کی تنخواہیں متعز نہیں ہوتی تھیں۔

۴۔ حضرت عمرؓ نے رجسٹر مرتب کر کے تنخواہوں اور وظیفوں کا باقاعدہ انتظام کیا تھا۔

۵۔ تنخواہ اور وظیفہ مقرر نہ ہونے کی صورت میں ان لوگوں کے لئے جن کے ذمہ مفاد عامہ کی خدمت سپرد ہوتی تھی وہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ (۱) دیوٹی چھوڑ کر خود کاشت کے ذریعہ اپنی گذر بسر کرتے۔

(۲) یا زمین کاشتکاروں کے حوالہ کر کے پیداوار میں یا اس کی آمدنی میں دونوں شریک ہوتے اور اس طرح کاشتکار اور صاحب زمین دونوں حسب حیثیت مفاد عامہ کی خدمت کرتے رہتے۔

۶۔ تنخواہوں اور وظیفوں کے مقرر ہو جانے کے بعد حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کی زمین جائیداد کے بارے میں جو طرز عمل اختیار کیا تھا جس کی تفصیل ذرا آگے چل کر آتی ہے وہ قابل غور ہے۔ مزید وضاحت کے لئے چند واقعات یہ ہیں۔

(۱) صدیق اکبرؓ نے حضرت طلحہؓ کو قبیضہ دیا تھا اور اس پر چند لوگوں کو گواہ بنا کر حکمنامہ ان کے حوالہ کر دیا تھا، ان گواہوں میں حضرت عمرؓ کا نام بھی تھا۔ حضرت طلحہؓ حسب دستور حضرت عمرؓ کے پاس حکمنامہ پر دستخط کر کے لئے گئے تو انہوں نے یہ کہہ کر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

أَهَذَا كُلُّهُ لَكَ دُونَ النَّاسِ ؟

کیا یہ سب آپ ہی کو مل جائے اور دوسرے لوگ محروم رہیں۔

اس کے بعد حضرت طلحہؓ غصہ میں بھرے صدیق اکبرؓ کے پاس آئے اور کہا:

وَاللَّهِ مَا أَدْرِي أَنْتَ الْخَلِيفَةُ أَمْ عُمَرُ ؟

واللہ میں نہیں سمجھ سکا کہ کون خلیفہ ہے آپ ہیں یا عمر

حضرت صدیق اکبرؓ نے جواب میں کہا بَلْ عُمَرُ (بلکہ عمر ہیں)۔

الغرض حضرت عمرؓ کی مخالفت کی وجہ سے صدیق اکبرؓ کا حکم منسوخ کر دیا گیا تھا۔

(ب) حضرت عیینہؓ کو صدیق اکبرؓ نے قطعہ دیا تھا۔ جب وہ دستخط کرنے حضرت عمرؓ کے پاس گئے تو انہوں نے دستخط سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ لکھے ہوئے حکم کو مٹا دیا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر حضرت عیینہؓ حضرت صدیق

اکبرؓ کے پاس آئے اور دوسرا حکمنامہ لکھ کر دینے کی درخواست کی۔ صدیق اکبرؓ نے ان سے جواب میں فرمایا۔

وَاللّٰهُ لَا اَجِدُ شَيْئًا رَّدَاكَ عُرْوَةً

واللہ میں وہ کام دوبارہ نہ کروں گا جس کو عمر نے رد کیا ہو۔

یہ بات کہ حضرت عمر نے دستخط سے کیوں انکار کیا تھا جبکہ رسول اللہ اور ابو بکرؓ اور خود عمرؓ سے تطبیع دینا ثابت ہے اس کی وجہ حضرت عمر نے خود ہی ان الفاظ میں بیان کر دی تھی۔

اَهَذَا كُلُّهُ لَكَ دُونَ النَّاسِ ؟

کیا یہ سب آپ ہی کو مل جائے اور دوسرے محروم رہیں۔

اہلِ بائع یہ ہے کہ صدیق و فاروق دونوں کا ایک ہی مقصد تھا یعنی قطائع دے کر زمین کو زیر کاشت لانا تاکہ خلق اللہ کے لئے زیادہ سے زیادہ غذا پیدا ہو سکے مگر یہ بات ہر وقت دونوں کو ملحوظ رہتی تھی کہ زمین چند افراد کے ہاتھ میں پڑ کر ان کے عیش و آرام طلبی کا سامان نہ بن جائے یا انتظام نہ ہو سکے کی وجہ سے بیکار نہ پڑی رہے۔ اور حقوق عامہ جو زمین سے متعلق ہیں وہ پائمال ہوتے رہیں۔ اس لئے قطائع دینے میں یہ احتیاط ضروری تھی کہ صرف اپنی لوگوں کو دینے جائیں جو اس کے اہل تھے اور اس مقدار میں دینے جائیں جن کو زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنایا جاسکے۔

مذکورہ صورتوں میں حضرت عمرؓ نے جب دستخط سے انکار کیا تھا تو صدیق اکبرؓ کے سامنے یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ حضرت عمرؓ کے انکار کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ یہ زمین کسی حیثیت سے مفاد عامہ کے خلاف جاری ہے اور سلاں شخص کو تطبیع دینے میں کسی حد تک مقصد کی پائمالی ہو رہی ہے ورنہ حضرت عمرؓ کو انکار کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اس لئے حضرت ابو بکرؓ نے اپنے پہلے حکم کو منسوخ قرار دے کر دوسرا حکم نامہ لکھنے کی درخواست رد کر دی تھی۔ حکومت الہی میں نہ تو کسی فرد کو بیکار رہنے دیا جاتا تھا اور نہ دوسرے کی محنت سے ناجائز نامدہ اٹھا کر کسی کو عیش و عشرت کا موقع دیا جاتا تھا۔ اگر کسی فرد میں کاشتکاری کی اہلیت و صلاحیت دیکھی جاتی تو زمین اس کے حوالہ کر کے اسے خلق اللہ کی خدمت پر مامور کر دیا جاتا تھا اور اگر وہ شخص دیگر مفاد عامہ کے کاموں کے لئے موزوں ہوتا تو اس مقدار میں تطبیع دینے ہاتے تھے کہ وہ دوسروں کے ذریعہ کاشت کر کے اپنی گذر بسر کے لائق آمدنی یا پیداوار حاصل کر سکے تاکہ اس کو دیگر کام اطمینان کے ساتھ انجام دینے میں سہولت ہو۔ ایسی صورت میں کاشتکار اپنی صلاحیت

کے مطابق خدمتِ خلق کرتا تھا اور صاحبِ زمین اپنی صلاحیت کے مطابق اس فرض کو انجام دیتا تھا۔ نہ کوئی شخص بیکار رہنے پاتا تھا اور نہ کسی کو اس کی صلاحیت اور طبیعت کے خلاف ڈیوٹی سپرد کی جاتی تھی۔ اس سے ایک طرف تو یہ ہوتا تھا کہ ہر شخص مفادِ عامہ کے کاموں میں لگا رہتا تھا اور سب کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام پاتے رہتے تھے اور دوسری طرف یہ کہ ہر شخص اپنی نمبر کی آزادی اور صلاحیت کے لحاظ سے اپنی اپنی لائن میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرتا تھا۔ نہ کسی کے ذہنی طور پر خود کشی کا سوال پیدا ہوتا تھا اور نہ کسی کو مزاج اور طبیعت کے خلاف محض سرمایہ اور پوتہ کی خاطر کسی کام کے کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ غرض زمانہ خلافت میں جماعتِ جماعتی حیثیت سے خوش تھی اور شرفِ اپنی انفرادی حیثیت سے حوس تھا۔ نہ فرد کو جماعت سے شکایت تھی اور نہ جماعت کو فرد پر اعتراض تھا۔

قطائع کے بارے میں اسی پوزیشن کو واضح کرنے کے لئے علامہ بدر الدین عینی نے فرمایا۔
يَجُوزُ لِلْجُنْدِيِّ الَّذِي يَنْطَعُ لَهُ أَنْ يُعْجِرَ مَا أُقْطِعَ لَهُ
 شکر اور فوجی کے لئے اپنے قطائع کو ایہ پر دینا جائز ہے۔

اور شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں

وَأَوْ يُقْطِعُ إِلاَّ وَتَدَارَ مَا يَتَأْتِي الْعَمَلُ عَلَيْهِ

اسی مفاد کا قطعہ دیا جائے تب پراس کا کام کرنا آسان ہو۔

پھر کہتے ہیں۔

امام را باید که اقطاع کنند بقدر حاجت

خليفة کو بہت ضرورت قطعہ دینا چاہیے۔

ان نصریجات سے دو باتیں واضح ہوئیں (۱) پہلی تو یہ کہ حاجت و ضرورت سے زائد کسی کو قطعہ نہ دیا جائے (۲) دوسری یہ کہ بوقتِ ضرورت و مصروفیت اپنے قطعہ کو کرایہ وغیرہ پر دیا جاسکتا ہے۔

زمانہ خلافت کے دیئے ہوئے قطائع سرکاری قانون اور ٹیکس کے مستثنیٰ
قطائع پر خلافت کے اختیارات۔ ہوتے تھے بلکہ بہ نسبت دیگر اراضی کے خلافت کے اختیارات قطائع

میں زیادہ وسیع ہوتے تھے۔ کیونکہ خلافت کا براہِ راست تعلق "خالصہ زمینوں سے ہوتا تھا اور قطائع بالعموم اپنی زمینوں سے دیئے جاتے تھے۔ اس لئے ان کے نظام تنظیم و تقسیم میں خلافت کی ذمہ داری زیادہ رہتی تھی۔ جب اس میں خلافت کی ذمہ داری زیادہ ہوتی تھی تو اس کے اختیارات کا وسیع ہونا ایک فطری امر تھا تاکہ دونوں

جانب توازن قائم رہ سکے۔ جیسا کہ امام ابو یوسف اختیارات کی وسعت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
 ”قطاع اگر عشری زمین سے دیئے گئے ہیں تو عشر واجب ہوگا اور خراجی زمین سے دیئے گئے ہیں
 تو خراج واجب ہوگا۔“

پھر آگے چل کر اسی حقیقت کو ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں۔

جس کسی کو خراجی زمین سے قطاع دیئے جائیں تو ٹیکس کے بارے میں خلیفہ کو اختیار ہے کہ پیداوار کا
 دسواں، پندرھواں، بیسواں حصہ یا اس سے بھی زیادہ یا خراج بہر حال جو مناسب سمجھے وہ ٹیکس
 مقرر کر دے۔“

پھر کہتے ہیں۔

وَأَرْجُوا أَنْ يَكُونَنَّ ذَلِكَ مُرْسَعًا عَلَيْهِ فِكَيْفَ فَا شَاءَ مِنْ ذَلِكَ فَعَلَّهِ

مجھے امید ہے کہ اس بارہ میں خلافت جو بھی مناسب سمجھ کر کرے گی اس کے لئے وسعت اور گنجائش ہے۔

یہی امام ہارون الرشید کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وَأَعْمَلُ بِمَا تَرَى أَنْتَهُ أَصْلَحُ لِلْمُسْلِمِينَ وَ أَعْمَرُ نَفْعًا لِخَاصَّتِهِمْ وَ عَامَّتِهِمْ

وَأَسْأَلُكَ فِي دِينِكَ

مفاد عامہ کے پیش نظر جس میں مسلمانوں کی اور تمام لوگوں کی فلاح و بہبودی ہو آپ کو اس میں بالکل

اختیار ہے اور دین و ملت کے لحاظ سے بھی وہی زیادہ محافظ ہے۔

حاصل یہ کہ حکومت الہی میں زمین کی جائیداد نہ ذاتی و تار اور اقتدار بڑھانے کے لئے ہوتی تھی اور نہ کاشتکاروں
 کی محنت سے فائدہ اٹھا کر مفت خوروں کا طبقہ پیدا کرنے کے لئے بلکہ یہ ساری چیزیں پیداوار حاصل کر کے
 مفاد عامہ کی راہوں میں صرف کرنے کے لئے اور خلق خدا کی خدمت کے لئے ہوتی تھیں اسی لئے قانون اور
 کے معاملات میں خلافت کے اختیارات وسیع ہوتے تھے۔

جس طرح خلق اللہ کی ضروریات ہتیا کرنا خلافت کا فرض تھا اور جانوروں تک کا انتظام اس کی ذمہ داری
 میں داخل تھا اسی طرح قدرت کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں خلافت کے اختیارات کی وسعت اس کا حق تھا تاکہ آزاد

کے ساتھ حقیقی معنوں میں وہ نیا بت کے فرائض انجام دے سکے۔

مذکورہ بالا تصریحات کے پیش نظر یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ موجودہ زمینداری و جاگیرداری کی شکل زمانہ خلافت کے قطناع سے بالکل مختلف ہے کیونکہ اس نظام میں جاگیرداروں کا ایک وسیع حصہ زمین کا مالک ہو کر کاشتکاروں اور مزدوروں سے کام لیتا ہے اور بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے ان کے منافع سے غیش و آرام کرتا ہے۔

اس سے ایک طرف تو راحت طلبوں اور مفت خوروں کا طبقہ پیدا ہوتا ہے جو دوسروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر سوسائٹی کے لئے بار بنتا ہے اور دوسری طرف کاشتکاروں کو ان کی محنت کا پورا حق نہیں ملتا جس کی بنا پر انہیں رات دن کی محنت کے باوجود فراغت کے ساتھ رونی بیستر نہیں آتی۔

قطناع سے اس قسم کی تنظیم کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں نکل سکتی، بلکہ اسلام ایسے نظام کو سختی کے ساتھ ختم کرنا چاہتا ہے اور زمانہ خلافت کی متعدد مثالیں اوپر گزر چکی ہیں جن سے اسی حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔

یہ حقیقت اس بات سے اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ حکومت الہی کی طے شدہ اور مقرر کردہ پالیسی یہ ہے کہ زمین اور جائیداد ذاتی وقت اور اقتدار بڑھانے کے لئے نہ ابتداءً کسی کو دی جاسکتی ہے اور نہ بعد میں کسی کے پاس باقی رکھی جاسکتی ہے، یہ صرف مفادِ عامہ کے پیش نظر لوگوں کو دی جاتی ہے اور اس کو سامنے رکھ کر ان سے واپس لے لی جاتی ہے۔ حکومت الہی میں اصل چیز مفادِ خلق ہے۔ جب تک یہ حاصل ہوتا رہتا ہے خلافت کو اس میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی لیکن جب یہ فوت ہونے لگتا ہے تو خلافت اس وقت ہر تصرف کی مجاز ہوتی ہے۔ چنانچہ زمانہ خلافت میں قوم بچیلہ سے قطناع کا واپس لے لینا جس کی تفصیل آگے چل کر آتی ہے، اور بلال بن عمارت منزی کے قبضے سے غیر آباد اراضی کا نکال لینا اور اس قسم کے جتنے واقعات اوپر مذکور ہو چکے وہ سب اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

ت اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔

لَنَا رِقَابُ الْأَرْضِ

قطناع پر خلافت کے اختیار

زمینیں دراصل ہماری (خلافت کی) ہیں۔

اور حضرت علیؑ نے ایک شخص سے اس کے اسلام قبول کرنے کے بعد فرمایا تھا۔

إِنَّ أَرْضَكَ فَتْحِي لَنَا

بیشک تیری زمین ہماری (خلافت کی) ہے

اسی حقیقت کو حافظ ابو بکر جصاصؒ یوں ادا کرتے ہیں۔

برودہ زمین جس کی آباد کاری سے لوگ عاجز ہیں اور حقوق عامہ جو زمین سے متعلق ہیں وہ پائمال

ہونے لگیں تو اس کے انتظام کے بارے میں خلافت کو پورا اختیار ہے۔

قاضی ابو یوسفؒ فرماتے ہیں۔

وَلَا يُخْرِجُ مِنْ يَدِكَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا إِلَّا بِحَقِّ يَجِبُ لَهُ عَلَيْهِ فَيَأْخُذُ
بِذَلِكَ الَّذِي وَجَبَ لَهُ

ابن قطائع کو خلافت (بلاد جمع) میں داخل نہ کرے البتہ اگر حقوق واجبہ کی ادائیگی نہ ہو رہی ہو تو اسکو

میں داخل کرنے کا پورا اختیار ہے۔

قاضی صاحب کا یہ جملہ "إِلَّا بِحَقِّ يَجِبُ لَهُ عَلَيْهِ" نہایت قابل غور ہے اور اپنے عموم فہم کی بنا پر

حقوق عامہ کے ہر جائز حق اور خلیفہ کے ہر جائز تصرف کو شامل ہے۔ اسی سلسلہ میں امام ابو حنیفہؒ

کی یہ تصریح ہے۔

إِنَّ نَوَاحِي دَارِ الْإِسْلَامِ تَحْتَ يَدِ إِمَامِ الْمُسْلِمِينَ

دارالاسلام کے جملہ حصے خلیفۃ المسلمین کے زیر اقتدار ہوتے ہیں۔

اور امام مالکؒ کا یہ ارشاد ہے۔

تُصَيِّرُ الْأَرْضَ لِلسُّلْطَانِ

زمینیں دراصل بادشاہ (حکومت) کی ہوتی ہیں۔

ایک موقع پر علامہ عینیؒ کہتے ہیں۔

إِنَّ حُكْمَ الْأَرْضِ إِلَى الْأَمَامِ

دراصل زمین کا معاملہ خلیفہ (خلافت) کے سپرد ہے۔

چونکہ اراضی کے معاملہ میں خلافت کے اختیارات وسیع ہوتے ہیں اس لئے خلیفہ کو مفاد عامہ کے پیش نظر موقوفہ اراضی میں بھی واقف کی مقرر کردہ شرطوں کی مخالفت جائز سمجھی جاتی ہے۔ آراضی موقوفہ کی بحث میں فقہانے تصریح کی ہے۔

إِنَّ السُّلْطَانَ يَجُوزُ لَهُ مُخَالَفَةُ الشَّرْطِ إِذَا كَانَ غَالِبُ جِهَاتِ
الْوَقْفِ قُرْبَى وَ مَزَارِعٌ فَيُعْمَلُ بِأَمْرِهِ وَإِنْ غَايَرَ شَرْطَ الْوَأَقِفِ
لِأَنَّ أَصْلَهَا لِبَيْتِ الْمَالِ

جب واقف کی اکثر جہات گاؤں اور مزرعوں زمینیں ہوں تو خلافت اپنے صوابدید کے مطابق انتظام کرے اگرچہ واقف کی شرطوں کی مخالفت پائی جاتی ہو کیونکہ گاؤں اور زمینیں اصل بیت المال (خلافت) کی ہوتی ہیں۔

اس بات یہ ہے کہ حکومت الہی میں زمین اور جاہیداد پر کسی کے قبضہ ہونے کا صرف یہ مطلب ہے کہ قابض کو بحیثیت 'امین' اس کے استعمال کا حق حاصل ہو۔ یہ امانت اس کے قبضہ میں یا یہ حق استعمال اس کے پاس اسی وقت تک باقی رکھا جاتا ہے جب تک خلق اللہ کے مفاد میں وہ خلافت کا ہاتھ بٹاسکے اور اسی نفع پیدا کرنے میں مددگار بنے جو مخلوق کی خوش حالی اور ترقی کی ضامن ہو لیکن جب اس کی خلافت درزی ہونے لگے یا امانت میں خیانت کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو خلافت کو بلا پس و پیش زمین سے بیدخل کر دینے یا جو بہتر صورت اس کی سمجھ میں آئے اس پر عمل کرنے کا پورا اختیار ہے۔

خلافت کے اس اقدام میں نہ حقوق ملکیت کا گورکھ دھندا حائل ہوتا ہے اور نہ محض جذباتی چیزیں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔

چونکہ خلافت کے بہر تصرف اور ہر فیصلہ میں ہر شخص کے ذاتی مفاد کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے اس لئے اس قسم کے تمام مواقع میں وہ ذاتی و انفرادی مفاد کا پورا پورا لحاظ رکھتی ہے البتہ انفرادی اور اجتماعی

مفاہات کے ٹکراؤ کی شکل میں وہ اجتماعی مفاد کو ترجیح دیتی ہے

در اصل اسی انفرادی حق کے ماتحت زمانہ خلافت میں بعض ایسی شکلیں ملتی ہیں جن میں صاحب زمین کو ان کی زمین لے لینے کے بعد کچھ رقم ادا کی گئی تھی تاکہ اس شخص کے ذاتی حقوق پائمال نہ ہونے پائیں۔ کبھی تو اسکی شکل معاوضہ کی ہوتی تھی جیسے کہ حضرت عمرؓ نے وادی القریٰ کے باشندوں کو منتقل کرنا چاہا تو ان کی اراضی اور نخلستان کی ایک ایک پائی قیمت لگا کر جو نو سے ہزار کے قریب ہوتی تھی ان کے حوالہ کیا تھا۔ اور جس طرح بخران کے باشندوں کو جب سیاسی مصلحت کی بنا پر منتقل کیا گیا تو زمین کے عوض زمین دی گئی اور فدک کے لوگوں کو منتقلی کے وقت زمین کی قیمت ادا کی گئی تھی اور جس طرح مدینہ کے یہودیوں کو نئے منتقل کرنے سے پیشتر اپنی زمینیں فروخت کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور کبھی حکومت کی جانب سے دی ہوئی رقم کی حیثیت معاوضہ کی نہ ہوتی تھی بلکہ بطور امداد ہو کرتی تھی۔ جس طرح حضرت عمرؓ نے قوم بھیلہ کے ابن جریر اور ایک عورت ام کرز کو اتنی اتنی دینار کے قریب دیا تھا اس کی حیثیت امداد کی تھی نہ کہ معاوضہ کی جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

جس جگہ کے باشندے اسلامی رحمت قبول کر کے مسلمان ہو جاتے تھے ان کی زمین کی تنظیم و تنظیم **اراضی مسلم** کے بارے میں عام قانون یہی تھا کہ وہ بھی مفتوحین کی زمینوں کی طرح اللہ کی ملک قرار دیا جاتی تھیں اور خلافت کے انتظام و نگرانی میں اپنی کے پاس رہنے دی جاتی تھیں اور سرکاری ٹیکس کے علاوہ ان کو کچھ وصول نہ کیا جاتا تھا۔

عام قانون رسول اللہؐ کی زبان میں یہ تھا۔

إِنَّ الْقَوْمَ إِذَا أَسْلَمُوا أَحْرَزُوا دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ

جب کوئی قوم اسلام قبول کرے تو وہ اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کر لیتی ہے۔

یہ قانون عرب عجم کی تمام زمینوں کے لئے یکساں تھا اور اس میں منقولہ و غیر منقولہ جائیدادیں سب شریک تھیں۔

قاضی ابویوسف صاحب ہی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

فَإِنَّ دِمَاءَهُمْ حَرَامٌ وَمَا أَسْلَمُوا عَلَيْهِ مِنْ أَمْوَالِهِمْ وَكَذَلِكَ أَرْضُهَا
 هُمْ لَهُمْ وَحِيَ أَرْضُ عَشْرٍ بِمَنْزِلَةِ حَيْثُ أَسْلَمَ أَهْلُهَا مَعَ
 رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَتْ أَرْضُهُمْ أَرْضُ عَشْرٍ
 وَكَذَلِكَ الطَّائِفُ وَالْبَجْرَانُ وَكَذَلِكَ أَهْلُ الْبَادِيَةِ إِذَا أَسْلَمُوا
 عَلَى مِيَاهِهِمْ وَبِلَادِهِمْ فَلَهُمْ مَا أَسْلَمُوا عَلَيْهِ وَهُوَ فِي أَيْدِيهِمْ
 وَلَيْسَ لِأَحَدٍ مِنْ أَهْلِ الْقَبَائِلِ أَنْ يَتَبَنَّى فِي ذَلِكَ شَيْئًا لِيَسْتَعِينُ بِهِ
 مِنْهُ شَيْئًا وَلَا يَحْفَرُ فِيهِ بَيْرًا لِيَسْتَعِينُ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَسْتَعِينُ
 الْكَلَاءُ وَلَا يَمْنَعُوا الرِّعَاءَ وَلَا الْمَوَاشِيَ مِنَ الْمَاءِ وَلَا حَافِرًا
 وَلَا خَفَا فِي تِلْكَ الْبِلَدَةِ وَ أَرْضُهُمْ أَرْضُ عَشْرٍ لَا يُخْرِجُونَ
 حَنَاهَا فِيمَا بَعْدُ وَ يَتَوَاسَرُ ثَوْبُهَا وَ يَتَبَايَعُونَ نَهَاهَا

جس زمین کے باشندے اسلام قبول کر لیں ان کا خون حرام ہے۔ قبول اسلام کے وقت جو مال ان کے پاس ہو گا وہ انہی کا رہے گا ایسے ہی زمینیں بھی انہی کی رہیں گی اور اس قسم کی زمینیں مشرعی ہوں گی جس طرح مدینہ کے باشندوں نے اسلام قبول کیا تو یہ ساری چیزیں انہی کے پاس رہنے دی گئی تھیں اور جس طرح طائف اور بجرین کے لوگوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا گیا تھا اسی طرح بدویوں میں سے جن جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا وہ اپنے اپنے چشموں اور اپنے اپنے علاقوں پر باقی رکھے گئے تھے قبیلہ والوں میں سے کسی کے لئے جائز نہ تھا کہ وہ ان کی چیزوں میں کوئی ایسا تصرف کریں جس کی بنا پر اس کے وہ مستحق بن جائیں اور نہ اس میں کسی ربا اجازت، کمواں کھودنا جائز تھا کہ جس کی وجہ سے کچھ حصہ کے وہ مستحق ہو جائیں۔ البتہ انہیں گھاس سے کسی کو روکنا جائز نہیں ایسے ہی چرواہوں اور مویشیوں کو پانی سے روکنا جائز نہیں اور جانوروں اور اونٹوں کو اس علاقہ میں داخل ہونے سے روکنا جائز نہیں ہے۔ انکی

زمینیں عشری ہوں گی بعد میں بھی ان سے نکالی نہ جائیں گی۔ ان میں وراثت جاری ہوگی اور وہ ان کی خرید و فروخت کر سکیں گے۔

یہی قاضی صاحب پھر آگے چل کر لکھتے ہیں۔

وَ كَذَلِكَ بَلَّغْنَا آسْلَمَ عَلَيْهَا أَهْلَهَا فَهِيَ لَهُمْ وَ مَا فِيهَا لَهُ
ایسے ہی جس شہر و علاقہ کے لوگ اسلام قبول کر لیں تو ان کی زمین اور ساری چیزیں (حسب سابقہ)
انہی کی رہیں گی۔

امام ابو عبیدہ کہتے ہیں۔

جس زمین کے باشندے اسلام قبول کر لیں وہ زمین انہی کی ملک رہے گی اور عشر کے علاوہ
کچھ نہ دینا پڑے گا۔

پھر آگے چل کر کہتے ہیں۔

كُلُّ أَرْضٍ آسْلَمَ عَلَيْهَا أَهْلُهَا فَهِيَ مَا لِكُلِّ لِرِقَابِهَا كَامِلِدِ يَنْتَهٍ وَ
الطَّائِفِ وَ الْيَمِينِ وَ الْبَحْرَيْنِ يَه

جس زمین کے باشندے اسلام قبول کر لیں وہ اپنی زمین کے مالک ہوں گے (ضبط نہیں کی جائیگی
اور انہیں ارتفاع اور استعمال کا حق رہے گا) جیسے مدینہ، طائف، یمن، بحرین وغیرہ میں یہی
کیا گیا تھا۔

الغرض زمانہ خلافت میں مسلمانوں کی زمین جا سید اور کا یہی انتظام تھا خواہ وہ غلبہ سے فتح کئے ہوئے
مالک کے باشندے ہوتے یا وہ لوگ ہوتے جن سے پہلے مصالحت ہو گئی ہوتی اور بعد میں اسلام کی حیثیت
و صداقت واضح ہونے کے بعد اسلام قبول کر لیا ہوتا۔ لیکن اس کے علاوہ اراضی مسلم کے بارے میں ایک اور
بات خاص توجہ کے لائق ہے وہ یہ کہ دراصل اسلام کا مقصد ایک ایسی صالح جماعت بنانا ہے جس کا نصب العین
اگلا قدم دوسروں کے لئے رحمت کا ماحول پیدا کرنا ہوتا ہے خواہ اس کی خاطر اسے جان و مال قربان

نہ جیسا کہ ذرا آگے چل کر واضح ہو جائے گا یہ طریق کار ابتدائی مصالح کے پیش نظر اختیار کیا گیا تھا۔ ورنہ خلافت کو حق حاصل
تھا کہ وہ اراضیات میں جس طرح کا جی چاہے تصرف کرے کیونکہ اراضی کسی کی ملکیت نہیں ہوتی تھی بلکہ اخراج جس ۱۶۱۶۱۶ الاموال
صفحہ ۱۳۵ ۱۳۵ ایضاً۔

کڑا ہی کیوں نہ پڑے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ان کے دلوں سے ذاتی منفعت اور عیش و عشرت کا بُت نکال کر تریانی کا جذبہ نہ پیدا کیا جائے۔ عام طور سے تو یہ ہوتا ہے کہ بااقتدار جماعت میں جب کوئی فرد داخل ہو جاتا ہے تو اسے ہر قسم کی جائز ذنا جائز رعایتیں دی جاتی ہیں اس کی زیادتیوں پر پُر ڈالا جاتا ہے اور اس کو اتنی زیادہ چھوٹ ملتی ہے کہ وہ دوسروں کی حق تلفی کر کے خود عیش کر سکے۔ لیکن اسلامی جماعت میں داخل ہونے سے اللہ کے لئے ہر چیز وقف کر دینے کا عہد لیا جاتا ہے اور اپنے کو فنا کر کے دوسرے کی بقا کا سامان فراہم کرنے کا مطالبہ ہوتا ہے، اسی لئے مسلم کی زمین و جائیداد میں منہ لادنا اپنے اختیارات بہ نسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ استعمال کرتی ہے۔ کبھی ترغیب و ترہیب کے ذریعہ اور کبھی قانون کے ذریعہ جیسا کہ تاریخ اسلام میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ مسلم باشندے اپنی جائیدادیں عام مفاد خلق کے لئے خلافت کے حوالے کر دیتے تھے یا خلافت بوقت ضرورت ان سے لے لیتی تھی۔ چند مثالیں یہ ہیں۔

(۱) انبصار اسلام میں مدینہ کے مسلم باشندوں نے اپنی زمینیں اپنی مدینہ کے لوگوں نے برضار و رغبت اپنی زمینیں خلافت کے حوالہ کر دی تھیں۔

اسی واقعہ کے متعلق ابن عباسؓ کہتے ہیں۔

إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ كَمَا قَدِمَ الْمَدِينَةَ جَعَلُوا لَهُ كُلَّ أَرْضٍ لَا يَبْلُغُهَا
الْمَاءُ يَصْنَعُ بِهَا مَا يَشَاءُ لَهُ

رسول اللہؐ جب مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ نے ہر ایسی زمین آپ کے حوالہ کر دی جس میں پانی کا پہنچنا دشوار تھا اور آپ کو اختیار دیدیا کہ آپ جو چاہیں کریں۔

زمین ملنے کے بعد آپ نے اس کو زیادہ سے زیادہ مغید اور کار آمد بنانے کی کوشش کی اور ابو عبیدہؓ کی رائے کے مطابق آپ نے بلال بن حارثؓ کو اسی زمین سے "قطیعہ" عطا فرمایا۔

(۲) خالصہ زمین کا کچھ حصہ حضرت عمرؓ نے قوم بھیلہ کی زمینیں خلافت کے حوالے کر دی تھیں۔

قوم بھیلہ کو دیدیا تھا۔ دو تین سال تک ان لوگوں نے

اس زمین کو اپنے قبضہ میں رکھا، لیکن جب خلافت نے مفاد عامہ کے پیش نظر واپس لینا چاہا تو واپس و پیش ان لوگوں کو خلافت کے حوالہ کرنا پڑا۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

قیس بن حازم کہتے ہیں جنگ قادسیہ رجو ایرانیوں سے ہوئی تھی، کے دن اسلامی فوج میں قوم بھیلہ کے لوگ چوتھائی تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو سواد کا چوتھائی حصہ دیدیا تھا۔ دو یا تین سال تک یہ زمین ان کے قبضہ میں رہی۔ ایک مرتبہ کسی ضرورت سے اسی قبیلہ کے چند افراد عمار بن یاسر اور جریر وغیرہ حضرت عمرؓ کے پاس تشریف لائے تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ لوگ اس زمین کو عام مفاد خلق کے لئے خلافت کے حوالہ کر دیجئے۔ اس پر ان لوگوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور زمین خلافت کے حوالہ کر دی، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے سرکاری خزانہ سے جریر کو اتنی دینار عطا فرمائے۔

جب اس واقعہ کی خبر قوم بھیلہ کی ایک عورت "ام کرز" کو ہوئی تو اس نے اپنے حصہ کی زمین واپس کرنے میں پس و پیش کیا اور حضرت عمرؓ کے پاس آکر عرض کیا کہ

يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِنَّ اَبِيْ هَلَكٌ وَ سَهْمُهُ ثَابِتٌ فِي السَّوَادِ وَ لَاقِيٌ
لَمْ اُسْلِمْ، فَقَالَ لَهَا يَا اُمُّ كَرْزٍ اِنَّ تَوْمَكَ قَدْ صَنَعُوا مَا قَدْ
عَلِمْتَ فَقَالَتْ اِنْ كَانُوْا قَدْ صَنَعُوْا مَا صَنَعُوْا فَاِنِّيْ لَسْتُ اُسْلِمُ
حَتّٰى تَحْبِلْنِيْ عَلٰى نَاقَةٍ ذَلُوْلٍ عَلَيْهَا قَطِيْفَةٌ حَمْرَاءَ وَ مَلَاكُفِيٍّ
ذَهَبًا قَلِيْلًا فَعَمِلَ عُمَرُ ذٰلِكَ فَكَانَتْ الدُّنْيَا رُخْوًا مِنْ ثَمَانِيْنَ
دِيْنَارًا

اے امیر المؤمنین میرے والد کی وفات ہو گئی ہے۔ سواد کی زمین میں اس کا بھی حصہ تھا (جو ترکہ میں مجھے ملا ہے) میں اس کو کبھی واپس نہ کروں گی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اے ام کرز تیری قوم نے بلا چون و چرا واپس کر دیا ہے اور تجھے اس کا اچھی طرح علم ہے، اس نے جواب دیا قوم نے جو کچھ کیا ہے مجھے اس سے سروکار نہیں ہے میں تو اس وقت تک واپس نہ کروں گی جب تک کہ آپ مجھے ایک فرمانبردارا دہنی نہ دیں جس پر سرخ رنگ کی گرم چادر پڑی ہو اور

زرع مال سے میرا ہاتھ نہ بھروں۔ حضرت عمرؓ نے آخرا یہاں ہی کیا۔ اور نقدی جو آپ نے اس کو دی تھی اس کی تعداد تقریباً آٹھ دینار کو پہنچ گئی تھی۔

اس واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خلافت جب چاہے مفاد عامہ کے پیش نظر مسلم باشندوں کو بیدخل کر کے ان کی زمینیں لے سکتی ہے اسی طرح یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ ایسی صورت میں ہر شخص کے ذاتی مفاد کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ اجتماعی مفاد کے ساتھ ذاتی حقوق کی پامالی نہ لازم آئے۔

لیکن اس واقعہ سے یہ بات لازمی طور سے نہیں ثابت ہوتی کہ خلافت کی جانب سے صاحب زمین کو جو کچھ دیا جائے اس کی حیثیت معاوضہ کی ہو یا حضرت عمرؓ نے جو کچھ جریر اور ام کرز کو دیا تھا اس کی حیثیت معاوضہ کی تھی جس کی بنا پر یہ کہا جائے کہ جب مفاد عامہ کے پیش نظر ایسی صورت پیش آجائے تو خلافت کو بلاوضہ زمین لینے کا اختیار نہیں ہے اسی طرح یہ حقیقت بھی نمایاں نہیں ہوتی ہے کہ خلافت کی جانب سے اس قسم کے جو کچھ تصرفات کئے جائیں ان میں صاحب زمین کی رضامندی ضروری ہے۔ جیسا کہ ذیل کی تصریحات اس پر روشنی ڈالتی ہیں۔

ابو عبیدہؓ کہتے ہیں۔

جو لوگ مفسدہ زمین کو اصل باشندوں کے پاس رہنے دینے میں فوجیوں کی رضامندی ضروری سمجھتے ہیں (امام شافعیؒ کا یہی خیال ہے) یہ واقعات کے لئے کیسے دلیل بن سکتا ہے جبکہ اسی جیسے واقعے عراق و شام کی فتح میں اصل باشندوں کے پاس زمین رہنے دینے جلنے کے بارے میں حضرت بلالؓ وغیرہ نے جب حضرت عمرؓ کی مخالفت کی تھی اور زمین کو فوجیوں پر تقسیم کرنے پر اصرار کیا تھا تو آپ نے ان سب کے متعلق فرمایا: **اللَّهُمَّ اكْفِنَهُمْ رَأْسَ امَّةٍ تَوْحِي** ان کے لئے کافی ہے، اس وقت کون سی ان لوگوں کی رضامندی مطلوب تھی جس کی بنا پر یہ کہا جائے کہ یہاں بھی حضرت عمرؓ ام کرز کو راضی کرنا چاہتے تھے اور بغیر رضامندی کے نہیں بیدخل کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

ابو بکر جصاص قوم بجیلیہ کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

اس واقعہ میں ان کی رضامندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے کیونکہ حضرت عمرؓ نے یہ بات صاف طور پر کہہ دی تھی کہ زمین کو واپس کئے بغیر چارہ نہیں ہے اور اس میں لوگوں کی کھلائی ہے۔ باقی رہا ام کر ز عورت کا معاملہ تو اس کو حضرت عمرؓ نے سرکاری خزانہ سے (بطور امداد) رقم دی تھی۔ ویسے بھی خلیفہ کو اختیار تھا کہ عورت کے قبضہ کی زمین واپس لئے بغیر سرکاری خزانہ سے اس کو عطیہ دیتے۔

بہر حال مفاد عامہ کے پیش نظر خلافت جب صاحب زمین کو بے دخل کرنا چاہے تو نہ اس کی رضامندی ضروری ہے اور نہ اس کا معاوضہ ادا کرنا لازمی ہے البتہ اس شخص کے ذاتی حقوق کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کہیں اس تصرف کی وجہ سے وہ پائمال نہ ہو جائیں۔

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں مسلمانوں کو زمین و جائیداد رکھنے اور کاشتکاری کرنے سے قانوناً منع کر دیا تھا اور یہ اعلان کر دیا تھا کہ جب سب لوگوں کے اہل و عیال تک کے وظیفے سرکاری خزانہ سے دیئے جاتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ یہ لوگ انسانیت کی خدمت کے لئے وقف نہ ہوں اور بیلوں کی دم کے پیچھے لگے رہیں۔

علامہ طنطاوی جوہری اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

فَلَمَّا كَثُرَتِ الْأَمْوَالُ فِي أَيَّامِ عُمَرَ وَ دَخَلَ الدِّيُونَ فَرَضَ الرَّفَاقَ
لِلْعَمَالِ وَالْقَضَاةِ وَ مَنَعَ الدِّنْحَارَ الْمَالَ وَ حَرَّمَ عَلَى الْمُسْلِمِينَ
اِقْتِنَاءَ الصِّيَاعِ وَ الزَّرَاعَةِ وَ الْمَزَارَعَةَ
لِأَنَّ أَرْزَاقَهُمْ وَ أَرْزَاقَ عِيَالِهِمْ تُدْفَعُ لَهُمْ مِنْ بَيْتِ
الْمَالِ

حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں جب مال بہت بڑھ گیا تو باقاعدہ رجسٹر مرتب کئے گئے۔ لوگوں کے وظیفے مقرر ہوئے عالموں اور قاضیوں کی تنخواہیں مقرر ہوئیں، سرمایہ جمع کرنے سے روک دیا گیا

کاشتکاری خود کرنے یا دوسروں سے کرانے دونوں کی ممانعت کر دی گئی۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا تھا کہ لوگوں کے مع ان کے بال بچوں تک کے وظیفے بیت المال سے مقرر کر دیئے گئے تھے۔

ایک اہم قانون غیر مسلم اسلام قبول کر لیتا تو اس کی تمام جائیداد غیر منقولہ ضبط کر کے بستی کے غیر مسلموں میں تقسیم کر دی جاتی اور اس نو مسلم کا سرکاری خزانہ سے وظیفہ مقرر کر دیا جاتا تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو فاروق اعظم کے اس فیصلہ میں حکومت الہی کے خلیفہ کی انجام دہی اور مسلم جماعت کی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔

در اصل اس ممانعت کے قانون سے خلیفہ کے پیش نظر یہ بات کھٹی کہ اگر یہ لوگ (مسلمان) زمین جائیداد اور مال جمع کرنے کے چھپے پڑ گئے تو ظلم و فساد کے دروازے کھل جائیں گے اور خدمت خلق کے بجائے رجو ان کا مقصد زندگی ہے، دیگر حاکموں کی طرح ان کو بھی دوسروں کے خون چوسنے کا موقع مل جائے گا۔ اس کے علاوہ عیش و عشرت میں پھنس کر یہ لوگ اپنے اعلیٰ جوہر جو انحرافی بہادری، جفاکشی، بہمت، عزم وغیرہ کھو بیٹھیں گے جس کا نتیجہ بعد میں یہ ظاہر ہو گا کہ جو جماعت محض خدمت خلق اور رحمت الہی کو عام کرنے کے لئے زندہ ہے پھر اسے زندہ رہنے کا حق باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ بعد کے مسلمان جب مال و دولت اور جائیدادوں کے چکر میں الجھ گئے تو اس جماعت کے بلند اوصاف اور پاکیزہ صفات میں فرق پڑ گیا اور ان کے اعلیٰ جوہر جن سے اس جماعت کی خمیر تیار ہوئی کھٹی وہ سب ایک ایک کر کے ختم ہو گئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی ممانعت کا یہی قانون نافذ کیا تھا پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ ہوئے تو حضرت عمر کے مذکورہ بالا قانون کو دوبارہ نافذ کیا تھا اور اپنی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ علامہ طنطاوی کہتے ہیں۔

وَ اَيَّدَا هَذِهِ الْقَاعِدَةَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ وَ كَانَ يَتَحَدَّثُ اسْتِ
الْحُطَابِ بِكُلِّ خُطْوَاتِهِ ۵۴

اور حضرت عمرؓ کے اس قانون کو عمر بن عبدالعزیزؒ نے نافذ کیا اور وہ حضرت عمرؓ کے ہر نقش قدم پر چلتے تھے۔

وہ قانون یہ تھا۔

(۱) فَقَالَ أَيُّمَا ذِيٍّ اسْلَمَ فَإِنَّ إِسْلَامَهُ يُخْرِضُ لَهُ نَفْسَهُ وَعَالِدَهُ
وَ مَا كَانَ مِنْ أَرْضٍ فَإِنَّهَا مِنْ قِيٍّ اِلهِ عَلَى الْمُسْلِمِينَ۔

اعلان کروا دیا کہ جو ذی (غیر مسلم) اسلام قبول کرے اس کی جان اور اموال منقولہ محفوظ رہیں گے لیکن اموال غیر منقولہ مسلمانوں کے لئے اشد کیفتے ہو جائیں گے۔

(۲) وَ أَيُّمَا تَوْمٍ صَالِحًا عَلَى حِزْبِيَّةٍ يُعْطُونَهَا فَمَنْ اسْلَمَ مِنْهُمْ
كَانَتْ دَارُهُ وَ اَرْضُهُ لِبَقِيَّتِهِمْ۔

اور جن لوگوں سے معاہدہ ہو گیا ہے وہ لوگ اگر اسلام قبول کر لیں تو اموال غیر منقولہ اسی قوم کے بقیہ لوگوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے۔

یہ چند اشال ہیں جن سے ایک طرف تو مسلم جماعت کی زندگی کا پتہ چلتا ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلامی نظام حیات کا اپنے لمننے والوں سے کتنا بلند اخلاق اور قربانی کا مطالبہ ہے اور نہ لمننے والوں ساتھ کتنا اور کس قدر منصفانہ سلوک ہے۔

آج بھی دنیا کی مہذب قوموں میں اپنی پارٹی والوں کے ساتھ رورعایت جائز سمجھی جاتی ہے اور پارٹی والے اقتدار حاصل کرتی ہے کہ وہ اوروں کا خون چوس کر خود عیش و عشرت کر سکے۔ بخلاف اس کے اسلامی حکومت یا مسلمان ہو کر کسی کا ناجائز طریقے پر مال لینے کا خیال تو الگ رہا خود اس کا مال و جائیداد غیر مسلموں میں تقسیم کر دینے کا حکم ہے۔

(جون ۱۹۵۵ء)



زرعی اصلاحات

۱۹۵۹ء میں 'حکومت پاکستان کی طرف سے زرعی اصلاحات کا اعلان ہوا۔ اس پر طلوع اسلام کی اشاعت بابت فروری ۱۹۵۹ء میں حسب ذیل تبصرہ شائع ہوا۔

حکومت کی طرف سے زرعی اصلاحات کے لئے جو کمیشن مقرر ہوا تھا اس نے اپنی سفارشات مرتب کر کے حکومت کے حوالے کر دیں۔ کابینہ نے ان پر غور و خوض کے بعد کچھ فیصلے کئے۔ ان فیصلوں کا ملخص 'محترم صدر مملکت پاکستان نے ریڈیو سے نشر کیا۔ ان میں سے قرآنی نقطہ نگاہ سے اہم فیصلے یہ ہیں کہ (i) کوئی شخص ایک خاص رقبہ سے زیادہ زمین اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکے گا۔ (ii) زائد زمین کو حکومت معاوضہ دیکر اپنی تحویل میں لے لیگی۔ جاگیروں کا معاوضہ نہیں دیا جائے گا۔ (iii) اگر کسی کے پاس ایک خاص معینہ رقبہ سے کم زمین رہ جائے تو وہ تقسیم نہیں ہو سکے گی۔ بغور دیکھئے تو ان میں دو فیصلے ایسے ہیں جنہیں اصولی کہا جائے گا۔ یعنی ایک خاص رقبہ سے زائد زمین، مالکان اراضی سے لے لی جائے گی اور ایک خاص رقبہ سے کم اراضی تقسیم نہیں ہو سکے گی۔

زمین کی ملکیت کے متعلق قرآنی مسلک کی وضاحت ایک مدت سے طلوع اسلام میں ہوتی چلی آ رہی ہے اس لئے اس وقت اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ خدا نے انسان کو پیدا کیا تو اس کی ربوبیت (پرورش) اور ہدایت (راہ نمائی) اپنے ذمے لی۔ ربوبیت کے لئے اس کا سامان رزق زمین میں جمع کر کے رکھ دیا اور کہہ دیا کہ وہ اس میں سے حسب ضرورت نکال کر کھاتا رہے۔ راہ نمائی کے لئے اس نے اپنے رسول بھیجے شروع کر دیئے۔ ربوبیت اور ہدایت کے ہذمتہ خدا ہونے کا لازمی نتیجہ تھا

کہ یہ چیزیں بطور مہربت (بلا قیمت و بلا معاوضہ) ملیں گی۔ چنانچہ جہاں ہر رسول یہ اعلان کرتا رہا کہ **فَاَسْتَلْكُمْ عَلَيْهِ مِنْ آجْرٍ**۔ ”میں تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔“ زمین کے متعلق اس نے کہہ دیا کہ یہ **سَمَوَاتٍ لِلشَّٰئِطٰنِ** ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیے۔ یہ تھا انتظامِ خداوندی، لیکن چونکہ زندگی کے ایٹج پر ابلیس بھی ”آدم“ کے ساتھ ہی آگیا تھا، اس لئے اُس نے خدائی نظام کے بگاڑنے میں ہر ممکن کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طبقہ نے رطافت کے زور پر (مادہ ارض کو اپنی ذاتی ملکیت بنا لیا اور دوسرے نے ہدایت (خدائی راہ نمائی) پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی اور یوں رزق اور ہدایت رجو خدا کی طرف سے مفت ملے بھتے) قیمتاً بکنے لگ گئے۔ انسانیت کی تاریخ اسی کشمکش کی داستان ہے جس کی رو سے حزبِ اللہ (خدائی جماعتیں) رزق و ہدایت کو نوعِ انسانی کے لئے عام کرتیں اور حزبِ الشیطان (ابلیسی قوتیں) ان پر اجارہ داری قائم کرتی چلی آ رہی ہیں۔ یعنی اس کشمکش میں موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) ایک طرف ہوتے ہیں اور فرعون، قارون اور ہامان دوسری طرف۔ اسی داستان کا حسین ترین باب حضرت خاتم النبیین کا عہد ہمایوں تھا جس میں رزق کے سرچشمے اور شمعِ ہدایت عالمگیر انسانیت کے لئے عام ہو گئے۔ اس میں نہ کسی سرمایہ دار (زمیندار و جاگیردار) کا نام و نشان باقی رہا اور نہ ہی مذہبی پیشوائیت کا وجود۔ اور یوں ”زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھی“ لیکن اس کے بعد پھر غریبِ آئی قوتوں نے زور پکڑ لیا اور سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت نے سر اُٹھا لیا۔ قرآن نے کہا ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں آخر الامر حق، باطل پر غالب آجاتا ہے۔ لیکن اگر ہر کشمکش کو تنہا خدا کے کائناتی قانون کے سپرد کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ بہت دیر میں جا کر برآمد ہوتا ہے کیونکہ خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے، اور اگر اس کے ساتھ انسانی دست و بازو بھی شریک ہو جائیں تو اس کے نتائج بہت جلد سنے آجاتے ہیں۔ جس چیز کو عام طور پر ”زلزلے کے تقاضے“ کہا جاتا ہے وہ خدا کے کائناتی قانون کے مخفی اشارے ہوتے ہیں۔ زرعی اصلاحات کے سلسلے میں موجودہ اقدامات انہی تقاضوں کے منظر میں۔

ہمارے ہاں ردیگر مسلم مالک کی طرح، مفاد پرست گروہ کا موقف یہ تھا کہ انہیں زمین پر ذاتی ملکیت کا حق حاصل ہے۔ ان کے اس موقف کی تائید مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوتی تھی جو اس قسم کے فتاویٰ جاری کرتے تھے کہ

”اسلام کی حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں..... جس طرح وہ (اسلام) ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔“

مسئلہ ملکیت زمین - از سید ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۴۲، ۴۳

یہ موقف اور یہ اصول، قرآن کے یکسر خلاف تھا۔ حکومت نے یہ فیصلہ کر کے کہ ایک خاص رقبہ سے زائد زمین حکومت کی تحویل میں آجائے گی زمینداروں کے اس موقف اور ان لوگوں کی خود ساختہ شریعت کے اس اصول کو توڑ کر رکھ دیا ہے اور اس طرح قرآنی اصول و نظام کی طرف ایک قدم بڑھایا ہے۔ ہمارے نزدیک حکومت کا یہ اقدام مستحق ہزار مبارکباد ہے کہ اس سے زمینداری کے غیر اسلامی نظام کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ حکومت نے فاضلہ رقبوں کو اپنی تحویل میں لینے کے لئے موجودہ ”مالکوں“ کو معاوضہ دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے لیکن اس سے ذاتی ملکیت کا اصول بہر حال باقی نہیں رہتا۔ ”ذاتی ملکیت“ کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو اس کا حق نہیں کہ وہ مالک کی رضامندی کے بغیر اس نشے کو اس کے قبضے سے نکال کر اپنے قبضے میں لے لے یا کسی دوسرے کے قبضے میں دیدے۔ جب حکومت نے یہ فیصلہ کر دیا کہ اتنے رقبے سے زائد رقبے کو حکومت اپنے قبضہ میں لے لے گی تو اس سے ملکیت کا دعویٰ متزلزل ہو گیا۔ یہ بہت بڑا انقلاب ہے اور جب سے مسلمانوں میں سرمایہ داری اور زمینداری کا نظام آیا ہے اس قسم کے انقلاب کی مثال نہیں ملتی۔ ہم نے دسمبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت کے لمعات میں لکھا تھا کہ

”جہاں تک زمینداروں کا تعلق ہے اگر سروسٹ یہ ناممکن ہو کہ زمین کو بالکل انفرادی ملکیت سے نکال لیا جائے تو پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ذاتی ملکیت کے رقبوں کی اس طرح تحدید کر دی جائے کہ نہ کسی کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین رہے اور نہ کوئی کاشتکار زمین کے مناسب قطعہ سے محروم رہے۔ قدم اول کی حیثیت سے یہ تحدید بجائے تو لیس قرآن کے منشاء کے مطابق ہوگی۔“

لشدا الحمد کہ حکومت کا یہ پہلا قدم اس کے مطابق اکٹھا ہے۔ ہماری ذاتی رائے میں پانچ صد ایکڑ نہری یا

ایک ہزار ایکڑ بارانی رقبہ جو بعض حالات میں اس سے بڑھ سکتا ہے زیادہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ رقبہ کی مقدار اتنی ہونی چاہیے تھی جس سے ایک خاندان باعزت گزارہ کر سکے۔ پانچ صد ایکڑ رقبہ اس سے بھی زیادہ رقبہ اراضی کی آمدنی اور زائد رقبہ کا زر معاوضہ، مترقین کے اس طبقہ کو باقی رکھے گا جو دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرتے اور فاضلہ دولت کے بل بوتے پر معاشرہ پر مختلف نوعیتوں سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے یہ قدم اول بہرچشیت موجودہ صورت حالات سے کہیں بہتر ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے ذاتی ملکیت کا اصول متزلزل ہو جاتا ہے۔

ہمارے "ارباب شریعت" کی طرف سے زمین پر ذاتی ملکیت کی تائید میں دوسری دلیل یہ دیکھائی تھی کہ اگر زمین پر ذاتی ملکیت نہ رہے تو قانون وراثت کا کیا بنے گا۔ ہم نے انہیں بار بار یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ جب قرآن کی رو سے زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی تو اس ضمن میں قانون وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن وہ اپنی بات کو برابر دہرائے چلے جاتے۔ حکومت نے اب فیصلہ کیا ہے کہ اگر رقبہ اراضی ایک خاص کمتر حد تک پہنچ جائے تو اسے تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (مثلاً) کسی شخص کے پاس دس ایکڑ زمین ہے اور اس کے چار لڑکے ہیں۔ ہمارے ارباب شریعت کے خیال کے مطابق یہ زمین ان چار لڑکوں میں بٹ جانی چاہیے۔ لیکن حکومت کے حالیہ فیصلہ کے مطابق یہ زمین ان لڑکوں میں تقسیم نہیں ہو سکتی۔ اس میں خشبہ نہیں کہ اس قطعہ اراضی کی آمدنی میں ان سب لڑکوں کا حصہ ہوگا اور اس اعتبار سے وہ متوفی کے ترکہ کے وارث قرار پائیں گے۔ لیکن جہاں تک زمین کا تعلق ہے اس فیصلہ سے قانون وراثت اپنی جگہ سے ضرور ہل جاتا ہے۔ موجودہ قانون وراثت کی رو سے ان لڑکوں و متوفی کے ورثا کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ اس رقبہ کو چار حصوں میں تقسیم کر کے اپنے اپنے حصے کے مالک بن جائیں۔ لیکن حالیہ فیصلے کے مطابق وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ انہیں اس رقبہ کا مشترکہ انتظام کرنا ہوگا ورنہ حکومت اسے مناسب وضع دے کر اپنی تحویل میں لے لیگی۔ اس سے وراثت میں زمین پر حق ملکیت کا اصول ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ یہ اصول قائم ہو جاتا ہے کہ حکومت، عوام کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے، زمین کا جس قسم کا انتظام چاہے کر سکتی ہے۔ اور یہی قرآن کا منشا ہے۔

حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ زائد زمین کا معاوضہ دے کر اسے اپنی تحویل میں لے لیا جائے اور پھر اسے کاشتکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے۔ ہمارے نزدیک یہ بہتر ہوتا کہ جاگیرداری کی طرح

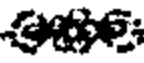
زائد زمین بھی بلا معاوضہ حاصل کرنی جاتی اسے بلا قیمت کاشتکاروں میں حسب ضرورت تقسیم کر دیا جاتا۔ یہ انتظام زمین کے متعلق قرآنی تصور سے زیادہ قریب ہوتا۔ بائیں ہمہ یہ اعلان بڑا اطمینان بخش ہے کہ حکومت کی طرف سے زمین کے اس لین دین کے سلسلہ میں خزانہ عامرہ پر کسی قسم کا کوئی بار نہیں پڑے گا۔ اور "کنوئیں کی مٹی کنوئیں میں لگا دی جائے گی"۔

حکومت کی طرف سے شائع شدہ پریس نوٹ میں (جواب ہمارے سامنے آیا ہے) یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو رقبہ اراضی "گزارہ کی حد تک" سمٹ جائے اس کا کوئی حصہ زمین - بیع - یا ہبہ کے ذریعے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ یہ پورے کا پورا الگ کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بہتر ہوتا کہ زمین کو زمین رکھنے کی قطعاً اجازت نہ دی جاتی اور بیع کی صورت میں یہ پابندی لگا دی جاتی کہ اسے صرف حکومت کے پاس فروخت کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد حکومت اسے اس شخص کے ہاتھ فروخت کرتی جس کے پاس اس کی ضرورت سے کم رقبہ ہو۔ اگر بیع پر اس قسم کی پابندی نہ لگائی گئی تو رفتہ رفتہ، یہ چھوٹے چھوٹے قطعات، رپانچہ یا ایک ہزار ایکڑ کی حد تک، چند نفوس کے پاس اکٹھے ہوتے جاتے گئے اور مالک کاشتکاروں کی حیثیت پر مزارعوں کی رہ جائے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مزارعوں کے حقوق کے تحفظ کے حالیہ فیصلوں میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ایسی شکل پیدا نہ ہونے دی جائے جس میں پانچ پانچ سو ایکڑ والے زمیندار کثرت پیدا ہو جائیں اور محنت کرنے والے مزدور کے مزدور رہ جائیں۔

پریس نوٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذاتی اوقاف کی اراضیات ان لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں گی جو اس وقت صرف ان کی آمدنی سے متمتع ہو سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ بھی نسبتاً بہتر ہے۔ قرآن کی رو سے وقف کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ کسی مردہ کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ زندہ انسانوں پر اپنا حکم چلائے اور اس طرح اپنے اختیارات کو ابدیت سے ہمکنار کرے۔

حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ افتادہ زمینوں کے مالکان کو نوٹس دیا جائے گا کہ وہ ایک مدت معینہ کے اندر اندر رقبہ کو زیر کاشت لائیں۔ بصورت دیگر حکومت اس زمین کو اپنی تحویل میں لے لے گی۔ یہ فیصلہ بھی بڑا مستحسن ہے۔ اس سے بھی اصول ملکیت کی عمارت متزلزل ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ جو چیز زید کی ملکیت میں ہے، زید کو حق حاصل ہے کہ اسے استعمال میں لائے یا دوسرے ہی پرارہنے دے۔ قرآن اس قسم کا حق ملکیت اساسی طور پر کسی شے میں بھی تسلیم نہیں کرتا۔ نہ زمین میں رحمتی کہ نہ انسان کی اپنی جان میں

یہ چیزیں نوع انسان کی منفعت کی ہیں اور انہیں تو انہیں خداوندی کے مطابق، اس مقصد کے لئے صرف میں لانا چاہیے۔



یہ ہیں بہر حال، وہ چند موٹی موٹی تفصیلات جو حکومت کے عالیہ فیصلہ کے سلسلے میں ان سطور کی تسوہ تک سلتے آئی ہیں جیسا کہ ہم نے ابتداء میں لکھا ہے حکومت اپنے اس فیصلہ کے لئے مستحق تبریک و تہنیت ہے، یہ سببت مجبویٰ یہ زمین کے انتظام کے ضمن میں قرآنی نظام کی طرف قدم اول ہے جسے فی الحقیقت بڑی جرأت سے اٹھایا گیا ہے۔ یہی وہ احساس تشکر و تبریک ہے جس کے اظہار کے لئے حسب ذیل تازہ قرآنک رسیرج سینٹر اور ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے جنرل محمد ایوب خان، صدر مملکت پاکستان کی خدمت میں ارسال کیا گیا ہے۔

زرعی اصلاحات کے جرات مندانہ اقدام پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ قرآن کی رو سے زمین کو عوام کی ضروریات پورا کرنے کے لئے حکومت کی تحویل میں رہنا چاہیے ان اصلاحات نے زمین پر ذاتی ملکیت کے غیر قرآنی اصول کی بنیادیں ہلا کر اور رقبوں کی تحدید سے قرآنی نظام کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے۔ اور بیابان کا نہ اٹھایا ہے۔ اس سے ملک کی معاشی حالت خوشگوار ہو جائے گی اور کمیونزم کا سیلاب رک جائے گا۔ خدا آپ کو مزید ہمت عطا فرمائے تاکہ آپ اس آئیڈیلوجی کو جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا تھا، عملی حقیقت بنائیں اور اس طرح یہ خطہ زمین اسلامی پنج زندگی کا گہوارہ بن جائے۔

ہم اس مقام پر دہرا دیں کہ قرآنی نظام رقبیت کے مطابق، تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری حکومت کے سر پر ہوتی ہے۔ اس اہم ذمہ داری سے عہدہ براہونے کے لئے حکومت ذرائع پیداوار کو اپنی تحویل میں رکھتی ہے۔ ان پر ملکیت نہ افراد کی ہوتی ہے نہ ملکیت کی۔ ذرائع پیداوار میں صرف زمین ہی شامل نہیں، دور حاضر میں کارخانے بھی یہی حیثیت رکھتے ہیں، ہمیں امید ہے کہ اب حکومت، کارخانوں کے نظام کے متعلق بھی اسی ستم کی اصلاحات پر توجہ دے گی۔ اس لئے کہ جو خرابیاں زمین سے حاصل شدہ لامحدود دولت سے پیدا ہوتی ہیں اسی ستم کی خرابیاں کارخانوں سے حاصل کردہ لامحدود دولت سے بھی رونما ہوتی ہیں۔ قرآن ان خرابیوں کا علاج یہ بتاتا ہے کہ فاصلہ ضرورت سے زیادہ، دولت کو کسی کے پاس بھی نہ رہنے دیا جائے۔ اسے قوانین خداوندی کے مطابق نوع انسانی کی منفعت

کے لئے عام کر دیا جائے، خدا کرے ہماری مملکت بتدریج اس منزل تک پہنچ جائے اور اس طرح ایک ایسے انسانیت ساز معاشی نظام کو متشکل کر دکھائے جس کے سامنے امریکہ اور روس دونوں کی نگاہیں ٹھیک جائیں۔

یارب این آرزوئے من چہ خوش است



اقبال اور اشتراکیت

(شائع شدہ اپریل ۱۹۶۳ء)

اقبال نے اپنے آپ کو "شاعرِ سردا" کہا تھا۔ چونکہ قوموں کی زندگی میں امروز و فردا صدیوں کے پیمانے سے ملے جاتے ہیں اس لئے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس فردا کا طلوع کب ہوگا جب سلمان اقبال کے صحیح مقام اور اس کے پیغام کے صحیح مفہوم سے آشنا ہو سکے گا۔ لیکن یہ حقیقت تو ابھی سے بے نقاب ہونا شروع ہو گئی ہے کہ اقبال "ویارغیبیر" کا شاعر تھا۔ چنانچہ آج انگلستان، فرانس، جرمنی اور اٹلی میں اقبال کے کلام کے ترجمے شائع ہو رہے ہیں اور اس کی شرحیں لکھی جا رہی ہیں۔ لیکن خود پاکستان میں یہ حالت ہے کہ سال بھر کے بعد اپریل کے مہینے میں دو چار مقامات پر انفرادی طور پر "یومِ اقبال" کے جلسے منعقد کر لئے جلتے ہیں اور اس کے بعد اس "دفنِ بے معنی" کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ دورانِ سال میں اتنا ہوتا ہے کہ کبھی کسی قوال نے اقبال کی کوئی غزل گا دی یا کبھی ریڈیو والوں نے اپنے پردگرام کا خلا پیر کرنے کے لئے اس کی کوئی نظم سنا دی۔ یوں یاد قائم کی جا رہی ہے اس شخص کی جس نے (اور کاما باتوں کو چھوڑ بیٹے) اس قوم کو اس پاکستان کا تصور دیا۔ جس سے اب اس کی زندگی وابستہ ہے اور جس کی وجہ سے اسے وہ مواقع حاصل ہو گئے ہیں کہ اگر یہ چاہے تو دنیا کی ممتاز ترین قوموں کی صف میں جگہ پاسکتی ہے۔ اتنی بڑی احسان فراموشی مسلمانوں ہی سے ظہور میں آسکتی تھی۔

ہمارے نزدیک اقبال کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قوم کو پھر سے دستان سے

آشنا کرنے میں سلسلہ جدوجہد کی۔ اس میں مشہد نہیں کہ ملک پاکستان بھی ایک گراں بہا نعمت ہے۔ لیکن اقبال کے الفاظ میں ”ملکت ایک کوشش ہوتی ہے (سترآنی) نصب العین اصولوں کو زمانہ و مکان میں سمورت پذیر کرنے کی، یہ ایک آرزو ہوتی ہے ان اصولوں کو کسی خاص انسانی ادارہ میں رو بہ عمل لانے کی“ یعنی اسلامی نقطہ نگاہ سے ملک کی اہمیت محض اس لئے ہوتی ہے کہ وہ انسانیت کے ان بلند مقاصد کو ہمیں سترآن نے عطا کیا ہے عملی پیکروں میں ڈھلنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اقبال کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے سترآن کے ان بلند مقاصد کو قوم کے سامنے بے نقاب کیا اور انہیں بتایا کہ ان کی زندگی اور سرفرازی کا راز انہی مقاصد کی عملی تشکیل میں ہے۔

اقبال نے جو کچھ سمجھا سترآن سے سمجھا اور جو کچھ سمجھا یا سترآن سے سمجھا یا سترآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے بلند مقاصد کو اصولی طور پر بیان کرتا ہے اور ان کی جزئیات کو بالعموم غیر معین چھوڑتا ہے تاکہ سترآن پر عمل کرنے والی قوم ان جزئیات کو اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں خود متعین کر سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس دور میں زندگی کا کوئی تقاضہ نمایاں حیثیت اختیار کر لیتا ہے، اس تقاضے سے متعلق سترآن کے اصول بھی نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ ہمارے دور میں انسانی زندگی کے جس تقاضے نے سب سے زیادہ نمایاں حیثیت اختیار کی ہے، وہ روٹی کا مسئلہ ہے۔ اس میں مشہد نہیں کہ جب انسان نے تمدنی زندگی شروع کی ہے روٹی کا مسئلہ اس کے ساتھ ساتھ رہا ہے۔ لیکن اس مسئلے نے ایک عالمگیر تقاضے کی حیثیت ہمارے ہی دور میں اختیار کی ہے۔ یہ غیر ممکن تھا کہ اقبال جو زندگی کے تقاضوں پر سترآن کی روشنی میں غور کرتا تھا۔ اپنے دور کے ایسے اہم تقاضے سے غیر متاثر رہتا اور سترآن نے اس باب میں جو راہ نمائی دی ہے اسے پیش نہ کرتا۔ اقبال کا پہلا دور، ان بڑھتے ہوئے تقاضوں سے متاثر ہونے کا ہے۔ دوسرا دور اس حل پر غور و فکر کرنے کا اور اسے سترآنی روشنی میں پرکھنے کا ہے جو تنہا عقل انسانی نے اس مشکل کے لئے دریافت کیا۔ اور تیسرا دور وہ ہے جس میں اس نے اس مشکل کا سترآنی حل پیش کیا ہے۔ اس اثر پذیری کی آواز ہم سب سے پہلے ”خضرِ راہ“ میں سنتے ہیں۔ جب وہ خضر سے سوال کرتے ہیں کہ

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے؟

اور یہ سرمایہ و محنت میں سب سے کیسا خروش؟

اور اس کے جواب میں خضر کہتا ہے

خضر کا پیغام کیسا ہے یہ پیغام کاسیات
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برتا
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور رات

بندہ مزدور کو جب کہ مرا پیغام دے
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار

اُٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اس کے بعد پیغام مشرق میں دیکھے۔ وہ "صحبت زمکاں" کے عنوان میں ٹالسٹائی، کارل مارکس، ہیگل، مزدک، کوہن وغیرہ سب کو جمع کرتے ہیں اور ان کی زبان سے اس اہم تقاضے کی ترجمانی مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے کرتے ہیں، ٹالسٹائی کہتا ہے۔

از پئے نان جویں تیغ ستم بر کشید
جان حن داد اور اخواجہ بجائے خرید

بارکش اہرن لشکری شہ یار
داروئے بہوشیش تاج، کلیسا، وطن

کارل مارکس کہتا ہے۔

رازوان جزو دکل از خویش نامحرم شد است

آدم از سرمایہ دار کا تامل آدم شد است

ہیگل اپنا فلسفہ اعداد پیش کرتا ہے، اور ٹالسٹائی اسے "عقل دورو" کی چابک دستی قرار دے کر اس کی تردید کرتا ہے۔ مزدک اعلان کرتا ہے کہ

دور پرویزی گذشت اے کشتہ پرویز خیز

نعمت گم کردہ خود را ز خسرو باز گیر

فرانسسیسی فلاسفر کو مٹ مزدور کو یہ سبق دیتا ہے کہ — نیاید ز محمود کار ایاز — اور مزدور ایک پر معنی بسم سے جواب دیتا ہے کہ

حق کوہ کن دادی اے نکتہ سنج

بہ پرویز پر کار و نا بروہ رنج

آخر میں "تسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور" میں وہ ان دونوں کا تقابل نہایت وضاحت اور خوبصورتی سے

کرتا ہے جہاں سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ

غوغائے کارخانہ آہن گری زمین

نخلے کہ شہ خراج برومی نہد زمین

اسی خاک و آنچه در شکم او از آن من

اور اس کے بعد "نولے مزدور" میں کہتا ہے کہ

بسیا کہ تازہ نوامی نژاد و از رگ ساز

مغان و دیرمغان را نظام آتازہ دہیم

ز رہزنان چین انتقام لالہ کشیم

یہی دعوت انقلاب ہے جسے ہم "زبور عجم" میں اس سے بھی تیز انداز میں دیکھتے ہیں۔ جہاں اقبال کہتا ہے

کہ

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ تابا
از جفلے وہ خدایاں کشت بہقانِ خرا

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

من درونِ شیشہ ہائے عصر حاضر دیدہ ام
آنچنان زہرے کہ از دے مار با در بیجِ دتاب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

"بال جبرلی" میں "فرشتوں کا گیت" اسی نظام سرمایہ پرستی کی تباہ انگیزیوں کے خلاف مدللے

اجتجاج ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ

تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

خلق خدا کی گھات میں زند و فقیر و میر پیر

تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست

یہی وہ اجتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے

کارخِ امران کے درو دیوار ہلا دو

ہن کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

اکھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہیں پڑی

اسی کتاب میں لینن کا وہ مشہور شکوہ بھی ہے جس میں وہ خدا سے کہتا ہے کہ

تو ت اور دعا دل ہے مگر تیرے جہاں لیا
ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

یہی نظام سرمایہ پرستی کے انسانیت سوز نتائج جنہیں اقبال کی نگہ بصیرت نے بجا نپا اور جو اس کے قلب حساس کی گہرائیوں سے نشتروں کی شکل میں سطح سے اوپر اُبھرے۔ یہی ہیں وہ اشعار جنہیں کمیونسٹ اپنے جلسوں اور جلوسوں میں گاتے ہیں اور ان سے ثابت کرتے ہیں کہ اقبال بھی کمیونسٹ تھا۔ لیکن اقبال کمیونسٹ نہیں تھا، نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے۔ اہل یہ ہے کہ کمیونسزم کے دو حصے ہیں۔ ایک تو ان کا یہ دعویٰ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ رزق کو سمیٹ کر اپنے قبضہ میں لے لے جبکہ غریب اور اسکے بچے بھوکوں مر رہے ہوں۔ جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے اس کا ہر وہ مسلمان ہمنوا ہے۔ جو قرآن سے راہ نمائی حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اقبال بھی اس کا ہمنوا تھا۔ اسے اس کا ہمنوا ہونا چاہیے تھا۔ لیکن دوسری چیز ہے کمیونسزم کا وہ فلسفہ جس پر وہ اس دعویٰ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ یعنی ہیگل کی جدلیت اور کارل مارکس کی تاریخ کی معاشی تعبیر۔ یہ وہ فلسفہ ہے جس کی تائید کوئی مسلمان نہیں کر سکتا اور چونکہ اقبال مسلمان تھا اس لئے وہ اس فلسفہ کا سخت مخالف تھا۔ چنانچہ وہ غلام السیدین کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں (جولائی ۱۹۳۷ء میں لکھا گیا تھا) کہ

سوشلزم کے معنی ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں، اور اسے ایفون تھو

کہتے ہیں۔ لفظ ایفون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔

میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی

مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے سیاسی

مفہوم کا..... جو روحانیت میرے نزدیک مضموب ہے۔ یعنی ایفون خواص رکھتی ہے

اس کی تردید میں نے جایا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم

ہے۔ جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال کارل مارکس کو "کلیم" تو کہتا ہے لیکن بے تحشی اور "بیچ" قرار دیتا ہے۔

لیکن بے صلیب۔ حقیقت یہ کہ وہ جاوید نامہ میں افغانی کی زبان سے یہ کہلاتا ہے

صاحب سرمایہ از نسلِ خلیل
یعنی آل پیغمبر بے جبر تیل
زانکہ حق در باطل اور مضمر است
قلب او مومن و داعش کافر است
غربیاں گم کردہ اندا فلاک را
در شکم جویند جان پاک را

دین آل پیغمبر ناقص شناس
بر مساواتِ شکم وارد اساس

وہ کہتا ہے کہ جب روٹی کے مسئلہ کو خاص مادی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے انسان حیوانی سطح پر تو زندہ رہ سکتا ہے لیکن اس کی انسانیت یکسر مردہ ہو جاتی ہے۔ لہذا اس قسم کی اشتراکیت ہو، یا مغرب کی ملوکیت، انسانیت کے حق میں دونوں کا نتیجہ ایک ہے۔

ہر دور احباب ناصبور و ناشکیب
ہر دو یزدان ناشناس آدم فریب
زندگی این را خروج آں را خراج
در میان این دو سنگ آدم زجاج
غرق دیدم ہر دور در آب دگل
ہر دور اتن روشن و تاریک دل

زندگانی سوختن با ساختن
در گلے تخم دے انداختن

یہی "سوختن با ساختن" ہے جسے اقبال لاء اور الٹا سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روس کا اشتراکی نظام درحقیقت لاء کے گرداب میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی تمام کوششیں تخریبی ہی تخریبی ہیں۔ "ساختن" یعنی لاء تعمیر کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ چنانچہ وہ "پس چہ باید کرد" میں روس کی اسی کشمکش کے بارے میں کہتا ہے۔

روس را قلب و جبگر گریدہ خوں
از خمیرش حرفت کا آمد بروں
آں نظام کہنہ را بر ہم زد است
تیر نیسے بر رگ عالم زد است
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ!
لا سلاطین لاء کلیسا لاء

فکر اور تہذیب باد لاء بماند
مرکب خود را سوئے لاء نراند

یہاں سے وہ تیسرا دور شروع ہوتا ہے، جہاں اقبال اس اہم تقاضے کے متعلق قرآنی حل

پیش کرتا ہے وہ سب سے پہلے "سوختن اور ساختن" کے اصول کو لیتا ہے اور کہتا ہے کہ
 نکتہ می گویم از مردان حال
 لا و الا احتساب کائنات
 امتتان را "لا" جلال "الا" جمال
 لا و الا منح باب کائنات
 حرکت از لا زاید از الا سکون
 سوئے الا می حسرت کائنات
 لا و الا ساز و برگ امتتان
 نفی بے اثبات مرگ امتتان

لا کے معنی ہیں ہر غلط نظام کو تباہ کر دینا۔ اور الا کے معنی ہیں اس کی جگہ ایک صحیح نظام قائم کرنا یہ صحیح نظام صرف مستقل اقدار کی بنیادوں پر قائم کیا جاسکتا ہے اور مستقل اقدار عقل کی رد سے کبھی نہیں مل سکتیں۔ یہ اقدار صرف وحی کی رو سے مل سکتی ہیں اس لئے کہ

عقل خود میں عنافل از ہیوود غیر
 سو خود بیند، نہ بیند سوود غیر
 وحی حق بیند سوود ہمہ
 در نگاہش سوود ہیوود ہمہ

اسی لئے اقبال نے افغانی کی زبانی (جاوید نامہ میں) روس کو یہ پیغام دیا تھا کہ

تو کہ طرح دیگرے انداختی
 کردہ کار خداوندان تمام
 دل زد ستور کہن پر داحتی
 بگذرا از لا جانب الا حرام
 تارہ اثبات گیری زندہ
 در گذرا از لا اگر جو سنده

اے کہ می خواہی نظام عالمے

جستہ اور اساس محکمے؟

اقبال کے نزدیک نظام عالم کے لئے اس قسم کی محکم اساس قرآن کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اس نے روس سے کہا کہ

داستان کہنہ شستی باب باب
 فکر را روشن کن از اتم الکتاب

۱۔ اس اجال کی تفصیل "اساس محکم" کے عنوان سے جداگانہ مقالہ میں ملے گی جو چند صفحات آگے چل کر سنے آئے گا۔

اس کے بعد وہ کہتا ہے

چلیت قرآن؟ خواجہ رام پینام مرگ
بیچ خیر از مردک ز رکش مجو
با مسلمان گفت جاں برکت بمنہ

دستگیر بندہ بے ساز و برگ
لَرْتَنَّا لَوْلَا الْبِرْحَمَةُ تَنْفَقُوا
ہرچہ از حاجت فسزوں داری بہہ

اقبال کو خالی تخریبی پروگرام کی ناعلمی پر اس قدر یقین تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ روس زیادہ دیر تک تخریب کے گرداب میں رہ نہیں سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں یہاں تک کہہ دیا کہ

آیدش روزے کہ از زور حسنوں

خولش رازیں تت باد آرد بروں

اقبال اپنے ایک خط میں جواہروں نے سرفرانس نیگ ہرنیڈ کو ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا

راہر جو ۳۱ جولائی کے مول بیڈ ملٹری گزٹ میں شائع ہوا تھا، لکھتے ہیں۔

"ذاتی طور پر میں نہیں سمجھتا کہ روسی فطرۃً للذہب ہیں۔ اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ روسی عورتیں اور مرد بڑے مذہبی رجحانات رکھتے ہیں اور روسی ذہن کا موجودہ منفی رجحان ہمیشہ باقی نہیں رہے گا کیونکہ کوئی عمرانی نظام دہریت کی اساس پر باقی نہیں رہ سکتا۔ جونہی اس ملک میں حالات ٹھیک ہو جائیں گے اور اس کے باشندوں کو اطمینان سے غور کرنے کا وقت ملے گا۔ وہ مجبوراً اپنے نظام کی کوئی مثبت بنیاد تلاش کریں گے۔ چونکہ بالشویت کے ساتھ خدا کا قائل ہونا اور اسلام قریب قریب ایک ہی چیز ہیں۔ اس لئے مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوگا۔ اگر کچھ زمانے کے بعد روس اسلام کو ہضم کر لے یا اسلام روس کو۔"

لیکن اقبال ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو ہمیشہ اس انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ یورپ کا فلاں ملک مسلمان ہو جائے تو مسلمان کا بول بالا ہو جائے اور ہماری بھی قسمت جاگ اٹھے۔ وہ مسلمانوں سے ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ تمہاری قسمت تمہارے اپنی ہاتھوں ہی سے بیدار ہوگی۔ لہذا اس نے مسلمانوں سے کہا کہ اس وقت زلزلے کے تقاضوں سے جو معاشی کش مکش پیدا ہو رہی ہے، تم اس کی روشنی میں قرآن پر غور کرو۔ اس تمہیں قرآن ایسی راہنمائی دیدے گا جس سے نہ صرف یہ کہ تمہاری قسمت بیدار ہو جائے گی بلکہ تمام اقوام عالم کی قیادت تمہارے حصے میں آجائے گی۔ چنانچہ وہ ضربِ کلیم میں کہتے ہیں کہ

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
اندیشہ ہو اشوخی افکار پہ عبور
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا
سترآن میں ہو غوطہ زن لے مر مسلمان

جو حرف " قتل العفو " میں پوشیدہ ہے اب تک

اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

چنانچہ جب خود اقبال نے زمانہ کے ان تقاضوں کی روشنی میں قرآن میں غور کیا تو اس کے
سلئے یہ حقیقت آگئی کہ قرآن کی رو سے رزق کے فطری حشرچمیوں پر کسی کی انفرادی ملکیت کا تصور یکسر باطل
ہے۔ خدائے رب العالمین نے سامان رزق کو تمام نوع انسانی کی پرورش کے لئے عام کر رکھا ہے۔ اس لئے
اسے اس مقصد کے لئے عام ہی رہنا چاہیئے۔ رزق کے سرچشمے زمین سے پھوٹتے ہیں۔ اس لئے زمین کے
متعلق اقبال صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ

ایں متاع بے بہا مفت است

رزق و گورازوے بگیر اورا مگیر

ہر کہ این ظاہر نہ بیند کافر است

ایں متاع بندہ و ملک خداست

حق زمین را بجز متاع ماند گفت

وہ خدا یا نکتہ از من پذیر

باطن " الہرضللت " ظاہر است

رزق خود را از زمین بدون راست

آب و نان ماست از یک ماندہ

دودۃ آدم کے تفسیر و احکام

بال جبریل میں قرآن کی اس حقیقت کو اور کبھی واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاں لکھا گیا ہے کہ

کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھانا سحاب؟

خاک کیس کی بنے کس کا ہے یہ نور آفتاب؟

موسموں کو کس نے سکھائی ہونے انقلاب؟

پالست ہے سچ کو مٹی کی تاری میں کون؟

کون لایا کھینچ کر پھم سے باد ساز گار؟

کس نے بھروی موتیوں سے خوشہ گندم کی

وہ خدا یا یہ زمین تیری نہیں تیری نہیں

تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں!

اقبال پاکستان کا حصول بھی اسی مقصد کے لئے چاہتے تھے کہ یہاں خدا کے اس قانون کو رائج کیا جاسکے، چنانچہ انہوں نے اپنی وفات سے صرف ایک سال پہلے قائد اعظم کو ایک خط میں لکھا کہ "ردٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گذشتہ دو سو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جا رہی ہے..... لیگ کا مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس کی مصیبت سے نجات دلانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے..... شریعت اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے..... اسلام کے لئے سوشل ڈیموکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج، جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کتنا ہو گا..... ان مسائل کے حل کے لئے ملک کی تقسیم کے ذریعہ ایک یا زائد اسلامی ریاستوں کا قیام اشد لازمی ہے؛

یعنی اقبال کے نزدیک ایک الگ اسلامی مملکت کی ضرورت ہی اس لئے تھی کہ یہاں اسلام کے سوشلزم کا نفاذ کیا جاسکے جیسا کہ اقبال کو خود اندیشہ تھا، لیگ نے اس باب میں کچھ نہ کیا۔ جس کا نتیجہ لیگ اذہ اس کے ساتھ سارا ملک بھگت رہا ہے۔



ربو کی بحث

(کیا معاوضہ محنت کلہے یا سرمایہ کا؟)

آج سے کچھ عرصہ پہلے پاکستان میں یہ بحث بہت زوروں پر تھی کہ اسلام نے جس سود کو حرام قرار دیا ہے اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد سود مفرد ہے۔ سود در سود (سود مرکب) نہیں۔ ایک گوشے سے یہ آواز بلند اٹھی کہ کسی کو نجی ضروریات کے لئے قرضہ دے کر سود لینا تو حرام ہے لیکن کمرشل انٹرسٹ جائز ہے۔ کمرشل انٹرسٹ سے مراد ہے کسی کو تجارت کی غرض سے قرض دینا۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ بینک کا سود جائز ہے۔ غرضیکہ جتنی زبانی باتیں سننے میں آئیں۔ اس سلسلہ میں طلوع اسلام کی فروری ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں اس موضوع پر کچھ تفصیلاً لکھا گیا جسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات سامنے آجائے گی کہ ربو در حقیقت ایک ایسی اساس کا نام ہے جس پر ایک ایسے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے جو اسلام کے معاشی نظام کی ضد ہے۔ اسی لئے قرآن نے ربو کو ”خدا اور رسول“ (اسلامی نظام) کے خلاف اعلان جنگ سے تعبیر کیا ہے۔ [

قرآن کی رو سے ربو کی جامع الہامی تعریف ان چار الفاظ کے اندر موجود ہے۔ جو سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۷۹ میں آئے ہیں۔

قرآن کی رو سے ربو کی تعریف

یعنی

وَ اِنْ تَبِعْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسٌ اَمْوَالِكُمْ

اور اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے تمہارا ہی المال ہے۔

سابقہ آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر تم ربو یعنی سے باز نہ آئے تو اسے خدا اور رسول کے خلاف بغاوت سمجھا جائے گا۔ اس کے بعد مندرجہ بالا آیت میں کہا ہے کہ اگر تم ربو یعنی سے باز آ جاؤ اور توبہ کرو تو تم اپنا اصل زر واپس لے لو۔ اس کے بعد ہے

لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝ (۲۱)

اس سے نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم ہوگا۔

اس سے واضح ہے کہ

(۱) اگر صرف اصل زر واپس لیا جائے تو اس سے مقررہ ظلم نہیں ہوتا۔

(۲) اگر اصل زر سے کچھ بھی زیادہ لیا جائے تو یہ مقررہ ظلم ہوگا۔

اسی کا نام ربو ہے۔ یعنی زر اصل سے کچھ بھی زیادہ لینا۔ کہئے کہ اس میں کوئی الحجاؤ۔ کسی قسم کا التباس کوئی شک و شبہ کوئی دشواری یا مشکل ہے؟

۲۔ یہ تو کہا گیا ہے کہ سود در سود و سود مرکب، تو حرام ہے لیکن سود مفرد حرام نہیں، تو یہ نتیجہ پوچھ

غلط ہے۔ یہ نتیجہ حسب ذیل آیت سے نکالا جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً ۝ (۱۳۹)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

اے ایمان والو! یہ دو چند سے چند ہونے والا ربو کھانا چھوڑ دو۔

امام راغب نے کہا ہے کہ اس آیت میں مُضَاعَفَةٌ دراصل ضَعْفٌ سے ہے جس کے معنی "کم کرنے" کے ہیں۔ ضَعْفٌ سے نہیں جس کے معنی بڑھانے کے ہیں۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ ربو جسے تم سمجھ رہے ہو کہ اپنے روپے کو بڑھانا ہے، بڑھانا نہیں بلکہ درحقیقت (ضَعْفٌ) کم کرنا ہے۔ ربو سے معاشرہ کی دولت کم ہوتی ہے اور سود خوار کی کمانے کی صلاحیتوں اور قوتوں میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس سے قوی معیشت بہت گھٹ جاتی ہے۔ بڑھتی نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لئے کسی دلیل اور شہاد

کی ضرورت نہیں۔ رہو سے افراد کے کمانے کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ اور قومی دولت میں کمی آتی ہے۔



قرآن کی رو سے رہو کے معنی ہیں، اصل زہر سے کچھ زیادہ لینا۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس زیادتی کا تعلق صرف قرض کے معاملات سے ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ ایک جامع اصول ہے اور قرآنی نظام معیشت کی پوری عمارت اسی بنیاد پر اٹھتی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا معاوضہ محنت (LABOUR)

کلبے یا سرمایہ (CAPITAL) کا بھی۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ **معاوضہ کس چیز کا جائز ہے** لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (۵۳)۔ انسان صرف اپنی محنت

کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ سرمایہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا معاوضہ طلب کیا جائے۔ لہذا لین دین کے حسن معاملہ میں محنت کے بغیر محض سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے، خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ وہ رہو ہے، قرآن کریم کی رو سے حرام ہے، اور خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ کے مراد۔ آپ غور کیجئے کہ ایک کاشتکار آپ سے ایک ہزار روپیہ قرض مانگتا ہے تاکہ وہ ایک قطعہ اراضی خرید کر اس میں کاشت

کرے۔ اور اس کی آمدنی سے اپنا پیٹ بھی پالے اور آہستہ آہستہ آپ کا **رہو کی مختلف شکلیں** قرضہ بھی ادا کر دے۔ آپ اسے ایک ہزار روپیہ قرض نہیں دیتے۔ لیکن

اکی روپیہ سے وہ قطعہ اراضی خرید کر اسے بٹائی یا پٹے پر دیدیتے ہیں۔ وہ اس سال بھر محنت کر کے فصل بوتا ہے اور اس میں سے نصف پیداوار آپ لے جاتے ہیں۔ یہ ہر سال ہوتا ہے اور اس کے باوجود آپ کا قرض بدستور باقی رہتا ہے۔ کیا یہ رہو نہیں؟

یا ایک دوکاندار آپ سے کچھ قرض مانگتا ہے تاکہ وہ اس سے اپنے روزگار میں کچھ اضافہ کر سکے آپ اسے روپیہ دیدیتے ہیں لیکن بطور قرض نہیں بلکہ بطور حصہ دار۔ وہ دن رات کی محنت شاقہ سے کاروبار کرتا ہے لیکن اس کے منافع میں آپ برابر کے شریک ہو جاتے ہیں۔ وہ آپ کو منافع کا حصہ دیتے چلا جاتا ہے لیکن آپ کا اصل زہر کے ذمہ بدستور باقی رہتا ہے۔ کیا یہ رہو نہیں؟

یا آپ اس کاروباری آدمی کو براہ راست قرض نہیں دیتے۔ آپ اپنا روپیہ بینک میں جمع کر دیتے ہیں اور بینک والے اس روپیے کو بطور قرض، اس کاروباری آدمی کو دیدیتے ہیں۔ وہ اس قرض پر جو سود

ادا کرتا ہے اس میں سے ایک متعین حصہ آپ کو ملتا رہتا ہے۔ اور آپ کا اصل زر بینک کے پاس محفوظ رہتا ہے۔ کیا یہ ربو نہیں؟ یہ سب ربو ہے اور قرآن کی رو سے ناجائز۔ خواہ اسے سود مفرد کے حساب شمار کیا جائے۔ یا سود مرکب کے حساب سے۔

جو کچھ ہم لیتے ہیں آپ غور کیجئے تو بادی تفتق یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ جو کچھ ہم دوسروں سے لیتے ہیں اس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً

(۱) عطیہ۔ اس میں نہ محنت کرنی پڑتی ہے نہ سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔ دینے والا اسے واپس لینے کے خیال کے بغیر تحفہ دیتا ہے۔ لہذا اسے لین دین کی مد میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ یہی صورت اس "صدقہ" کی ہے جسے کسی ضرورتمند کے لئے حسبہ اللہ دیا جاتا ہے۔ قرآن کی رو سے وہ ضرورتمند اس امداد کو معاشرہ کے بطور اپنے حق کے طلب کر سکتا ہے۔ اس لئے اس میں بھی لین دین کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(۲) اجرت۔ یہ محنت کا معاوضہ ہوتا ہے اس میں سرمایہ کچھ نہیں لگایا جاتا۔

(۳) اس ربو۔ اس میں دوسرے کو سرمایہ دیا جاتا ہے اور اس سرمایہ پر اصل سے زائد وصول کیا جاتا ہے۔ سرمایہ دینے والا محنت نہیں کرتا۔ بلکہ دوسرے کی محنت کا ایک حصہ وصول کر لیتا ہے۔

(۴) منافع و تجارت میں، اس میں سرمایہ بھی لگایا جاتا ہے۔ اور محنت بھی کی جاتی ہے۔

(۵) قمار۔ (رجو) اس میں نہ سرمایہ لگایا جاتا ہے نہ محنت کی جاتی ہے۔

رشق اول کو چھوڑ کر، آپ باقی شکلوں کو دیکھئے۔ جہاں معاوضہ محنت کا نہیں، اسے سترآن جائز قرار نہیں دیتا۔ اس کا اصول یہ ہے کہ معاوضہ محنت کا ہے۔ چونکہ یہ اصول لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا اس لئے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بیع کے منافع اور ربو

معاوضہ محنت کا ہے میں فرق کیا ہے؟ ایک شخص سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچتا ہے اسے دس روپے اصل زر سے زائد وصول ہو جاتے ہیں۔ دوسرا شخص کسی کو سو روپے قرض دے کر

اس سے ایک سو دس روپے وصول کرتا ہے اس سے اُسے بھی دس روپے اصل زر سے زیادہ ملتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ جب یہ دونوں، اصل زر پر زائد ہیں تو ان میں فرق کیا ہے؟ ذلک بانہتم قالوا لانا البیع مثل الربو (۱)۔ وہ بیع اور ربو کو ایک جیسا سمجھتے تھے لیکن سترآن کریم نے کہا کہ یہ ان کی بھول ہے۔ یہ دونوں ایک نوعیت کا معاملہ نہیں۔ بیع میں سرمایہ اور محنت دونوں صرف ہوتے ہیں۔ بیع

بیع اور ربو میں فرق | بدلے میں سرمایہ واپس آجاتا ہے۔ اور دوکان دار کو اس کی محنت کا معاوضہ۔
 سرمایہ کے علاوہ ملتا ہے۔ یہ حلال ہے کیونکہ یہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے۔
 لیکن ربو میں صرف سرمایہ لگتا ہے۔ محنت کچھ صرف نہیں ہوتی۔ لہذا اس میں جو کچھ زائد ملتا ہے وہ سرمایہ
 کا معاوضہ ہے جو حرام ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی رو سے اصول یہ ہے کہ
 (۱) محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے۔ اور

(۲) سرمایہ پر زائد لینا حرام۔

اگر تجارت میں بھی کوئی شخص، اپنی محنت سے زائد منافع لیتا ہے تو ربو ہے۔ کیونکہ یہ سرمایہ کا معاوضہ ہوگا۔
 محنت کا نہیں۔ اس بات کا تعین معاشرہ کرے گا کہ اس شخص کی محنت کا معاوضہ کیا ہونا چاہیے۔ وہ اس
 معاوضہ سے زیادہ منافع نہیں لے سکتا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بیع و تجارت میں انسان (RISK)
 لیتا ہے۔ یعنی اس میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ اور ربو میں (RISK) نہیں ہوتا۔
 لیکن حالت اور حرمت کے لئے یہ معیار تفریق صحیح نہیں۔ اگر کسی آمدنی کو حلال قرار دینے کی شرط (RISK)
 ہو تو جو اعلیٰ حلال ہونا چاہیے کیونکہ اس میں تو ہر داؤ میں (RISK) ہوتا ہے۔ بیع اور ربو میں فرق
 وہی ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے۔ بیع میں (راس المال) محنت کا معاوضہ، واپس ملتا ہے اور ربو
 میں (راس المال) راس المال کا معاوضہ، ملتا ہے۔ محنت کا معاوضہ حلال ہے۔ راس المال کا
 معاوضہ حرام۔

دشواریاں کیوں پیش آتی ہیں؟ | آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی رو سے ربو کا مسئلہ کس
 آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس میں جو دشواریاں آتی ہیں
 پیش آرہی ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ

(۱) ربو کی بہت سی شکلیں ایسی ہیں جنہیں قرآن کریم حرام قرار دیتا ہے لیکن (بدقسمتی سے) ہماری توجہ
 شریعت سے حلال قرار دیتی ہے۔ مثلاً زمین کی بٹائی (مزارعت) یا مضاربت۔ یعنی کاروبار میں ایسی شرکت
 جس میں ایک پارٹی محض سرمایہ پر منافع وصول کرتی ہے۔ یا تجارت میں جس قدر بھی منافع لیا جاسکے وغیرہ
 ہمارے ارباب شریعت سے برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم کر لیں۔ اس لئے وہ ربو کی
 تعریف ایسی کریں گے جس کی رو سے یہ شکلیں ربو کی شق میں نہ آسکیں۔

(۲) سرمایہ دار طبقہ، بلا محنت روپیہ حاصل کرنے کا اس قدر خوگر ہو چکا ہے کہ محنت کے تصور سے انہیں پسینہ آجاتا ہے۔ اس لئے وہ رہو کے لئے آنی تصور کی طرف آنا ہی نہیں چاہتے۔

(۳) اور سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام غیر تر آنی ہے۔ بجائے اس کے

کہ ہم اس نظام کو تر آنی نظام سے بدلیں، چاہتے ہیں کہ پیوند سازی سے کام نہیں چلے گا اس میں پیوند لگا کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیں کہ یہ تر آنی ہو گیا ہے۔ لیکن وہ پیوند اصل کے ساتھ فٹ نہیں بیٹھتا۔ اس لئے ہم کوشش یہ کرتے ہیں کہ اس میں کچھ کتر بیونت کر کے اسے کسی نہ کسی طرح اصل کے ساتھ چپکا دیا جائے۔ لیکن یہ کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ تر آنی نظام ایک غیر منقسم و ہمت ہے۔ اس میں غیر تر آنی پیوند کبھی فٹ بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے۔

(۱) زمین ذریعہ رزق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے (ہوا۔ پانی۔ روشنی کی طرح) نوع انسان کی پرورش کے لئے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ اس پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ امت کی تحویل میں رہے گی تاکہ وہ اس سے تمام افراد کو رزق پہنچانے کا انتظام کرے۔ زمین سے مراد ہے ہر وہ چیز جو زمین سے برآمد ہو۔ اس میں اناج اور مصنوعات کے لئے خام مواد سب آجاتے ہیں۔

(ب) اس نظام میں کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت (SURPLUS MONEY) رہ نہیں سکتی۔ اس لئے افراد کے لئے جائیدادیں کھڑی کرنے یا ویسے ہی روپیہ (INVEST) کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(ج) اس میں تمام افراد ملکیت کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری نظام پر عائد ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے کسی کا دست نگر نہیں ہونا پڑتا۔ لہذا اس میں سودی لین دین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(د) حقیقت یہ ہے کہ اس میں انفرادی تجارت کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس میں دوکاندارا شیا کے ضروریات تقسیم کرنے کی کجینسی ہوگا۔ اسے نفع اندوزی کا ذریعہ نہیں بنایا جائے گا۔ اس کی محنت کا معاوضہ نظام کی نظر سے ملے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس نظام میں رہو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقت

دو متضاد نظام یہ ہے کہ رہو سود کا نام نہیں۔ یہ تر جہاں ہے اس معاشی نظام کا جو قرآن کے معاشی

نظام کی یکسر ضد ہے۔ قرآنی نظام میں ہر فرد زیادہ سے زیادہ محنت کر کے کم از کم اپنے پاس رکھ کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دیتا ہے۔ غیر قرآنی نظام میں، ہر فرد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ محنت دوسرے کریں اور اسے بلا محنت زیادہ سے زیادہ ملتا جائے۔ یہ دونوں نظام اس قدر ایک دوسرے کی ضد ہیں کہ مترآن نے اس نظام کو "خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ" قرار دیا ہے۔ یہ نظام فی الواقع قرآنی نظام سے بغاوت ہے۔ اب اس کے بعد آپ یہ سوچئے کہ کیا یہ کسی طرح ممکن ہے کہ ہمارا نظام تو غیر مترآنی رہے اور ہم اس کے اندر رہتے ہوئے رہنے کے مسئلہ کا کوئی اطمینان بخش حل تلاش کر لیں۔ اس ستم کی کوشش ہم نے اس سے پہلے اپنے جاگیردار کی اور زمینداری دور (عہد عباسیہ) میں کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے زمین کی بٹائی۔ مضاربت تجارت میں غیر محدود منافع وغیرہ کو جائز قرار دے کر اپنے آپ کو فریب دے لیا۔ جو کوشش اب ہو رہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم بینکوں کے سود یا صنعتی اداروں کے حصوں پر منافع وغیرہ کو جائز قرار دے کر اپنے آپ کو فریب دے لیں۔ بینکوں کے سود وغیرہ کے سلسلے

بینکوں کے سود کی مخالفت میں اس وقت جو مخالفت قدامت پرست طبقہ کی طرف سے ہو رہی ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حضرات اسے اسلامی نظام معیشت کے خلاف پاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بینکوں کے سود کا مسئلہ اس وقت موجود نہیں تھا۔ جب ہماری فقہ مرتب ہوئی ہے۔ اسے اب "جائز کی فہرست میں داخل کرنا ان کے نزدیک "بدعت" ہے۔ اگر یہ شکل اس وقت موجود ہوتی تو جس طرح زمین کی بٹائی اور مضاربت وغیرہ جائز قرار دی گئی تھیں، لیکن ہے یہ بھی اسی فہرست میں شامل ہو جاتا۔ بینک کا سود تو بٹائی وغیرہ کے مقابلہ میں استحصال (EXPLOITATION) کی بہت نرم شکل ہے۔



اشتراکیت کی آڑ لیکن اس سلسلے میں سب سے جبری دشواری ایک اور ہے اور وہ یہ کہ ہمارے زمانے میں اشتراکیت (کمیونزم) نے ایک ایسے نظام کی طرح ڈالی ہے جو نظام سرمایہ داری کی ضد ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام اور اسلامی نظام کی بعض جزئیات کی باہمی مماثلت (یعنی ایک دوسرے سے ملنے جلتے ہونا) فطری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سچی حقیقت ہے کہ اشتراکی فلسفہ زندگی اسلامی فلسفہ حیات کی ضد ہے۔ اس چیز کو ہمارا قدامت پرست مذہبی طبقہ ایک مؤثر حربہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ۔

(۱) مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری کا گٹھ جوڑ شروع سے چلا آ رہا ہے۔ مذہبی پیشوائیت بجائے خویش۔ نظام سرمایہ داری ہی کی ایک شاخ ہے۔ نظام سرمایہ داری کی اصل دنیا دیہ ہے کہ محنت کے بغیر دولت حاصل ہو جائے۔ محنت نہ مذہبی پیشوا کرتے ہیں نہ سرمایہ دار، سرمایہ دار تو پھر بھی روپیہ لگا کر روپیہ حاصل کرتے ہیں۔ مذہبی پیشوا بغیر روپیہ لگائے دوسروں کی کمائی بٹور لیتے ہیں۔ یہ سرمایہ داری کی شدید ترین شکل ہے۔ لہذا مذہبی پیشوائیت کی طرف سے قرآنی نظام معاشی کی مخالفت فطری امر ہے۔

(۲) لیکن ان میں اتنی حیرت ہے نہیں کہ یہ کھلے بندوں قرآنی نظام کی مخالفت کریں۔ نہ ہی ان کے پاس ایسے دلائل ہیں جن کی رو سے یہ اس نظام کو خلاف اسلام قرار دے سکیں۔ لہذا یہ کرتے ہیں کہ

(۳) جوں ہی کسی نے قرآن کے معاشی نظام کا ذکر کیا انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ کمیونسٹ ہے اور چونکہ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے قرآنی نظام اور اشتراکی نظام کی بعض جزئیات میں مماثلت ہے اس لئے عوام اور سطح میں پڑھے لکھے لوگ فوراً ان کے فریب میں آ جاتے ہیں۔ اور ایسا کہنے والے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے اس پراپیگنڈے کا اثر یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ سینے میں درد مند دل رکھنے والے لوگ یہ کہتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ ملک میں بھوک اور افلاس کا علاج ہونا چاہیے کہ مبادا وہ کمیونسٹ نہ بھڑا دیتے جائیں۔ قرآنی نظام کی مخالفت کے لئے مذہبی پیشوائیت کا یہ حربہ بڑا کارگر ثابت ہو رہا ہے۔ عوام کی نگاہیں ظاہر میں ہوتی ہیں۔ انہیں یہ سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام اور اشتراکیت کے معاشی نظام کی بعض جزئیات میں مماثلت ہے۔ ان جزئیات کو پیش کرنے والا ضرور نہیں کہ اشتراکی ہو۔ وہ سچا مسلمان بھی ہو سکتا ہے۔ بنیادی فرق اسلام کے فلسفہ زندگی اور اشتراکی فلسفہ حیات میں ہے۔ اشتراکی فلسفہ حیات کا ملنے والا بیشک مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اگر اسلام کے معاشی نظام اور اشتراکیت کے معاشی نظام کے کسی جز کا باہم گر مائل ہونا، اسلامی نظام کے پیش کرنے والے کو کمیونسٹ بنا دیتا ہے تو اس اعتبار سے ہمارے تمام علمائے کرام کمیونسٹ ہیں۔ اس لئے کہ کمیونسٹ میں بھی سود ناجائز ہے اور یہ حضرات بھی سود کونا جائز قرار دیتے ہیں۔ اس سے یہ حضرات تو کمیونسٹ قرار نہیں پاتے لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی تو وہ ان حضرات کے نزدیک فوراً کمیونسٹ قرار پا جائے گا۔ اس لئے نہیں کہ زمین پر ذاتی ملکیت کی نفی اسلام کے خلاف ہے۔ بلکہ اس لئے کہ یہ حضرات اس پر ذاتی ملکیت کو جائز سمجھتے ہیں۔

یہ ہے وہ سب سے بڑی دشواری جو اس وقت ان مسائل کے صحیح حل کے راستے میں حائل ہو رہی ہے۔

اسلام اور اشتراکیت اگر اسلام اور اشتراکیت کے نظریہ ہائے حیات کے فرق کو پیش نظر رکھ کر ان کے معاشی نظاموں کا مطالعہ کیا جائے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے علامہ اقبال

نے جب سرفرانس رینگ ہسبند لکھا تھا کہ

اشتراکیت کا معاشی نظام + خدا = اسلام

تو اس سے ان کی یہی مراد تھی اور جب انہوں نے قائد اعظم سے کہا تھا کہ اگر ہندو اشتراکی نظام معیشت کو اپناتا ہے تو اسے ہندومت سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ لیکن اگر مسلمان اسے اپناتا ہے تو اس کا یہ اقدام اس خالص اسلام کی طرف جانے کے مراد ہو گا جو چودہ سو سال پہلے ظہور میں آیا تھا تو اس سے بھی ان کا یہی مطلب تھا۔

معاشی نظام اور فلسفہ زندگی کے فرق کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے کہ آج یہ بھی کہا جاتا ہے کہ

اگر ہم نے اشتراکی نظام معیشت اختیار کیا تو اس کی پابندیاں اور اس کا جبر بھی مقبول کرنا ہو گا۔ جس کے لئے شاید ہم میں سے اکثر تیار نہ ہوں۔

یہ "جبر" اشتراکی فلسفہ زندگی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر اس نظام کو اسلامی فلسفہ زندگی کے تابع اختیار کیا جائے تو اس میں جبر و استبداد کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔ اس کی عمارت انسانی ذات سے نشوونما دینے والی مستقل اقدار قانون مکافات عمل اور اخروی حیات پر ایمان کی بنیادوں پر کھٹی ہے اور ایمان میں جبر و اکراہ کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔ اسی ایمان کے تصور کا فقدان

اسلام میں جبر نہیں ہے جس سے اشتراکیت اور جبر و تشدد و لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔ اشتراکیت + خدا کے معنی یہ ہیں کہ اس معاشی نظام کو وحی خداوندی کی بنیادوں پر سنوارا اور ایمان کے ذریعہ مقبول اور اختیار کیا جائے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کی روشنی میں ہمارے نزدیک "ہمارے معاشی مسائل کے حل کا طریق یہ نہیں

کہ کبھی ملکیت زمین کے سوال کو زیر بحث لے آئے اور کبھی بینک کاری پر گفتگو کرنے کے لئے گئے اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے

یہ متعین کیا جائے کہ اسلام کا معاشی نظام ہے کیا۔

یہ کام ہمارے قدامت پرست طبقہ کے بس کا نہیں۔ اس لئے کہ

(۱) ان کے نزدیک وہ معاشی نظام جو عباسی ملوکیت کے زمانے میں مرتب ہوا تھا عین اسلامی نظام

۴۔

(۲) ان کی ذہنیت یہ قرار پا چکی ہے کہ جو بات اسلام کے نام سے متعارف ہو کر چلی آ رہی ہے اس پر

نظر ثانی نہیں کی جاسکتی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ

(۳) ان کے نزدیک قرآن کریم، دین میں واحد اور آخری سند نہیں۔

یہ کام ان لوگوں کے کرنے کا ہے جو قرآن کریم کو آخری سند اور حجت تسلیم کریں اور عصر حاضر کے اقتصاد تقاضوں پر ان کی نگاہ ہو۔

جب اس طرح پہلے متعین ہو جائے کہ اسلام کا معاشی نظام کیسا ہے تو اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ ہم اپنے موجودہ نظام سے، اسلامی نظام تک کس طرح تدریجاً پہنچ سکتے ہیں۔ یعنی پہلے منزل کا تعین کر لیا جائے اور اس کے بعد اس تک بتدریج پہنچنے کے طرق و وسائل پر غور کر کے، چلنا شروع کر دیا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ اسلامی نظام، اس کی حکمت بالغہ، اس کی انفرادیت اور اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے کے دعوے کی صداقت کو تعلیم کے ذریعہ آنے والی نسلوں کے دل و دماغ میں اس طرح جاگزیں کیا جائے کہ اس کا مطالبہ ان کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے اور وہ اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے اس طرح مضطرب و بیتاب ہوں جس طرح مچھلی پانی میں جانے کے لئے بے قرار ہوتی ہے۔

اگر ایسا نہ کیا گیا اور ہم ان مسائل کو فرداً فرداً لے کر انہیں اسی طرح بحث و نظر کا موضوع بناتے رہیں جس طرح اب تک بناتے چلے آ رہے ہیں۔ تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ ہم اپنے وقت اور توانائیوں کو ضائع کرتے رہیں، ان لوگوں کی طرح جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ فَخَبَطْتَ أَعْمَالَهُمْ فَلَا يَقِئُ لَهُمُ

يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَذُنَابُهُمْ وَهُمْ يَخِشَبُونَ... وَهُمْ يَخِشَبُونَ أَمْثَلُ يَخِشَبُونَ صُدَّعَاهُ (۱۰۵-۱۰۴) اور صل

مسئلہ جوں کا توں ہے۔ بینک کے سود کے مسئلہ ہی کو لیجئے۔ اگر آپ اس سود کو جائز قرار دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بے عنص کی کمائی کی اس فہرست میں ایک اور شق کا اضافہ کر دیتے ہیں جو قرآنی اصولِ معیشت کے علی الرغم ہمارے ہاں پہلے سے رائج چلی آ رہی ہے۔ مثلاً زمین کی پیداوار کی بٹائی، مضارت وغیرہ۔ اور اگر آپ بٹائی، مضارت وغیرہ کو جائز رکھ کر بینک کے سود کو جائز قرار دیتے ہیں تو آپ کا بینکنگ سسٹم

ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ دار طبقہ اپنا روپیہ بینک کے کاروبار میں لگائے گا ہی نہیں۔ لیکن اگر آپ وتر آن کا معاشی نظام اختیار کر لیتے ہیں تو اس میں اس قسم کی کوئی مشکل پیش ہی نہیں آئے گی۔ اس وقت افراد کے پاس فالتو دولت (SURPLUS MONEY) رہے گی ہی نہیں جو اس پر نفع کمانے کا سوال پیدا ہو۔ دولت کی تحویل میں رہے گی اور وہیں سے تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری ہوتی رہیں گی۔ ان ضرورت مندوں کی احتیاج سے فائدہ اٹھا کر نفع کمانے کا تصور تک بھی باقی نہیں رہے گا۔

یہ ہے اس مسئلہ کا اصلی حل۔

(فروری۔ ۱۹۶۷ء)



خدا اور سرمایہ دار

شائع شدہ اکتوبر ۱۹۶۶ء

پیرویز

ہشیار اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔۔۔ یہ ایک قدیم سلسلے اور حقائق نبی کے لئے عمدہ اور موثر طریقے۔۔۔
 قرآن کریم نے بھی بسط حقائق کو سمجھانے کے لئے اسی طریقے سے کام لیا ہے۔ یعنی وہ دو متضاد اشیا کو آمنے سامنے
 رکھ کر حقیقت کی وضاحت کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمُتُ
 وَلَا النُّورُ وَلَا الظُّلُّ وَلَا الْحُرُّ وَلَا يَدْرَعُونَ أَسْفَلَ وَلَا يَنْصُرُونَ وَلَا الظُّلُمُتُ وَلَا النُّورُ وَلَا
 الظُّلُّ وَلَا الظُّلُمُتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظُّلُّ وَلَا الظُّلُمُتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظُّلُّ وَلَا الظُّلُمُتُ وَلَا النُّورُ
 اور روشنی ایک جیسے نہیں ہو سکتے، سایہ اور دھوپ یکساں نہیں ہو سکتے۔ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ
 مَوَاتٌ (۲۱-۳۵)۔ اور مردہ اور زندہ بھی کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے، یعنی اگر آپ نے یہ سمجھا ہو کہ زندہ کے
 کہتے ہیں تو ایک مردہ پر غور کرو۔ جو جو بات مردہ میں نہیں ہوگی، جس میں وہ باتیں ہوں گی وہ زندہ ہوگا۔ یہی طریقہ
 اس نے دین کی حقیقت و ماہیت سمجھانے کے لئے اختیار کیا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ اگر تم یہ دیکھنا چاہو کہ دین
 کا پیغام اور اس کا نظام زندگی کیا ہے، تو اس پر غور کرو کہ دین کی مخالفت کس کس طبقہ کی طرف سے ہوتی رہی ہے۔
 جس طبقہ کی طرف سے دین کی مخالفت کی گئی تھی، دین اس نظام کی ضد تھا جس کا علمبردار وہ طبقہ تھا۔ اس ہم
 مطالعہ کے لئے اس نے ہمیں ان اذوں کی مرتب کردہ تاریخ کا محتاج نہیں رہنے دیا۔ قرآن کریم نے دین کی تاریخ

خود ہی مٹھوٹا کر کے ہم تک پہنچا دی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ خدا کے رسول ان انوں تک دین پہنچاتے رہے۔ اس سلسلہ کا آغاز اس نے حضرت نوح سے کیا ہے اور خاتمہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر۔ وہ بتاتا ہے کہ دین اپنی اصل دنیاویہ کے اعتبار سے شروع سے آخر تک ایک ہی رہا ہے۔ دین کے معنی ہیں ان انوں کے لئے نظام زندگی۔ اور اس کی مخالفت بھی شروع سے آخر تک ایک ہی قسم کے طبقات کی طرف سے ہوتی رہی ہے۔ یعنی ارباب حکومت، جو اپنی مرضی دوسروں پر چلانا چاہتے تھے۔ سرمایہ دار جو دوسروں کی کمائی پر تن آسانی اور تعیش کی زندگی بسر کرتے تھے اور مذہبی پیشوا بیت، جو خدا کے نام سے بن کر اول الذکر دونوں گروہوں کے مفاد کی حفاظت کرتے تھے۔ جب بھی خدا کا کوئی رسول آیا تو ان تینوں گروہوں نے اس کے پیش کردہ دین کی مخالفت کی۔ لہذا اگر آج بھی یہ دیکھنا ہو کہ خدا کا تجویز کردہ نظام حیات (دین) کیا ہے تو تعارف بالفہم کے اصول کے مطابق، اس کا معیار یہ ہے کہ جس نظریہ کی مخالفت ان گروہوں کی طرف سے ہو، سمجھ لیجئے کہ وہ دین کے مطابق ہے۔ اور جس کی تائید ان کی طرف سے ہو وہ دین کے خلاف۔

یہ نہایت واضح روشن اور تین اصول ہے۔ اور نہایت آسان اور سادہ طریق کار جس کی تائید خود قرآن کریم کرتا ہے۔ آئندہ اور ان میں یہ بتایا جائے گا کہ سرمایہ داروں کے گروہ نے کس طرح ہر رسول کی مخالفت کی، اور ہر ممکن کوشش کی کہ وہ نظام متشکل نہ ہونے پائے جس کے داعی انہیں کرامت تھے۔

”سرمایہ داروں کے لئے قرآن کریم میں دو اصطلاحات عام طور پر آئی ہیں۔

(۱) الْمَلَأُ، يَمْلَأُ، مَلَأٌ کے بنیادی معنی ہیں، کسی چیز کو بھر دینا۔ اس اعتبار سے الْمَلَأُ، ان لوگوں کو کہتے ہیں جن کے گھر فریادیں زندگی کی اشیاء سے بھرے ہوئے ہوں۔ جنہیں سامان زینت بڑی نرا دانی سے حاصل ہو۔ چونکہ غیر خداوندی نظام میں عزت اور ریاست کا سبب دولت ہوتی ہے اس لئے یہی لوگ قبیلہ یا قوم کے سردار بھی ہوتے تھے۔ اس لئے تبعاً یہ لفظ الْمَلَأُ، سرداران قوم کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اس سے بنیادی طور پر مراد سرمایہ دار طبقہ ہی تھا۔

(۲) مُتْرَفِينَ — وہ لوگ جو عیش و آرام کی زندگی گزار رہے ہوں۔ ایسے خوشحال لوگ جن کے پاس کثرت سے دولت ہو، اور اس بنا پر وہ بڑے خود سر ہو جائیں۔ قرآن کریم نے مُتْرَفِينَ کی وضاحت خود ہی کر دی ہے جہاں کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں قَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَكْثَرُ

وَمَا خُنُّ بِمُعَدِّ تَبِينٍ - (۳۴) جو کہتے ہیں کہ ہمارے اس بڑی کثرت سے دولت ہے اور ہمارا قبیلہ اور جتنا بھی بہت بڑا ہے۔ ہم جو جی میں آئے کریں میں کون سا لگا سکتا ہے۔؟

حضرت نوح

قرآن کریم بتاتا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ دین خداوندی کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ آسمانی دعوت انقلاب کے داعی اول حضرت نوح کے تذکرہ جلیلیہ کے ضمن میں کہتا ہے۔

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف پیغام بر بنا کر بھیجا۔ اس نے ان سے کہا کہ تم تو انہیں خداوندی کی محکو اختیار کرو۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی توت نہیں جس کی محکوئی اختیار کی جائے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا اور اپنی موجودہ روش پر اڑے رہے تو مجھے نظر آتا ہے کہ تم پر سخت تباہی آجائے گی۔

(۶۹)

آپ نے پیغام دیکھ لیا۔ یہ پیغام ساری قوم کے لئے تھا۔ لیکن قوم میں سے بھڑک کر کون سا طبقہ اٹھا؟

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ - (۶۹)

اس قوم کے دو تہذیب سرمایہ دار طبقہ نے کہا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تم عجیب اُلٹے راستے پر چل رہے ہو۔ رہیں ان روش پر چلنے سے اس قدر مال و دولت حاصل ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اسی سے ہم پر تباہی آجائے گی۔

سورہ ہود میں اس اجمال کی تفصیل دی گئی ہے جہاں کہا ہے کہ

اس پر قوم کے سرمایہ دار طبقہ نے کہا کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ تم ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو۔ تاہم ہم کیسے مان لیں کہ تم خدا کے رسول ہو، باقی رہے یہ لوگ جو تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں تو انکی حیثیت ہی کیا ہے؟ یہ ہم میں سے نچلے رُجج کے لوگ ہیں اور یہ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ انہوں نے تمہارا مسلک عقل و فکر کی رو سے اختیار نہیں کیا۔ یونہی بلا سوچے سمجھے تمہارے ساتھ ہوئے ہیں۔ ہمیں تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس میں تمہیں، ہمارے مقابلہ میں کوئی برتری حاصل ہو۔ لہذا ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ تم اپنے اس دعوئے میں جھوٹے ہو۔

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قوم کے غریب اور کمزور طبقہ نے اس دعوت پر لبیک کہا اور دو لہند اور طاقتور طبقہ نے اس کی مخالفت کی۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اس دو لہند طبقہ کی طرف سے یہ مطالبہ پیش کیا گیا کہ تم ان غریب اور نادار لوگوں کو دھتکار کر نکال دو تو پھر ہم تمہاری بات سننے کے لئے آمادہ ہو سکیں گے۔ اس پر حضرت نوح نے کہا کہ

تم اس پر غور کرو کہ میں تو کچھ تمہاری بھلائی کے لئے کرنا چاہتا ہوں، اس کے معاوضہ میں تم سے کوئی مال و دولت نہیں مانگتا۔ لیکن میں یہ نہیں کر سکتا کہ جو لوگ اس نظام کی صداقت پر ایمان لائے ہیں، انہیں اس لئے نکال باہر کروں کہ وہ غریب و نادار ہیں اور اس لئے تم انہیں ذلیل سمجھتے ہو۔ میں اگر تمہاری خاطر ان لوگوں کو دھتکار دوں، تو اس سے تم تو بے شک خوش ہو جاؤ گے، لیکن ذرا سوچو کہ قانون خداوندی کی رو سے اس جرم کی جو سزا مجھ پر وارد ہو جائے گی اس سے مجھے کون بچا سکے گا؟ ... تم جو یہ سمجھتے ہو کہ یہ لوگ جنہیں تم اپنے معیار کے مطابق ذلیل اور حقیر خیال کرتے ہو، خدا کی نظر میں بھی ذلیل اور حقیر ہیں، اور انہیں اس کے باں سے کوئی خوشگوار سی کا سامان نہیں مل سکتا یہ غلط ہے قانون خداوندی کی رو سے معیار عزت و تکریم اور استحقاق خیر و برکت انسان کے جوہر ذاتی ہیں، اس کی نگاہ کسی کے مال و دولت پر نہیں، بلکہ انسان کے دل پر ہوتی ہے۔ اگر میں تمہاری بات مان لوں، تو میں بھی تمہارے ہی جیسا ظالم ہو جاؤں۔ (۱۳۱-۱۳۹)۔

آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اس کا جواب کیا دیا؟ وہی جو ہر ایسا شخص جو دولت و قوت کے نشہ میں بہست ہو، دیا کرتا ہے۔ انہوں نے کہا

اے نوح ہم نے تم سے یونہی ذرا سی بات کی تھی اور تم ہو کہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے ہو۔ ہم تمہاری کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں۔ تم جس تباہی کی دھمکی دے رہے ہو، اسے لے آؤ۔ ہم دیکھیں کہ وہ ہمارا کیا بگاڑ لیتی ہے۔ (۱۳۲)۔

سورۃ الشعراء میں ہے کہ ان املائے قوم نے کہا کہ

اے نوح! تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا ہم تمہیں اپنا لیڈر تسلیم کر لیں اور اس طرح تمہاری اس جماعت میں شامل ہو جائیں جس میں سوسائٹی کے وہ لوگ شامل ہیں جو بناایت پست اور ذلیل ہیں اور ادنیٰ درجے کے کام کاج کیے تے ہیں۔ (وہ مزدور اور محنت کش ہیں۔ کیا ہم اس جماعت میں شامل

ہو کر ان لوگوں کو اپنا ہمسر بنالیں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ (۲۳۷)۔

اس پر حضرت نوح نے کہا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ میں معلوم کروں کہ یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ لوگ صداقت کو کس قدر تسلیم کرتے ہیں اور اس نظام کے قیام کے لئے کیا کرتے ہیں، جسے میں پیش کرتا ہوں۔ یہی ہمارے ہاں قدر و قیمت کے پیمانے ہیں۔ میرے نزدیک یہ غریب و نادار لوگ جو اس نظام کے قیام کے لئے میرے رفیق کار بنے ہیں، ان سردارانِ قوم سے کہیں زیادہ واجب اللہ ہیں جو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ (۲۳۶)۔

سورہ المؤمنون میں ہے کہ ان رؤسائے قوم نے، اپنے طبقہ کے دیگر افراد سے کہا کہ یاد رکھو! اس شخص سے بڑا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ تو ہم پر بالادستی (SUPERIORITY) حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنا نظام مسلط کر دے۔ اس کا (معاذ اللہ) دماغ چل گیا ہے۔ یہ پاگل ہو گیا ہے جو کہتا ہے کہ امیر و غریب سب ایک جیسے ہیں۔ تم چند دنوں تک انتظار کرو۔ اس کی یہ تحریک خود بخود ناکام ہو جائے گی۔ (۲۳۵)۔

لیکن آخر الامر ہو یا یہ کہ انہی ناداروں اور غریبوں کی جماعت محفوظ رہی اور وہ جو سامانِ زیست کی فراوانیوں سے اس قدر بدست ہو رہے تھے خرق ہو گئے۔

حق و باطل کی کشمکش کی اس پہلی کڑی کو بیان کرنے کے بعد قرآن کریم کہتا ہے کہ:-
اس سرگذشت میں تمہارے لئے، ہمارے قانونِ مکافات کی ہمہ گیری کی نشانیاں ہیں۔ اس کے واضح ہو جانا ہے کہ ہم غلط نظام کو کس طرح الٹا کر رکھ دیا کرتے ہیں۔ (۲۳۴)۔



حضرت ہود

قوم نوح کے بعد ہمارے سامنے قوم عاد کا تذکرہ آتا ہے جس کی طرف حضرت ہود مبعوث ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی قوم کے سامنے اسی انقلاب آفرین نظام زندگی (دین) کو پیش کیا جسے حضرت نوح نے پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں قَالَ اُمَّلَاؤُا الدِّينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ..... اس قوم کے بڑے بڑے سرمنوں نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی حاصل تھی، اور جو اس دعوت کی مخالفت کے لئے

اٹھ کھڑے ہوئے تھے کہا کہ

ہیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ تم عقل و ہوش کھو بیٹھے ہو۔ تم جو کہتے ہو کہ ہماری روش بہت ہی ہیرو

کی طرف لے جا رہی ہے، یہ سب جھوٹ ہے۔ (پہلے نیز ۲۳)۔

اس قوم کو رزق کی کس قدر فراوانیاں حاصل تھیں اور اس کے بل بوتے پر انہوں نے خلق خدا پر کس طرح گوارا عافیت تنگ کر رکھا تھا۔ اس کے ضمن میں قرآن کریم میں ہے کہ

حضرت ہودؑ نے ان سے کہا کہ ذرا دیکھو کہ تمہیں اس وقت سامانِ زینت کس قدر فراوان حاصل

ہے۔ مال مویشی کی کثرت، افراد قبیلہ کی بہتات، اہلباتے باغ، ان کی سیرابی کے لئے رواں

دواں چشمے۔ یہ سب خدا کے عطا کردہ ذرائعِ رزق ہیں جسے اس نے تمام انسانوں کی پرورش

کے لئے پیدا کیا تھا، لیکن تم اسے کمزوروں اور ناداروں پر ظلم کرنے کے لئے استعمال کرتے ہو

تمہاری حالت یہ ہے کہ تم اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے اونچی اونچی پہاڑیوں پر اس قسم کے

میموریل بناتے ہو جن کا کوئی مصرف نہیں۔ ان سے جلا نوعِ انسانی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا

ہے؟ اور تم بڑے بڑے ساز و سامان (اور اسلحہ وغیرہ) بناتے ہو۔ اس لئے نہیں کہ اس سے

ظلم کی روک تھام کرو۔ بلکہ اس لئے کہ کمزوروں پر تمہارے آہنی پنجے کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے

پائے اور تمہارا غلبہ و تسلط ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے۔ تم اس روش کو چھوڑ دو اور

قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ (سورہ ۱۳۸-۱۳۹)

اس طبقہ کی طرف سے اس کا ردِ عمل کیا تھا؟ قرآن بتاتا ہے کہ

انہوں نے یہ سب کچھ سنا اور نہایت طنز اور تحارت سے کہا کہ آپ کے اس وعظ کا شکریہ!

ہمیں اس کی ضرورت نہیں، ہمارے لئے تمہارا وعظ و نصیحت کرنا، نہ کرنا، یکساں ہے (خدا اور

اس کا تون مکانات، تباہیوں اور بربادیوں کا عذاب، جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو، یہ سب)

لگے زلزلے کے لوگوں کے من گھڑت افسانے ہیں۔ ہم پر کوئی تباہی نہیں آسکتی۔ (سورہ ۱۳۹-۱۴۰)

وہ کوئی جاہل اور گنوار قوم نہیں تھی۔ ان کے پاس

سننے کے لئے کان، دیکھنے کے لئے آنکھیں، اور سمجھنے سوچنے کے لئے دل و دماغ تھے۔

لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی کی اس طرح مخالفت کی تو ان کی سماعت و

بصارت و قلب ان کے کسی کام نہ آیا۔ ان کا علم و عقل انہیں اس تباہی سے نہ بچا سکے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ (۱۰۷)۔

حضرت ہودؑ نے ان سے کہا تھا کہ ”اگر تم نے اس غلط روٹن کو نہ چھوڑا، تو تمہاری جگہ ایک اور قوم آجائے گی جن کا نظام، تمہارے نظام کی ضد ہوگا“ (۱۰۸)۔ یہ ہے خدا کے قانون مکافات کی رو سے قوموں کے استبدال و استخلاف (SUCCESSION AND SUBSTITUTION) کا اصول جس کی رو سے وہ قوم جو غلط نظام حیات کی حامل ہو، تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جو صحیح نظام کی حامل ہو۔

حضرت صالحؑ

قوم عاد کے بعد ہمارے سامنے قوم ثمود آتی ہے جس کی طرف حضرت صالحؑ، دعوت انقلاب لے کر آئے تھے۔ وہ زبانہ گلہ بانی کا تھا۔ معیشت کا مارموشی تھے۔ اور ان موشیوں کی زندگی کا مارچراگا ہوں اور پانی کے چشموں پر تھا۔ اس قوم کے بالادست طبقہ نے ان ذرائع پرورتن کو اپنی ملکیت میں لے رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کمزوروں کے جانوروں کو ان میں گھسنے نہیں دیا جاتا تھا۔ ان کی پانی کی باری ہی نہیں آتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی اعتبار سے حضرت صالحؑ کا تعلق بھی اسی طبقہ سے تھا۔ لیکن انہوں نے ان کی اس باطل روش کے خلاف اعلان انقلاب کیا تو انہوں نے کہا کہ:-

يٰۤاَيُّهَا قَوْمِ لِمَ كُنْتُمْ فِينَا مَرْجُوًّا قَلِيلًا ۗ لِي هٰذَا (۱۰۹)

اے صالح! ہماری تو تمہارے ساتھ بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ تم تو ہماری امید کے مرکز تھے۔ تم یہ کیا کرنے لگ گئے؟

یہ کہنے والے کون تھے؟ وہی املکاء الذین استکبروا من قومہ۔ (۱۱۰) اس کی قوم کا وہ دولت مند طبقہ جس نے دھاندلی پھا رکھی تھی۔

اور حضرت ہودؑ نے ان سے کیا کہا تھا جس پر یہ ان کی طرف سے اس قدر مایوس ہو کر بگریٹے تھے؟ — انہوں نے کہا تھا کہ

دیکھو! خدانے تمہیں اس ملک میں کس قدر ممکن عطا کیا ہے۔ تم میدانوں میں محلات تعمیر کرتے ہو۔ پہاڑوں کو تراش کر اس میں مکانات بناتے ہو۔ تم خدا کی ان نعمتوں کو اپنے پیش نظر رکھو اور ملک میں مساومت برپا کرو۔ (۱۴۶)۔

پھر انہوں نے کہا کہ

ذرا سوچو کہ اگر تم نے اپنا معاشی نظام اسی قسم کا رکھا جس سے معاشرہ میں اس قدر ناہمواریاں پیدا ہو جائیں، تو کیا یہ آسائشیں اور فارغ البالیوں کی طرح رہنے دی جائیں گی۔ کیا تم ان لہلہاتے باغات اور چشموں میں، ان زر خیز زمینوں میں، ان نخلستانوں میں جہاں درختوں پر پھلوں کے نرم اور خوشگوار خوشے تہ بہ تہ لٹک رہے ہیں۔ اور ان قلعہ نامعلوموں میں جنہیں تم پہاڑوں کو تراش کر بڑی صنعت کاری سے بناتے ہو اور پھر اترتے ہو کہ یہاں تمہارا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح رہو گے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس غلط معاشی نظام کے باوجود یہ تمام خوشحالیاں علیٰ حالت قائم رہیں گی؟ (۱۴۶-۱۴۷)

اس پر انہوں نے وہی حربہ اختیار کیا جو ایلٹسی سیاست کے علمبردار اختیار کیا کرتے ہیں۔ یعنی انہوں نے حضرت ہود سے تو کچھ نہ کہا، کیونکہ ان کا خاندان بڑا تھا۔ لیکن ان کے متبعین کو جو غریبوں اور کمزوروں پر مشتمل تھے، دھمکانا شروع کر دیا۔

اس پر اس توہم کے سرش اکابرین نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی نے بدست کر رکھا تھا، عجات مومنین سے کہا۔ اور یہ وہ لوگ تھے جنہیں وہ اکابرین ان کے افلاس کی وجہ سے بہت کمزور اور حقیر سمجھتے تھے۔ کہ کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ صالح خدا کا رسول ہے؛ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم اسے ایسا تسلیم نہیں کرتے۔ (اس لئے تم خود سمجھ لو کہ جس روش کو ہم صحیح نہیں سمجھتے اس پر چلنے سے تمہارا کیا حشر ہوگا) (۱۴۷-۱۴۸)

جب یہ حربہ بھی کارگر نہ ہوا تو انہوں نے حضرت صالح سے مصالحت کی کوشش کی۔ اور ان سے پوچھا کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟ انہوں نے کہا کہ میں اس کے سوا اور کیا چاہتا ہوں کہ خدانے جو رزق تمام انسانوں کی پرورش کے لئے پیدا کیا ہے، اسے تمام انسانوں کے لئے کھلا رکھا جائے۔ ہر ایک کے مویشی چراگا ہوں میں چریں اور اپنی اپنی باری چشموں سے پانی پئیں۔ اس پر وہ راضی ہو گئے تو حضرت صالح نے کہا کہ مجھے اس کا

عملی ثبوت ملنا چاہیے کہ تم اس معاہدہ پر کاربند رہتے ہو۔ اس وقت تمہاری حالت یہ ہے کہ تم نے خدا کی زمین پر لکیریں کھینچ کر — یہ میری اور یہ تیری — کی تفریق پیدا کر رکھی ہے۔ اور پھر "میرا زمین میں میرے موشی چر سکتے ہیں اور تیری زمین میں تیرے" حالانکہ زمین میری اور تیری ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس مقصد کے لئے میرے اور تیرے موشیوں کی تفریق — یہ ایک اونٹنی ہے جسے یوں سمجھو کہ یہ نہ میری ہے، نہ تیری

هَذَا نَاقَةٌ لِلَّهِ — تَأْكُلُ فِي أَرْضِ اللَّهِ (۱۱)

یہ خدا کی اونٹنی ہے — جو خدا کی زمین میں چرے گی۔

اگر تم نے اسے اس طرح چرنے دیا، تو سمجھ لیا جائے گا کہ تم میرے تجویز کردہ معاشی نظام پر کاربند رہو گے لیکن اگر تم نے اسے اس سے روکا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم اس تبدیلی کو توارا نہیں کر سکتے اور اپنی روٹی پر قائم رہنا چاہتے ہو۔

فترانی نظام کی اساس

آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھئے کہ فتران کریم نے اپنے معاشی نظام کو کس طرح چار لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے — هَذَا نَاقَةٌ لِلَّهِ — تَأْكُلُ فِي أَرْضِ اللَّهِ — خدا کی زمین مخلوق خدا کی پرورش کے لئے — قرآن کریم میں جس چیز کی نسبت خدا کی طرف کی گئی ہے یعنی یہ کہا گیا ہے کہ وہ خدا کی ہے، اس سے مراد یہی ہے کہ وہ عام انسانیت کے لئے کھلی ہے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی۔ مثلاً اس نے کعبہ کو بیت اللہ (یا بیتی) — میرا گھر کہا ہے تو اس کی تشریح خود ہی یہ کہہ کر کر دی ہے کہ — بَيْتٌ رُضِعَ لِلنَّاسِ — (۱۲) وہ گھر جسے تمام نوع انسان کے لئے بنایا گیا ہے — مَثَابَةٌ لِّلنَّاسِ — (۱۳) عالمگیر انسانیت کا اجتماعی مرکز — بَيْتًا لِلنَّاسِ — (۱۴) تمام نوع انسان کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا ذریعہ — جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً ۖ بِالْعَاقِبَةِ ۚ وَالْبَادِ (۱۵) جس کے دروازے تمام انسانوں کے لئے — خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے ہوں — یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔ اسی طرح جب اس نے ارض اللہ کہا ہے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ وہ تمام نوع انسان (بلکہ ساری مخلوق کے لئے) ذریعہ پرورش ہے۔ معاشرہ کو

ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ خدا کے رزق سے تمام افراد کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ "خدا کی مخلوق اور خدا کی زمین" بیسے دین کے معاشی نظام کی اصل و بنیاد جس کا اعلان حضرت صالح نے کیا۔

قوم کے سرمایہ داروں نے لمنے کو تو اسے مان لیا لیکن جب دیکھا کہ غریبوں کے مویشی اور ان کے جانور سب ایک جیسے بنا دیئے گئے تو ان کے سینوں میں حسد و رقابت کی آگ بھڑک اٹھی۔

فَعَصَوْا وَكَأَنَّهُمْ اِنهوں نے عزم و غصہ سے پاگل ہو کر اس اونٹنی کو مار ڈالا۔ (سورۃ اعراف: ۱۳۶) اور اپنے اسی سا معاشی نظام کی طرف لوٹ گئے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ فَاذْكُرْ مَا كَانَتْ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بَدَا لَهُمْ فَمَوْعَاً۔ (سورۃ اعراف: ۱۳۷) خدا کا قانون مکافات عمل ان پر روڈ رولر (ROAD ROLLER) کی طرح پھر گیا۔ اور انہیں زمین کی سطح کے ساتھ ہموار کر کے رکھ دیا۔

خدا کے چہرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

قوم مدین

اسی طرح قوم مدین کی طرف حضرت شیث مبعوث ہوئے۔ اس قوم کی معیشت گلہ بانی بھی تھی اور کاروباری بھی۔ ان کے زرعی نظام کی کیفیت کیا تھی؟ اس کا اندازہ حضرت موسیٰ کے اس واقعہ سے لگائیے جو اس بستی سے باہر آیا پھر پیش آیا تھا۔

حضرت موسیٰ نے جب مصر سے بھاگ کر مدین کے قریب آئے تو وہ سستانے کے لئے ایک چشمے کے قریب درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ چشمے پر مویشی غٹا غٹ پانی پی رہے ہیں لیکن دولہ کیاں ہیں جو پیادے سے دور کھڑی ہیں۔ ان کے مویشی پیاس کے مارے قابو سے باہر ہوئے جا رہے ہیں لیکن وہ انہیں چشمے کی طرف جانے سے روکتی ہیں۔ حضرت موسیٰ کو اس پر تعجب ہوا کہ وہ انہیں پانی کی نظر جانے سے روکتی کیوں ہیں؟ چنانچہ ان کے دریافت کرنے پر لڑکیوں نے جواب دیا کہ

جب تک یہ چرواہے اپنی بکریوں کو پانی پلا کر نہ لے جائیں، ہم اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلا سکتے ہیں۔

اس لئے کہ یہ لوگ بڑے بڑے جھٹوں کے مالک اور صاحب قوت ہیں۔ اور ہمارے ہاں کوئی مرد نہیں۔ صرف ایک باپ ہے جو بہت بوڑھا ہے۔

حضرت موسیٰ نے دل میں کہا کہ — بہز میں نے کہرتیم آسماں پیدا ست — مہر سے بھاگاستا کہ وہاں فرعونوں کی بالادست قوم نے بنی اسرائیل پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ یہاں پہنچا تو معاملہ وہاں سے بھی زیادہ الم انگیز نظر آیا۔ وہاں ایک قوم دوسری قوم کو تنگ کرتی تھی۔ یہاں ایک ہی قوم کا ایک طبعتہ دوسرے طبقہ کو پانی کے چشمہ کے قریب نہیں آنے دیتا۔ یہ جی میں کہا اور اٹھ کر ان غریب لڑکیوں کی بکریوں کو خود پانی پلا دیا۔ اور پھر درخت کے نیچے آکر بیٹھ گئے۔ اور گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ (۲۸)۔ کہ

خدا ونا، یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

یہ تھی قوم مدین کی زرعی معیشت کی حالت۔ جہاں تک ان کی کاروباری زندگی کا تعلق ہے، ان کی کیفیت وہی تھی جو ہر سرمایہ دار قوم کی ہوتی ہے۔ حضرت شعیب نے ان کی یہ حالت دیکھی تو ان سے کہا کہ تمہیں چاہیے کہ اپنے معاشی نظام میں عدل برتو۔ ماپ تول کو پورا رکھو۔ لوگوں کے حقوق و واجبات میں کمی نہ کرو۔ اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد ناہمواریاں مت پیدا کرو۔ یہ سب کچھ تمہارے ہی بھلے کے لئے ہے، اگر تم یقین کرو تو۔ دیکھو! ایسا نہ کرو کہ زندگی کے ہر راستے پر راہزن بن کر بیٹھ جاؤ۔ جو لوگ صحیح نظام خداوندی کے قیام کے لئے اٹھیں، انہیں دھمکیاں دے دیکر اس راستے سے روکو اور انسانیت کی راہ میں پیچ و خم پیدا کرنے کے درپے رہو۔ (۸۵-۸۶)۔

شروع شروع میں انہوں نے، حضرت شعیب کی اس دعوت کو (SERIOUSLY) نہ لیا۔ اور ان سے صرف اتنا کہا کہ — اِنَّمَا اَنْتَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ (۱۸۵)۔ "ہیں ایسا نظر آتا ہے کہ تو بھی انہی میں سے ہے، جو اس فریب میں مبتلا ہو کر کہ خدا ان سے باتیں کرتا ہے، قوم کے مصلح بننے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔" انہوں نے زیادہ سے زیادہ یہ سمجھا تھا کہ یہ ایک مذہبی ریفارم ہے اس لئے اسے جس طرح یہ چاہتا ہے، اسی طریق پر صلواتی (پوجا پاٹ) ادا کرنے دو۔ اس سے ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہہ دیا کہ ہم تمہاری صلوات میں مزاحمت نہیں کریں گے۔ لیکن انہوں نے دیکھا کہ شعیب کے نزدیک "صلوات" سے مفہوم پرستش نہیں، کچھ اور ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سے کہا کہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا مَا يَتَّبِعُوْنَ اٰبَادُوْنَ اَوْ اَنْ تَفْعَلُوْا

فِيْۤ اَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ (۱۱۰)۔

تم جو کچھ کہتے تھے، اس سے ہم نے یہ سمجھا تھا کہ تم صرف پوجا پاٹ کا کوئی اپنا طریقہ لے کر آئے ہو اس لئے ہم نے تجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ ہم اپنے طریق پر پوجا پاٹ کرتے رہیں گے تم اپنے طریق پر کرتے رہو۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ معاملہ صرف پوجا پاٹ کا نہیں تیری صلوٰۃ صرف پرستش نہیں۔ یہ تو ہماری روزمرہ کی عملی زندگی کے ان شعبوں میں دخل ہو رہی ہے جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ کیا تیری صلوٰۃ تجھ سے یہ کہتی ہے کہ ہم ان معمولات کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے اسلاف کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور نہ ہی ہم جس طرح ہمارا جی چاہے دولت حاصل کریں اور جس طرح ہمارا جی چاہے اسے خرچ کریں۔ ہماری معاشی زندگی تمہاری مرضی کے تابع چلے۔ یہ انوکھی صلوٰۃ ہے!

ضنا آپ نے غور فرمایا کہ "مذہب" میں صلوٰۃ (نماز) کا کیا مفہوم ہوتا ہے اور "دین" میں صلوٰۃ کا مقصد کیا ہے؟ دین کی رو سے صلوٰۃ کا نظام، قوم کے معاشی نظام کو بھی اپنے دائرے کے اندر لئے ہوتا ہے۔ اسی نظام کے قائم کرنے کا حکم قرآن نے دیا تھا۔

بہر حال، جب قوم نے دیکھا کہ معاملہ آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور یہ تحریک ہی کچھ اور ہے تو انہوں نے دھکیاں دینی شروع کیں۔ قَالَ الْمَلَأُوا الدِّينَ

اس قوم کے سرمایہ دار طبقے نے، جو قوت کے نشہ میں بدمست ہو رہے تھے، کہا کہ اے شیعیب! دونوں باتوں میں سے ایک ضرور ہوگی۔ یا تو تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو پھر سے وہی قید کا مسلک اختیار کرنا ہوگا جسے چھوڑ کر وہ تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں، ورنہ ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو بستی سے نکال دیں گے۔ اب تم خود سوچ لو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ (۲۹)

قوم نے اپنی روشن کوٹہ چھوڑا اور اپنے غلط نظام کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئی۔ (۳۰)



صاحبِ ضربِ کلیم

اور داستانِ صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ تو ہے ہی۔ ملکیت، مذہبی پیشوا میت، اور نظامِ سرمایہ داری، تینوں کے خلاف بیک وقت دعوتِ مبارزت۔ فرعون، ملکیت کے استبداد کا مجسمہ۔

ہمان، مذہبی پیشوائیت کی رو باہ بازیوں کا نمائندہ — اور فارون، نظام سرمایہ داری کی ہوس خون آشامی کا پیکر۔ لیکن جہاں تک فرعون کا تعلق ہے، اس نے بھی اپنی ملکیت کے استحکام کے لئے قوم کو معیشت کے نام پر ہی اپیل کیا تھا جب کہا تھا کہ

اے میری قوم کے لوگو! سوچو کہ کیا یہ بہریں جو میرے انتظام کے ماتحت جاری ہیں، اور جن پر تمہاری معیشت کا دارومدار ہے، میری نہیں؟ (۲۳)۔

یہ درحقیقت قوم کو بہت بڑی دھمکی دی گئی تھی کہ اگر تم میں سے کسی نے اس داعی انقلاب کا ساتھ دیا تو اس پر نہروں کا پانی بند کر دیا جائے گا۔

فرعون کے ساتھ حضرت موسیٰ کے تصادم کی داستان الگ ہے اس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ جہاں تک نظام سرمایہ داری کے خلاف کشمکش کا تعلق ہے، قرآن کریم نے اس کے تذکرہ کی ابتدا ہی بڑے رمز آفرین انداز سے کی ہے جب کہا ہے کہ اِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مَوْسٰی فَبَغٰی عَلَيْهِمْ... (۲۳) فرعون تو ایک دوسری قوم کا آدمی تھا جس نے بنی اسرائیل کو اپنی محکومیت کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا، لیکن قارون خود قوم موسیٰ کا فرد تھا۔ یعنی نظام سرمایہ داری کی خون آشامی کی یہ حالت ہے کہ اس میں کوئی باہر سے آکر قوم کا خون نہیں چوستا۔ خود قوم کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو لوٹتا ہے۔ دوسری مصیبت یہ ہوتی ہے کہ غیروں کی غلامی کی لعنت ہر ایک ٹھوس کرتا ہے اور کسی بدترین غدار کے علاوہ کوئی ان کا ہمنوا نہیں ہوتا۔ لیکن سرمایہ داروں کی عین سامانیوں اور ترن آسانیوں کو دیکھ کر دوسرے لوگوں کے دل میں بھی ان جیسا بن جانے کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم بتاتا ہے کہ

ایک طرف وہ لوگ تھے جو تارون کو زندگی کی صحیح روش اختیار کرنے کی نصیحت کرتے تھے، اور دوسری طرف وہ تھے جن کے پیش نظر زندگی کی عمیش سامانیاں تھیں۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب قارون کو فرادیشان و شوکت سے باہر نکلتا تو وہ بڑی حسرت سے کہتے کہ اے کاش! جو کچھ تارون کو ملا ہے، وہ ہمیں بھی مل جاتا۔ یہ بڑا ہی خوش نصیب ہے (۲۴) جب قارون سے کہا جاتا کہ تم جو دوسروں کی محنت کی کمائی کو اس طرح غصب کر کے اتنی دولت اکٹھی کر رہے ہو، تمہیں اس کا کیا حق پہنچتا ہے؟ تو معلوم ہے وہ اس کا کیا جواب دیتا؟ وہی جواب جو ہر وہ

اور ہر قوم کے سرمایہ پرست کی طرف سے ملتا ہے۔ وہ کہتا۔ اِنَّمَا اُوْتِيْتُمُوهُ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِيْ۔ (پہلے) یہ دولت میں نے اپنی ہنرمندی اور چابک دستی سے حاصل کی ہے۔ اس لئے اس میں کسی دوسرے کا کیا حق ہے اور اس کی بابت مجھ سے کون باز پرس کر سکتا ہے؟

کیشمکش جاری رہی۔ اس کے بعد۔

جب قارون کی بدکرداریوں کے نتائج کے ظہور کا وقت آگیا۔ تو ہم نے اسے، اور اس کے مال و متاع سے بھرے ہوئے گھر کو تباہ کر دیا۔ اور اس وقت کوئی گروہ ایسا نہ نکلا جو قانون خداوندی کے مقابلہ میں اس کی مدد کر سکتا، نہ ہی اس سے خود ایسا ہو سکا کہ وہ اس تباہی سے بچ نکلتا (سرمایہ دار کی اقبال مندی کے زلزلے میں ایسا نظر آتا ہے کہ ایک لشکر ہے جو اس کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دے گا لیکن جب اس پر ادا ہوتا ہے تو ایک شخص بھی اس کا ساتھ دینے والا نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کی اپنی ہنرمندی اسے اس تباہی سے بچا سکتی ہے۔) (۲۸)



عدل داؤدی

حضرت داؤدؑ کے زلزلے میں عام معاشی نظام کس قسم کا تھا، اسے قرآن کریم نے ایک قصہ کی شکل میں بیان کیا ہے۔ نظام سرمایہ داری کی بنیاد اس پر ہے کہ بڑا سرمایہ چھوٹی پونجی کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اس طرح امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت داؤدؑ کے پاس ایک مقدمہ آیا جس میں۔

استغیث نے کہا کہ فریق ثانی میرا اپنا بھائی ہے۔ لیکن دیکھتے یہ بھائی ہو کر میرے ساتھ کڑا کیا چاہتا ہے۔ اس کے پاس ننانوے ذبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک ذبیہ جو میری معاش کا واحد سہارا ہے۔ اب بھائے اس کے کہ یہ اپنے غریب بھائی کی کچھ امداد کرے مجھ سے کہتا ہے کہ اپنی ایک ذبیہ بھی مجھے دیدو۔ چونکہ امیر آدمی ہے اور صاحب اثر بھی۔ اس لئے باتوں میں مجھے دبا لیتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔ یہ ہے

میرے اس بھائی کا میرے ساتھ برتاؤ۔ اب بتاؤ کہ کیا اس کا یہ مطالبہ جائز ہے؟ (۲۳)

یہ ننھا وہ غلط معاشی نظام جس کی اصلاح کے لئے حضرت داؤدؑ مامور ہوئے تھے۔ چنانچہ آپ کے کہہ دیا گیا کہ

تم بلا خوف و خطر اطمینان سے معاشرہ کی اصلاح کرو، ہم نے تمہیں حکومت عطا ہی ہے لئے کی ہے کہ تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے حق کے ساتھ کیا کرو۔ اور کسی کے خیالات اور جذبات کے پیچھے مت لگو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ لوگ تمہیں راہِ راست سے بہکا دیں گے۔ (۲۴)



حضرت عیسیٰ

مسیح انسانیت، حضرت عیسیٰ کی تو دعوت ہی ایک طرف "سود خوار یہودیوں" کے خلاف چلیج اور دوسری طرف رومیوں کی مستبد حکومت کے خلاف بغاوت تھی۔ لیکن سود خوار یہودی خود سلتے نہیں آتا تھا۔ جس طرح فرعون نے مذہبی پیشوا میت راہمان کو حضرت موسیٰ کے خلاف اٹھا کھڑا کیا تھا۔ اسی طرح سرمایہ دار یہودی ہیکل کے اجبار اور رہبان (علماء و مشائخ) آپ کے سلتے آئے تھے۔ اس آسمانی دعوت کی زد خود ان مذہبی پیشواؤں پر کس طرح پڑتی تھی اس کے متعلق انجیل برنباس کا ایک اقتباس دیدینا کافی ہوگا۔ اس انجیل کی فصل ۱۲۲ میں ہے۔

تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے خلاف مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ البتہ ہم پر یہ بہت بڑی مصیبت ہوگی۔ اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں تسلیم طریقے کے مطابق اصلاح کرنی چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ تقالید (رسومات) کو باطل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی پیشوا میت جہاں بھی ہو اس کا مسئلہ ہی نہیں ہوتا، معاشی ہوتا ہے۔ اور چونکہ دین خداوندی کسی ایسے شخص کو برداشت نہیں کر سکتا جو تمیزی کام کئے بغیر دوسروں کی کمائی پر

عیش اڑائے اس لئے مذہبی پیشوا بیت کی اس میں گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ یہ وجہ تھی کہ ہیکل کے احیاء و حیات حضرت عیسیٰ کی اس انقلاب آفرین دعوت کی اس شدت سے مخالفت کرتے تھے۔

آخری دور

جب حضور خاتم الانبیاء کی وساطت سے دین اپنی آخری اور مکمل شکل میں نوع انسانی کو دیا گیا تو نظام سرمایہ داری کے حاملین کی طرف سے اس کی مخالفت بھی انتہائی شدت تک پہنچ گئی۔ ہمارے ہاں کے مروجہ اسلام کی رو سے، جو ہمارے دورِ ملوکیت اور جاگیر داری کا وضع کردہ اور مذہبی پیشوا بیت کے ہمارے قائم ہے، نبی اکرم کی بعثت مقدسہ کا مقصد صرف اتنا ہی بتایا جاتا ہے کہ عہد جاہلیت میں عربوں میں شراب خوری جوئے بازی، باہمی جنگ و جدال، توہانہ رسومات عام تھیں۔ حضور ان قبیح رسوائی کی اصلاح کے لئے تشریف لائے تھے۔ وہ لوگ بت پرست تھے اور آپ سے شرک قرار دیتے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قریش مکہ اور ان کے ساتھ جملہ قبائل عرب نے جو اس دعوت کی مخالفت میں جانوں کی بازی لگا دی تھی تو کیا اس کی وجہ محض اتنی تھی کہ وہ ان عادات و رسومات کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ جو عام جنلاقی اصولوں کی رو سے بھی قابلِ مذمت اور درخورِ نفرت تھیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کی بت پرستی کے متعلق کہا جاسکتا ہے۔ تو اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہی قابلِ غور ہے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو تاکید کر دی تھی کہ ان کے معبودوں کو گالی مت دیں۔ لہذا ان کے اندازِ تبلیغ میں استعمال انگریزی کا عنصر موجود ہی نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ مسلمان غیر مسلموں کو ان کے مذہب سے (خواہ وہ بت پرست ہی کیوں نہ ہو) زبردستی روک نہیں سکتے تھے۔ تو پھر وہ کون سی بات تھی جس کی وجہ سے یہ سارا ملک اس دعوت کے خلاف میدان کارزار میں اتر آیا تھا۔ بالخصوص جب یہ جماعتِ مومنین مکہ چھوڑ کر مدینہ چلی آئی تھی تو پھر قریش کو کس بات کا خطرہ تھا جو انہوں نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور چھ سات سال تک مسلسل معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں۔

اس سوال کا جواب، ہمارا مروجہ مذہبی طبقہ دے نہیں سکتا۔ اس کا جواب، اللہ، ایک غیر مسلم نے

دیا ہے جس نے تاریخ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا تھا۔

بات یوں ہوئی کہ جب چین میں امریکہ کے پٹھو، چیانگ کانگ کائی شیک، کو کمیونسٹوں کے ہاتھوں بری طرح شکست ہوئی تو اس سے امریکہ کو جس قدر سخت اٹھانی پڑی وہ ظاہر ہے۔ اہل امریکہ تیراں اور متعجب تھے کہ ان کی اس قدر امداد کے باوجود چیانگ کانگ کائی شیک اس طرح خامس و نامراد کیوں رہ گیا۔ اس کی ریا خود اپنی سیٹا کی) اس ناکامی کی وجہ دریافت کرنے کے لئے اکثر امریکی دیدہ و در چین پہنچے۔ ان میں ایک نامور جرنلسٹ (JACK BELDEN) بھی تھا۔ اس نے وہاں کی سیاحت کے بعد ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا (CHINA SHAKES THE WORLD) وہ اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتا ہے کہ

تاریخ کے اس تختہ انگیز واقعہ (یعنی انقلاب چین) کے سبب و علل دریافت کرنے کے لئے

تو حکومت امریکہ اور امریکی پریس، نہ ہی امریکہ کے عوام اور ان کے وہ نمائندے جو مشرق بعید کے قونصل خانوں میں بیٹھے ہیں، نہ کاروباری حلقہ اور نہ ہی فوجی ادارے، اپنی نگاہ کو اپنے ذاتی یا قومی مفاد کی تنگ وادی سے آگے لے جاتے ہیں تاکہ وہ اہل چین کے درد آئیں اور جذبات سے لبریز قلوب تک پہنچ سکیں۔

اس کے بعد، بیلڈن اس انقلاب عظیم کی حقیقی وجہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

ان تمام لوگوں کو جو اس انقلاب کی صحیح علت معلوم کرنا چاہتے ہیں، محمد کے ان الفاظ کی یاد دلا دینا چاہیے جو وہ مکہ کے تاجروں سے کہا کرتے تھے کہ

كَلَّا بَلْ لَّا تَشْكُرُونَ الْيَتِيمَ ۚ وَ لَا تَحْضُونَ عَلٰی

طَعَامِ الْمُسْكِينِ ۚ

نہیں! تمہاری تباہی کی وجہ وہ نہیں جو تم سمجھے بیٹھے ہو۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تم اس شخص کو واجب التکریم نہیں سمجھتے تھے جو معاشرہ میں تمہارے جیسے اور ایک دوسرے کو اس امر کی تکفین نہیں کرتے تھے کہ جس کی چلتی گاڑی ٹرک جیسے اس کی روٹی کا بندوبست کرنا ضروری ہے۔

یہ تھا آپ کا وہ انقلاب آفرین پیغام جس کی وہ لوگ مخالفت کرتے تھے۔ آپ ان کے پورے کے پورے معاشرتی اور معاشی نظام کو بدلنا چاہتے تھے۔ قریش بہت بڑے تاجر تھے۔ اتنے بڑے کہ (قرآن کے الفاظ میں)۔

رِحْلَةُ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ (۱۱۳)

ان کے کاروان تجارت سردی، گرمی، سارا سال۔ رواں دواں رہتے تھے۔

ایک طرف تجارت، اور دوسری طرف کعبہ کی تولیت۔ اس سے ان کا پورا معاشی نظام سرمایہ داری پر متفرع تھا۔ اور اس داعی انقلاب کا پیغام، اس نظام کو ختم کرنے کا مدعی تھا۔ وہ اس کی اس طرح مخالفت نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟ ان سرمایہ داروں کے سب سے بڑے نمائندہ، ابو جہل نے، جب غلاف کعبہ کو تھا کہ اس تحریک جدید کے خلاف اپنے معبودوں سے فریاد کی ہے تو اس میں اس نے کہا یہ تھا کہ یہ پیغام وہی ہے جو فارس میں ابھی ابھی مزدک لایا تھا۔ محمد کو یہ سبق (معاذ اللہ) سلمان پارسی نے پڑھایا ہے۔

ایں مسادات، این مواخات اعجمی است

خوب می دایم کہ سلماں مزدکی است

انہوں نے حضور کے ساتھ منافقت کی صورت پیدا کرنے کے لئے اپنا جو نمائندہ بھیجا تھا اس کی نمایاں خصوصیت

یہ تھی کہ وَ جَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا (۱۱۴) اسے بڑی فراوان دولت حاصل تھی۔ ان مخالفین

سے جب کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم نے اپنی روش نہ چھوڑی تو تمہارا حشر کبھی وہی ہوگا جو تم سے پہلے تمہاری جیسی

قوموں کا ہوا تھا۔ وہ تم سے بھی زیادہ مال و دولت اور قوت و حشمت کی مالک تھیں ان کی بڑی بڑی بستیاں

تھیں (۱۱۵) جن کے اب صرف کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں۔ (۱۱۶) اس لئے تم جو اپنے مال و دولت پر

اترا تے ہو، تو تمہارا انجام بھی انہی جیسا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ خدا کا اٹل فیصلہ ہے کہ

جو شخص مال اور دولت جمع کرتا ہے اور پھر ننانویں کے پھیر میں پھنس جاتا ہے تو اس کا انجام

تباہی ہوتا ہے۔ (۱۱۷)

تم رتب کعبہ کی طرف نسبت رکھنے سے اس قدر مفاد حاصل کرتے ہو کہ نہ نہیں بھوک کا ڈر سنا ہے،

نہ کسی قسم کا خوف و خطر لاحق ہے۔ تو تمہیں چاہیے کہ محکومیت بھی اسی رتب کی اختیار کرو (۱۱۸) لیکن

انہوں نے ایک نہ سنی اور اپنی مخالفت میں تیز سے تیز تر ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ جب ان کی بلاکت پڑنے

کے انجام کی ہر تصدیق ثابت ہو گئی تو قرآن کریم نے ان کے نمائندہ (ابولہب) کا نام لے کر ان کی تباہی

سلسلہ میں کہا کہ مَا آغْنِي عَنْهُ مَالُهُ وَا كَسَبَ (۱۱۱) اس کا اس قدر مال و دولت جو اس نے حاصل کر رکھا تھا، اس کے کسی کام نہ آیا۔

”قرآن کا معاشی نظام“ سر دست میرا موضوع نہیں۔ میں اس عنوان پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ (نظام رلوبیت، اس موضوع پر میری مستقل تصنیف ہے)۔ قرآن کریم کا مطالعہ اس نگاہ سے کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام، نظام سرمایہ داری کے خلاف کھلا ہوا چیلنج ہے۔ اور جو دین (نظام زندگی) و پیش کرتا ہے، اس کی مخالفت کے اقنوم ثلاثہ (ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، اور سرمایہ داری) میں سرمایہ داری کو برابر کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس نے دماغ الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ

(اس باب میں ایک اصولی حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھو۔ اور وہ یہ کہ، کوئی قوم اور سستی ایسی نہ تھی کہ اس میں ہم نے اپنے رسول کو بھیجا ہو جو انہیں ان کی غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا تھا۔ اور وہاں کے آسودہ حال دولت مند سرمایہ دار طبقہ (مترنین) نے اس کی مخالفت نہ کی ہو۔

وہ کہتے یہ تھے کہ ہمارے پاس مال و دولت کی فراوانی ہے اور ہمارا جتھہ بھی بہت بڑا

ہے۔ اس لئے کس کی مجال ہے جو ہمارا بال بھی بیکا کر سکے۔ (۱۱۲)

یعنی اس وقت تک جو بات جزء جزء بیان ہو رہی تھی، قرآن کریم نے اسے ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کر کے، دین اور نظام سرمایہ داری کے باہم متضاد اور نقیض ہونے کی حتمی شہادت ہم پہنچا دی۔ یعنی خدا کی طرف سے جہاں اور جب بھی دین آیا، مترنین نے اس کی مخالفت کی۔ اس میں کوئی استثنائے نہیں۔ ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایسا ہی ہوا۔ ان کے پاس ان کی اس مخالفت کی دلیل فقط یہ ہوتی تھی کہ نظام سرمایہ داری ہمارے آبا و اجداد سے متواتر چلا آرہا ہے۔ ہم اس سے ہٹ نہیں سکتے۔

اور ہی طرح ہم نے کسی سستی میں اپنا رسول نہیں بھیجا کہ وہاں کے دولت مند طبقہ (مترنین) نے

یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے سلاف کو جس راستے پر چلتے دیکھا ہے، ہم اس راستے سے ایک

قدم بھی ادھر ادھر ہٹنے کے لئے تیار نہیں۔ (۱۱۳)

سورۃ انبیاء میں ان لوگوں کے انجام کو بڑے ڈرامائی انداز میں سامنے لایا گیا ہے، جہاں قرآن کی مخاطب

قوم سے کہا گیا ہے کہ

اگر تم اپنی زندگی کا نقشہ قرآن کے مطابق مرتب کر لیا تو تمہیں عظمت اور بلندی حاصل ہو جائیگی۔ اگر اس کے خلاف چلے تو تم بھی اسی طرح تباہ ہو جاؤ گے جس طرح تم سے پہلے کتنی ایسی قومیں تباہ ہو گئیں جنہوں نے ظلم اور نا انصافی پر کمر باندھ رکھی تھی۔ وہ تباہ ہو گئیں اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔

ان کی غلط روش کے نتائج غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں ان کے انجام سے آگاہ کیا جا رہا تھا کہ وہ اس روش سے باز آجائیں۔ لیکن وہ اس تنبیہ پر کان نہیں دھرتے تھے۔ چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ جب وہ محسوس طور پر سامنے آئے تو وہ اس تباہی سے بچنے کے لئے لگے بھاگنے۔

لیکن اس وقت بھاگنے کا کون سا موقع تھا۔ چنانچہ ہمارے قانون مکافات نے انہیں للکارا اور کہا کہ اب بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو۔ مت بھاگو۔ اب لٹے پاؤں اپنی اپنی عیش سامانیوں کی طرف چلو (مَا أَشْرَفْتُمْ فَيْدٍ) جن کی سرشاریاں ہمیں اس قدر مدہوش کئے ہوئے تھیں۔ اور اپنے ان مملات کی طرف پلٹو جن کے اندر تم اپنے آپ کو اس قدر محفوظ تصور کیا کرتے تھے۔ وہاں چلو، تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنا تھا اور تمہارا اس پر کیا حق تھا۔ ؟ (۱۱۷)

قوموں کی تباہی کے سلسلہ میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جب کسی قوم کی بربادی کے دن قریب آجاتے

ہیں۔ تو

اس کا سرمایہ پرست طبقہ ہوس زرا ندوزی میں حدود فراموش ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت اس قوم پر بری طرح مسلط ہوتی ہے اور وہ صحیح روش زندگی کو چھوڑ کر غلط راہیں اختیار کر لیتی ہے۔ تو پھر وہ اس طرح ہلاک ہو جاتی ہے کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ (۱۱۷)

سورہ ہود میں ہے کہ تم اقوام گذشتہ کے احوال و کوائف پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ اس سے تم کس نتیجہ پر

پہنچتے ہو۔ کیا اس نتیجہ پر نہیں کہ

جو لوگ تباہی سے بچ جاتے ان میں سے بعد میں محدودے چند ایسے رہ جاتے جو اپنے مفاد کو تو انہیں خداوندی کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور لوگوں کو ناہمواریاں پیدا کرنے سے

روکتے۔ ورنہ باقیوں کا تو یہ حال ہو جاتا کہ وہ اپنی تن آسانی اور مفاد پرستی کے پیچھے لگتے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لیتے، تاکہ ان کی عیش سامانیوں میں فرق نہ آنے پائے۔ (خواہ باقی انسانوں پر کچھ ہی کیوں نہ گزرے) یہ کہتے ان کے وہ جرائم جن کی بنا پر ان کی بربادی ہوتی۔ (۱۱۶)۔

توہم کی تباہی کے وقت سب سے زیادہ عذاب اسی سرمایہ دار طبقہ پر وارد ہوتا ہے۔ اس لئے کہ غریبوں کے پاس ہوتا ہی کیا ہے عین کے لئے کا نہیں ڈر ہو۔

حَتَّىٰ إِذَا آخَذْنَا مَثَرًا فِيهِمْ بِالْعَذَابِ إِذَا هُمْ يَجْرُونَ ﴿۲۳﴾
 تا آنکہ اس قوم کا رزق الحمال، سرمایہ دار طبقہ عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے، اور وہ کس
 بری طرح سے چینیختا چلاتا ہے

﴿۲۳﴾

قول فیصل

قرآن کریم کی تصریحات آپ کے سامنے آچکیں۔ ان سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ دین خداوندی کی رو سے سرمایہ پرستی کی پوزیشن کیا ہے۔ لیکن اگر آپ کو اب بھی کسی قول فیصل کا انتظار ہے تو اسے بھی سن لیجئے جہنم کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور اس میں پڑے ہوئے لوگ چیخ چلا رہے ہیں۔ پوچھنے والا پوچھتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں اور انہوں نے کیا جرم کیا تھا جو یہ اس قدر شدید عذاب میں مبتلا ہیں؟ سوال آپ نے سن لیا۔ اب جواب ملاحظہ فرمائیے۔ کہا کہ

إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مُتْرَبِينَ ﴿۲۵﴾

یہ سابقہ سرمایہ داروں کا طبقہ ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد اس موضوع پر کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔

ہم نے دیکھ لیا کہ جو دین (نظام زندگی) خدا کی طرف سے آتا تھا۔ ہر دور اور ہر قوم میں سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوتی تھی۔ اس آیت جلیلہ کو ایک بار پھر سامنے لایئے جسے قرآن کریم نے

بطور کلی بیان کیا ہے کہ

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ قَدِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَاهِنُونَ ۝ (۳۳)

کوئی بستی بھی ایسی نہ تھی کہ اس میں ہم نے اپنا رسول بھیجا ہو اور اس کے سرمایہ دار طبقہ نے اس کی مخالفت نہ کی ہو۔

مذہب اور سرمایہ داری

جب تک وہ دین اپنی شکل میں باقی رہتا، نظام سرمایہ داری کے حاملین کی پیشینہ چلتی۔ لیکن اس کے بعد وہ دوسرا حربہ اختیار کرتے۔ وہ اسی دین کے نام لپواؤں میں سے مفاد پرست گردہ کو اپنے ساتھ ملا لیتے۔ وہ اس دین کو مسخ کر کے اسے مذہب کی سطح پر لے آتے اور یہ مذہب، نظام سرمایہ داری کا سب سے بڑا حامی بن جاتا۔ یوں سادہ لوح انسان (عوام) خدا کے نام پر اس فریب میں آجاتے جس طرح نظام سرمایہ داری دین کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا، اسی طرح نظام سرمایہ داری، مذہب کی حمایت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، محنت کش طبقہ کو معاشی طور پر کتنا ہی مجبور و معذور کیوں نہ کر دیا جائے وہ "بطیب خاطر" کبھی بھی اس پر رضامند نہیں ہو سکتا کہ اس کی محنت کی کمائی دوسرے لوٹ کر لے جائیں۔ یہ فرضیہ مذہب پرست طبقہ انجام دیتا ہے۔ وہ غریبوں کو یہ کہہ کر انیون پلٹاتا رہتا ہے کہ یاد رکھو! رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، وہ جسے چاہے لاکھوں کر ڈروں دے جسے چاہے فقیر بے نوا کر دے۔ امیر دل کی دولت پر حسد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ تم خدا کی تقسیم کے خلاف خنجر کرتے ہو۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ انسان کو ہمیشہ راضی برضا رہنا چاہیے۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ یہ مال و دولت یہ جائیدادیں اور محلات، سب آتی اور فانی ہیں، اصلی زندگی آخرت کی ہے، اور آخرت کی جنت غریبوں کے لئے ہے۔ خود حضور شہنشاہ و عالم نے اپنے لئے غریب پسند کی کھٹی اور الفقر خنصری فرمایا تھا۔ یعنی یہ کہ غریب میرے لئے باعث فخر ہے۔ آپ خدا سے ہمیشہ دعا کرتے رہتے تھے کہ مجھے غریبوں میں رکھو اور غریبوں میں اٹھائو! اسلام غریبوں میں پیدا ہوا اور غریبوں ہی میں باقی رہے گا۔ مذہب پرست طبقہ یہ اور

۱۔ یہ طبقہ اس قسم کی روایات (بلکہ آیات) کو ان کے حقیقی مفہوم سے الگ کر کے اپنے مطلب کے مطابق پیش کرتا ہے۔

ہں قسم کی اور مقدس باتیں دن رات غریبوں اور محنت کشوں کے کان میں ڈالتا رہتا، اور اس طرح انہیں ان کی حالت پر شاکر رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ یوں نظام سرمایہ داری کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ مذہب پرست طبقہ خود تو کوئی کمائی کرتا نہیں۔ ان کی اس "خدمتِ جلیلہ" کے معاوضہ میں، سرمایہ دار طبقہ ان کی کفالت اپنے ذمے لیتا ہے۔

اسلام کے ساتھ کیا ہوا؟

جو کچھ سابقہ انبیائے کرام کے لئے ہوئے دین کے ساتھ ہوا، وہی اسلام کے ساتھ ہوا۔ حضور نبی اکرم نے جس دین کو پیش کیا، سرمایہ دار طبقہ نے اس کی مخالفت کی۔ لیکن ان کی مخالفت کے علی الرغم یہ دین علی شکل میں قائم ہو کر رہا۔ اور اس طرح ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری کے ابلیس شکست کھا کر پہاڑوں کے غاروں میں جا چھے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے وہاں سے پھر سر نکالا اور اسی سازش کہن کے مطابق جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے، مذہبی پیشوائیت نے اس دین کو خود ساختہ مذہب میں تبدیل کر دیا۔ اب بادشاہوں کے لئے مساجد کے منبروں سے آیتا اللہ بنصوحہ اور خلد اللہ ملکہ کی دعائیں مانگی جانے لگیں۔ اور سرمایہ داروں کو یہ کہہ کر بد لگام چھوڑ دیا گیا کہ اگر تم بادشاہ کو اس کا شکیں اور ہمیں ہمارا شکیں (زکوٰۃ) دیدیا کرو تو پھر ہمیں اجازت ہے کہ جس قدر چاہیں دولت جمع کر لو اور جتنی جی چاہے جائیدادیں کھری کر لو۔ اس "مذہب" کی تائید میں روایات وضع کی گئیں اور تاریخ کو مسخ کر کے، اور تو اور خود صحابہ کبار کو بڑے بڑے سرمایہ داروں کی شکل میں دکھا دیا گیا۔ یہی مذہب، اس وقت تک ہمارے ہاں مرد ج چلا آ رہا ہے جو دین کی ضد ہے۔ سرمایہ دار طبقہ نے ہمیشہ دین کی مخالفت کی تھی۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے مرد جب مذہب کا سب سے بڑا حامی یہی سرمایہ دار طبقہ ہے۔ کہیں یہ عظیم الشان مسجدیں بنوا رہے ہیں۔ کہیں ان مساجد کی تزئین و آرائش پر ہزاروں روپے خرچ کر رہے ہیں۔ ملک کے ہزاروں دارالعلوم اور مکتب انہی کے روپے سے چلتے ہیں اور ائمہ مساجد اور علمائے کرام کی روزی کے یہی کھن ہیں۔ مذہب کے نام پر بڑی بڑی جماعتیں انہی کے بل بوتے پر بڑھتی اور کھلتی پھولتی چلی جاتی ہیں نقطہ یہ ایک بات کہ سرمایہ دار طبقہ ہمارے مرد جب اسلام کی حمایت کرتا ہے، اس حقیقت کے اثبات کے لئے دلیل محکم ہے کہ یہ اسلام، پھر حال وہ دین نہیں، جو خدا کی طرف سے بوساطت محمد رسول اللہ

دنیا کو ملا تھا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ وہی دین ہے تو اس سے (معاذ اللہ) خدا کی یہ شہادت جھوٹی ثابت ہوتی ہے کہ

دین جہاں بھی ہوگا، سرمایہ دار طبقہ اس کی مخالفت کرے گا۔

سرمایہ دار طبقہ ہمارے مردِ جاسلام کی اس قدر حمایت کرتا ہے اور اس اسلام کے علمبردار اسے اس کی حسن خدمت کے عوض جنت کے پروانے عطا کرتے رہتے ہیں۔ مردِ جاسلام کی رُوس سے جنت کس قسم کے کاموں کے عوض ملتی ہے؟ تعمیر و ترمیمِ مساجد، اشاعتِ دین، "کے لئے مالی امداد، صدقات و خیرات، زکوٰۃ، حج، بڑی بڑی زرگاہوں کی تعمیر و آرائش، نذر نیاؤں وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ثواب کے یہ کام صرف دو لختہ طبقہ ہی سرانجام دے سکتا ہے۔ غریبوں میں اتنی استطاعت ہی نہیں ہوتی اس لئے، اس مذہب کی رُوس سے دنیا بھی سرمایہ داروں کے لئے ہوتی ہے اور آخرت بھی سرمایہ داروں کے لئے۔ یہی ہے وہ ذہنیت جسے نمایاں طور پر سمجھانے کے لئے قرآن کریم نے سورہ کہف میں، اپنے تمثیلی انداز میں، دو آدمیوں کا ایک قصہ بیان کیا ہے۔ اس میں، سرمایہ دار کو اس کا دوست سمجھاتا ہے کہ تم ساز و سامانِ حیات کی اس فردانی پراستزاد نہیں۔ اس وقت تو تم بے شک اپنے آپ کو محفوظ و مصنون سمجھتے ہو، لیکن قیامت میں تمہارا انجام کیا ہوگا۔ کبھی اسے بھی سوچا ہے؟ اس کے جواب میں یہ کہتا ہے کہ

میرے بھائی! تمہاری یہ باتیں محض داہمہ ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کی گھڑی جس سے تو مجھے ڈرتا ہے، کبھی آئے گی۔ لیکن بغرض حال، اگر ایسا ہوا بھی اور مجھے خدا کے حضور جانا ہی

پڑا تو مجھے وہاں بھی اس سے بہتر ٹھکانا ملے گا۔ (۱۱۱)

"میں نے کئی مسجدیں تعمیر کرائی ہیں۔ ہر مسجد کے عوض مجھے جنت میں ایک مکان — اور وہ بھی یا تو

اور مرد کا — الاٹ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ، صدقہ و خیرات کے اکثر کام کرتا رہتا ہوں۔ میں نے کئی حج کئے ہیں۔ اور یہ تو تم جانتے ہو کہ حج کرنے سے انسان ایسے ہو جاتا ہے جیسے آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ یعنی اس کے تمام سابقہ گناہ دھل جاتے ہیں۔ میں زکوٰۃ بھی نکالتا ہوں۔ اور زکوٰۃ سے باقی مال بالکل پاکیزہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے قیامت میں نجات اور بخشش میرے لئے مقدر ہو چکی ہے۔ جس کی قسمت میں خدا نے یہاں عیش لکھا ہے وہ وہاں بھی عیش ہی کرے گا۔ یہ ہے جنت کی وہ ضمانت جو سرمایہ دار کو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ملتی رہتی ہے اور جس کے لئے انہوں نے وضعی روایات کا ایک انبار اپنے ہاں

محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔

لیکن **بِتَرَا الْخُحُنْدُ** کہ خدا کی کتاب ہمارے پاس اپنی ہمہ تن شکل میں محفوظ ہے۔ لہذا ان لوگوں کا خود ساختہ مذہب اور اس کی تائید میں وضعی روایات و تفاسیر و تشریح کی اس شہادت کو کہاں تک چھپا سکیں گی کہ سرمایہ دار طبعت کی طرف سے ہمیشہ دین کی مخالفت ہوگی۔

یعنی دین اور نظام سرمایہ داری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اور جب حقیقت یہ ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ سرمایہ داروں کی اس جنت میں باریابی ہو سکے جو اتباع دین کا فطری نتیجہ ہے۔ "دینداری" کے وہ کام جن کے عوض مذہبی پیشوائیت، سرمایہ داروں میں جنت کے پرولے تقسیم کرتی رہتی ہے، دین کی میزان میں ان کا وزن کیا ہوتا ہے؟ اسے بھی تشریح کی زبان سے سن لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس قسم کے "ثواب" کے کام — مثلاً حاجیوں کے لئے سبیلیں لگا دینا یا خانہ کعبہ کی ترمیم و آرائش کا سامان مہیا کر دینا — اس شخص کے اعمالِ حیات کے برابر ہو جائیں گے جو نظامِ خداوندی کی بنیادی حقیقتوں (خدا اور آخرت) پر ایمان رکھتا ہے اور پھر اس نظام کے قیام و استحکام کے لئے (جسے سبیل اللہ کہا جاتا ہے) مسلسل جدوجہد کرتا ہے؟ اگر تم اپنے ذہن میں ایسا خیال کئے ہو، تو گرتے رہو۔ خدا کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے؟ (۹)

اس قسم کے عبادت گزاروں کے متعلق کہا گیا ہے کہ

ان ریاکار نمازیوں کا انخجام تباہی ہے جو اس طرح کی پرستش سے لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں اور دین کی عملی تکذیب کرتے ہیں۔ یعنی وہ ایک طرف نمازیں پڑھ کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بڑے دیندار ہیں۔ لیکن دوسری طرف ان کا عمل یہ ہے کہ وہ اس رزق پر جسے بیٹے پانی کی طرح ہر ایک ضرورت مند کے لئے کھلا رہنا چاہیے تھا، بند لگا کر اسے اپنے لئے مخصوص کر لیتے ہیں۔ (۱۰)

ان کا انخجام کیا ہوگا؟ — اس کے متعلق واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

جو لوگ دولت جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے نوعِ انسانی کی عام منفعت (فی سبیل اللہ)

کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسول! تو ان کے لئے ایک المانگیز عذاب کا اعلان کر دے۔ جب وہ انقلاب آئے گا تو ان کی اس ودلت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے انکی پیشانی، ان کے پہلو، اور ان کی پشت کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم محض اپنی ذات کے لئے سمیٹ کر بیٹھ گئے تھے۔ اب اپنے سرمایہ کا مزہ چکھو!

(۹/۳۸)

(اکتوبر ۱۹۶۵ء)



زکوٰۃ

قرآن کریم کی روشنی میں

(شائع شدہ جولائی ۱۹۶۶ء)

۷ جہل پاکستان میں یہ بحث چلی ہوئی ہے کہ زکوٰۃ کیا ہے۔ اس کا نصاب اور شرح کیا ہے۔ اور مصارف کیا۔ کیا ان میں تبدیلی کی جاسکتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ہم اس موضوع پر متعدد بار وضاحت سے لکھ چکے ہیں، لیکن اس بحث کے چل نکلنے پر ہمارے پاس استفسارات آنے شروع ہو گئے ہیں اور تقاضا کیا جا رہا ہے کہ ہم بتائیں کہ قرآن کریم کی رو سے اس کی پوزیشن کیا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے زکوٰۃ کے متعلق مرد و مسک کو سمجھ لیا جائے جسے ہمارا قدامت پرست طبقہ پیش کرتا ہے۔ ان کے مسلک کے مطابق، جب کسی شخص کے پاس ایک خاص مقدار کے مطابق مال جمع ہو۔ اور اس پر ایک سال گزر جائے۔ تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ایک خاص حصہ بطور خیرات دیدے۔ مال کی اس مقدار کو جس پر ان کے مسلک کے مطابق زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے، نصاب کہتے ہیں اور جس نسبت سے اس میں سے زکوٰۃ نکالی جائے اسے شرح کہا جاتا ہے۔ عام طور پر نصاب حسب ذیل بتایا جاتا ہے۔

(۱)	چاندی	$\frac{1}{5}$ ۵۲ تولہ
(۲)	سونا	$\frac{1}{4}$ ۷ تولہ
(۳)	اونٹ	(۵) پانچ
(۴)	گائے	تیس

(۵) بکریاں چالیس - وغیرہ وغیرہ۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر اسلامی حکومت قائم ہو تو اسے چاہیے کہ لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرے۔ اگر ایسی حکومت نہ ہو، تو لوگ اپنے اپنے طور پر زکوٰۃ خرچ کر دیں۔ لیکن حکومت ہو یا افراد زکوٰۃ خرچ کی جائے گی اپنی مصارف پر جن کا تعین کر دیا گیا ہے۔

(۳) قرآن کریم میں "زکوٰۃ" دینے کا حکم تو آیا ہے جس کی تفصیل ہم آگے چل کر بیان کریں گے، لیکن جن باتوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان میں سے کوئی بات بھی قرآن مجید میں نہیں ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ رقم ازکم، مصارف زکوٰۃ کی تصریح تو خود قرآن کریم نے کر دی ہے اور اس کے لئے ذیل کی آیت پیش کی جاتی ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَمِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمَوْلَاتِ
 قُلُوبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَالْغُرْمِينَ وَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ ابْنِ السَّبِيلِ
 فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَ اللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۹)

شاہ رفیع الدین اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

سوائے اس کے نہیں کہ خیرات واسطے فقیروں کے اور محتاجوں کے اور عمل کرنے والوں کے اور تحصیل اس کی کے۔ اور جن کو کہ الفت دلائے جاتے ہیں دل ان کے۔ اور بیچ آزاد کرنے گردنوں کے۔ اور قرضداروں کو۔ اور بیچ راہ اللہ کے۔ اور مسافروں کو۔ فرض ہے اللہ کی طرف سے۔ اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

اس میں غور طلب بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے یہ مصارف صدقات کے بتائے ہیں جس کا ترجمہ شاہ صاحب "خیرات" کرتے ہیں، یہ زکوٰۃ کے مصارف نہیں۔ قرآن کریم نے "زکوٰۃ" کے لئے زکوٰۃ ہی کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس کے مصارف کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ لہذا ہم نے جو کہا تھا کہ زکوٰۃ کے متعلق ان امور کا جنہیں ہمارا قدامت پرست طبقہ پیش کرتا ہے، قرآن کریم میں کہیں ذکر نہیں آیا، تو یہ ایک حقیقت کا بیان ہے۔

۳۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ تمام تفصیلات نبی اکرمؐ کی متین فرمودہ ہیں اس لئے یہ ہمارے غیر متبادل قانون شرعی ہیں۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے، ہو سکتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے انہیں متعین فرمایا ہو۔ لیکن

بادنی تعلق یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اگر انہیں حضورؐ نے متعین فرمایا تھا تو آپؐ نے ایسا اپنے زمانے کے خصوصی حالات کے ماتحت کیا ہوگا۔ حضورؐ کا یہ منشا نہیں ہو سکتا کہ یہ تفصیل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی طرح رہیں۔ اس کی دلیل واضح ہے۔ مثلاً

۱۔ انصاف میں چاندی۔ سونے کا ذکر ہے۔ اس زمانے میں نقدی، چاندی اور سونے ہی کی شکل میں ہوتی تھی۔ لیکن اب نقدی چاندی سونے میں اول تو ہوتا ہی نہیں۔ اور اگر کہیں سادرن کی شکل میں ہوتا بھی ہے تو شاذ۔ (روپیہ بھی خالص چاندی کا نہیں ہوتا)۔ اب نقدی مال، نوٹوں کی شکل میں ہوتا ہے یا بینک کی ہینڈیوں وغیرہ کی شکل میں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس کچھ روپیہ نوٹوں کی شکل میں ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں۔ اور اگر ہوگی تو کس شرح سے؟ چاندی کی شرح سے یا سونے کی شرح سے۔ اور ایسا کرنے کے لئے کیا سند ہوگی؟

(۲) مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ آجکل چاندی کا بھاؤ تین روپے فی تولہ ہے اور سونے کا نرخ ایک سو تیس روپے فی تولہ۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ مردہ انصاف کے مطابق، جس شخص کے پاس قریب ڈیڑھ سو روپے کی مالیت کے چاندی کے زیورات ہوں گے اس پر تو زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ لیکن جس کے پاس آٹھ نو سو روپے تک کی مالیت کے سونے کے زیورات ہوں گے وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوگا؛ یعنی ڈیڑھ سو روپے رکھنے والے پر تو زکوٰۃ پڑ جائے گی لیکن آٹھ نو سو روپے رکھنے والے پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ یہ تو پھر بھی کم فرق ہے۔ اس انصاف کی رو سے جس شخص کے پاس ڈیڑھ سو روپے کی مالیت کا چاندی کا زیور ہوگا اسے تو زکوٰۃ دینی پڑے گی لیکن اگر اس کے پاس انیس سو گائے ہوں جن کی مالیت سات آٹھ ہزار روپے سے کم نہیں ہو سکتی۔ اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ یعنی غریب پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اس سے نسبتاً امیر پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

آپؐ نے غور فرمایا کہ خود یہ انصاف بتا رہا ہے کہ اگر اسے نبی اکرمؐ نے مقرر فرمایا تھا تو یہ حضورؐ کے اپنے زمانے کے حالات کی رو سے ہوگا جب چاندی سونے۔ اونٹ۔ گائے کی قیمتوں کا تناسب ایسا ہوگا جس کی رو سے سب کے لئے انصاف یکساں ہو جائے۔ آج یہ صورت باقی نہیں رہی۔ آج اگر کسی کے پاس آٹھ روپے کے چاندی کے زیورات ہوں اور وہ سال ختم ہونے سے پہلے، ان کی جگہ سونے کا زیور بولے۔ یا نین

چار گائے خریدے، تو شریعت کی رو سے وہ زکوٰۃ دینے سے بچ جائے گا۔ شریعت کے غیر متبدل (ابدی) قوانین ایسے نہیں ہوا کرتے۔ اس لئے یہ نصاب یا شرح حضور کی طرف سے ابدی طور پر مستقیم فرمودہ نہیں ہو سکتی۔ تاریخ اس پر بھی شاہد ہے کہ بعض چیزیں جن پر رسول اللہ کے زلمے میں زکوٰۃ نہیں پڑتی تھی، خلافت راشدہ کے زلمے میں انہیں زکوٰۃ کی نہرست میں شامل کیا گیا۔ مثلاً تجارتی گھوڑوں اور سمندر سے برآمد شدہ چیزوں کو مد زکوٰۃ میں حضرت عمرؓ کے زلمے میں شامل کیا گیا۔

لیکن یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ فرض کر لیجئے کہ زکوٰۃ کی شرح بھی مستقل طور پر خدا اور رسول کی مقرر کردہ ہے اور اس کے مصارف بھی اپنی کے متین فرمودہ۔ ظاہر ہے کہ اس مقرر شدہ شرح سے آمدنی بھی مقررہ حد تک ہو سکے گی۔ اب اگر صورت یہ پیدا ہو جائے کہ وہ ضروریات جنہیں مذکورہ شرح سے پورا کیا جانا مطلقاً ہے، زکوٰۃ کی آمدنی سے زیادہ ہوں تو اس وقت کیا کیا جائے گا؟ اس صورت میں یا تو آپ کو بعض ضروریات کو ایسے کا دیا سا ہی رہنے دینا پڑے گا۔ اور یا آمدنی زکوٰۃ کے علاوہ کسی اور مد سے حاصل کرنی پڑے گی۔ غور کیجئے کہ ان دونوں صورتوں میں نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ یہی ناکہ خد نے اور اس کے رسول نے ایک مکمل دین دیا ہے۔ اور اس دین کی کیفیت یہ ہے کہ جو آمدنی اس میں بخویش کی گئی ہے وہ ان ضروریات کو پورا نہیں کرتی، جنہیں پورا کرنے کے لئے وہ آمدنی بخویش کی گئی تھی۔ تو سوچئے کہ غیر مسلم اس دین کے متعلق کیا اندازہ کریں گے جس کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کا آخری مکمل۔ اور غیر متبدل دین ہے!

(۴) جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ہمارے قدامت پرست طبقہ کا مسلک یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے زلمے میں زکوٰۃ کی تحصیل اور اس کا صرف کرنا حکومت کے فرض میں ہوتا ہے۔ لیکن جب ایسی حکومت نہ ہو تو پھر زکوٰۃ انفرادی طور پر دی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انفرادی زکوٰۃ، ایک خاص شرح کے مطابق خیراً ہی ہوگی جیسی کہ یہ اب ہے۔ لیکن پاکستان میں کیفیت عجیب ہے۔ زکوٰۃ ابھی تک انفرادی طور پر دی جاتی ہے۔ اور خود حکومت بھی یہ طے نہیں کر پائی کہ زکوٰۃ کا وصول کرنا اور صرف کرنا اس کے فرض میں داخل ہے یا نہیں۔ وہ اس مقصد کے لئے کبھی کوئی زکوٰۃ کمیٹی مقرر کر دیتی ہے کبھی اس کی وصولی کی کوئی اور صورت تجویز کر دیتی ہے لیکن وہ بھی اس انداز سے کہ جس کا جی چاہے اسے رگد اگر وہ کی خیرات کی طرح، حکومت کی جھولی میں ڈال دے اور جس کا جی چاہے اسے خود خرچ کر دے۔ اس میں سے جس قدر روپیہ حکومت کی تحویل میں آجاتا ہے (ہمیں معلوم نہیں کہ اب کچھ آتا بھی ہے یا نہیں) اس کے متعلق یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ

اسے، حکومت کی باقی آمدنی سے بالکل الگ رکھ کر صرف انہی عداوت پر صرف کیا جائے گا جنہیں مصارف زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔

زکوٰۃ — قرآن کریم کی روشنی میں

آئیے اب ہم دیکھیں کہ قرآن کریم کی رو سے زکوٰۃ کا مفہوم کیا ہے۔ الزکوٰۃ کے بنیادی معنی ہیں نشوونما، بیدگی، بڑھنا، پھولنا، پھلنا، یعنی (GROWTH) اور (DEVELOPMENT)

قرآن کریم میں "اقموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ" کا حکم متعدد بار آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی نظام کے یہ دو ستون ہیں۔ "اقامتِ صلوٰۃ" سے کیا مفہوم ہے، اس کے متعلق ہم اس وقت گفتگو نہیں کرتے۔ آیتائے زکوٰۃ کے معنی ہوئے نشوونما دینا۔ کسی کے بڑھنے، پھولنے، پھلنے کا انتظام کرنا۔ اس کی (DEVELOPMENT) کا سامان ہیا کرنا۔

اب آگے بڑھئے۔ اسلامی نظام مملکت (جسے حکومت خداوندی کہا جاتا ہے) کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے جنہیں انسانوں کے متعلق خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ وہ حکومت جب خدا کے نام پر لوگوں سے اطاعت لیتی ہے تو اس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کے ان واجبات کو پورا کرے جن کا ذمہ خدا نے لے رکھا ہے۔

خدا نے قرآن کریم کی سب سے پہلی آیت میں اپنے آپ کو رَبُّ الْعَالَمِينَ کہا ہے۔ یعنی وہ ربوبیت عالمی کا ذمہ دار ہے۔ ربوبیت کے معنی ہوتے ہیں، کسی شے کو اس کے نقطہ آغاز سے نشوونما دیتے ہوئے اس کی تکمیل تک پہنچا دینا۔ اس سے واضح ہے کہ دیگر اشیائے کائنات کے علاوہ، نوع انسان کی عالمگیر نشوونما کا ذمہ بھی خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ اس ذمہ داری کے سلسلے میں اس کا ارشاد ہے کہ

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَىٰ اللَّهِ رِزْقُهَا ﴿١٦﴾

زمین میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔

اور خود انسانوں کے سلسلے میں فرمایا۔

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ﴿١٧﴾

ہم ان کے اور ان کی اولاد کے رزق (سامانِ رزق) کے ذمہ دار ہیں۔

خدا کی یہ وہ ذمہ داریاں ہیں جنہیں پورا کرنے کے لئے جماعتِ مومنین (اسلامی نظام) کو متشکل کیا گیا تھا۔ یعنی انکی ذمہ داری تھی کہ وہ ایسا نظام قائم کریں جس سے تمام افراد انسانہ کو ان کی نشوونما کا سامان ملتا رہے۔ اسے اس نے "ایتائے زکوٰۃ" — سامان نشوونما دینے — کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ دیکھئے اس حقیقت کو قرآن کریم کس قدر وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ سورہ الحج میں ہے۔

الَّذِينَ إِن مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ... (۲۲)

یہ مومنین، وہ ہیں کہ اگر انہیں زمین میں حکومت مل گئی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اسلامی حکومت کا فرضیہ "ایتائے زکوٰۃ" — زکوٰۃ دینا — ہے۔ یعنی نوع انسان (یا افراد معاشرہ) کو سامان نشوونما عطا کرنا۔ اس اعتبار سے حکومت کی ساری آمدنی (REVENUE) کو "زکوٰۃ" (یعنی سامان نشوونما) کہا جائے گا، جسے وہ افراد معاشرہ اور اس کے بعد عالمگیر انسانیت کو دینے کے لئے حاصل کرے گی۔ اس کے لئے وہ کیا انتظام کرے گی۔ لوگوں کی کمائی میں سے کس قدر لے گی۔ اس کا تعین ضروریات کے لحاظ سے کیا جائے گا۔ زکوٰۃ کسی خاص ٹیکس کا نام نہیں۔ اسلامی حکومت کی پوری کی پوری آمدنی زکوٰۃ کہلا سکتی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ان لفظی پیچیدگیوں میں الجھنے کے بجائے، ہمیں قرآن کے مفہوم کے مطابق پورا کہنا چاہیے کہ

اسلامی ملک کا ایک بنیادی فرضیہ "ایتائے زکوٰۃ" ہے۔ یعنی تمام افراد معاشرہ کو سامان نشوونما

بہم پہنچانا۔ اس مقصد کے پیش نظر، اس کی تمام آمدنی زکوٰۃ۔ یعنی ذریعہ نشوونما کہلا سکتی ہے۔

اب آگے بڑھئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سال میں بعض ہنگامی حالات ایسے بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن کے لئے بجٹ

میں گنجائش (PROVISION) نہیں ہوتی۔ مثلاً۔ سیلاب۔ زلزلہ۔ وبا۔ جنگ وغیرہ۔ ان کے لئے

ملک سے خاص عطیات کی اپیل کرنی پڑتی ہے۔ انہیں قرآن کریم نے "صدقات" سے تعبیر کیا ہے۔ سورہ توبہ

کی آیت ۹ میں جو پہلے درج کی گئی ہے، جن "مصارف" کا ذکر ہے وہ صدقات کے مصارف ہیں۔ "زکوٰۃ"

کے نہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ

(۱) جو کچھ آجکل زکوٰۃ کے نام سے دیا جاتا ہے، اسے زکوٰۃ سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے آپ خیرات کہہ سکتے ہیں۔

(۲) زکوٰۃ کے لئے اسلامی حکومت کا ہونا ضروری ہے۔

(۳) اسلامی حکومت "زکوٰۃ" دیتی ہے۔ یعنی لوگوں کے لئے سامان نشوونما بہم پہنچاتی ہے۔

(۴) اس فریضہ کی ادائیگی کے پیش نظر اسلامی مملکت کی ساری آمدنی زکوٰۃ (یعنی ذرائع نشوونما) کہلا سکتی ہے۔ اس آمدنی کی نہ کوئی غیر متبادل شرح ہے نہ خاص نصاب۔ حکومت اسے ضروریات کے مطابق خود متعین کرتی ہے۔ (نبی اکرمؐ اور خلافت راشدہ نے اسے اپنی ضروریات کے مطابق مقرر کیا ہوگا)۔

(۵) جنگامی حالات کے عطیات کو صدقات کہا جاتا ہے۔

اصطلاحی طور پر بھی دیکھا جائے تو قرن اول میں حکومت کی آمدنی کی تین مدت سامنے آتی ہیں۔ غیر مسلموں سے جزیہ، زمین کا لگان (خراج)۔ اور باقی تمام آمدنی کو زکوٰۃ کہا جاتا تھا۔ اندازہ یہ ہے کہ لگان کے لئے اصطلاح انتظامی سہولت کے لئے رکھی گئی ہوگی۔

زکوٰۃ

(۸) ہم نے اس گفتگو کو زکوٰۃ تک محدود رکھا ہے۔ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے اور مملکت اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے افراد سے کس حد تک لے سکتی ہے۔ ان نکات کا تعلق معاشی نظام سے ہے جسے ہم شرح و بسط سے پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس مقام پر اتنی وضاحت اور کردی جائے کہ اسلام کے سیاسی نظام کی رو سے، حکومت اور امت دو الگ الگ ادارے نہیں ہوتے۔ ساری کی ساری امت، حکومت میں شریک ہوتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ امت اپنے اجتماعی نظم و ضبط کے لئے جو مشینری وضع کرتی ہے اسے حکومت کہتے ہیں۔ اس لئے جب یہ کہا جائے گا کہ اسلامی حکومت زکوٰۃ دیتی ہے۔ تو اسے یوں بھی کہا جائے گا۔ امت مسلمہ (جماعت مومنین) زکوٰۃ دیتی ہے۔ یعنی نوع انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔

ظہر

(۹) باقی رہا یہ کہ شریعت کے جو احکام، فقہاء تو ایک طرف خود رسول اللہ کے مقرر کردہ ہیں حالات کی تبدیلی سے ان میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق مودودی صاحب تعہیات (جلد دوم) کے

صفحہ ۳۲۷ پر نظر آ رہی ہیں :-

یہ حقیقت یقیناً ناقابل انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کچھ جزئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیر حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہد رسالت اور عہد صحابہؓ میں عرب اور دنیا کے اسلام کے تھے لازم نہیں کہ بعینہ وہی حالات ہر زمانے اور ہر ملک کے ہوں۔ لہذا احکام اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں، ان کی ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح و حکم کے لحاظ سے ان کے جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روح اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔

قرآن کریم نے زکوٰۃ کا اصول دیدیا ہے۔ اس اصول کی جزئیات اور طریق کار امت اپنے اپنے زمانے میں اپنے حالات کے مطابق خود طے کرے گی۔



کمپوزر اور اسلام

۸ دسمبر ۱۹۶۵ء کو پروفیسر صاحب نے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ پبلک ایڈمنسٹریشن کے رایم کے طلباء سے خطاب کیا۔ موضوع تھا۔ اسلام کا معاشی نظام۔ اس خطاب کو بعد میں ٹیپ ریکارڈر سے مرتب کر کے۔ طلوع اسلام میں شائع کیا گیا تھا۔

عزیزانِ من! آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ اسلام زندگی کا ایک کُلّی نظام پیش کرتا ہے۔ اور سیاسی، معاشرتی، معاشی، عمرانی نظام سب اس کُلّی نظام کے مختلف اجزاء ہیں۔ لیکن ان اجزاء اور ان کے کل میں باہمی تعلق۔ ابتدائی سائنس کی اصطلاح میں۔ مکسچر یا آمیزہ کا سا نہیں۔ کمپونڈ یا مرکب کا سا ہے۔ سائنس کے طالب علم جانتے ہیں کہ مکسچر کے تمام اجزاء اپنی اپنی خصوصیات اسی طرح برقرار رکھتے ہیں۔ لیکن مرکب میں ان کی کیفیت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً، پانی مرکب ہے ہائیڈروجن اور آکسیجن کا۔ ہائیڈروجن بڑی تیزی سے جلتی ہے اور آکسیجن ہر شے کے جہنے میں مدد دیتی ہے۔ لیکن دونوں کے مرکب (پانی) کی خصوصیات ان سے یکسر مختلف ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص ہائیڈروجن اور آکسیجن کی الگ الگ خصوصیات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہے کہ اس نے پانی کی خصوصیات کو سمجھ لیا ہے۔ تو وہ ایک بنیادی غلط فہمی میں مبتلا ہوگا۔ اس سے آگے بڑھنے اور خود ان کو لیجئے۔ اگر کوئی شخص، علم تشریح الابدان (اناٹومی) کی رُو سے، انسانی جسم کے مختلف اجزاء۔ دل، گردہ، پھیپڑے، جگر، حتیٰ کہ دماغ تک کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ کہے کہ اس نے "انسان" (یا اُس فرد) کے متعلق سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ تو وہ کس قدر غلط فیصلے پر پہنچے گا! یہی کیفیت اسلام کے

متعین کردہ نظام نکلتی کے ان اجزاء کی ہے۔ اگر ان اجزاء کا الگ الگ مطالعہ کرنے کے بعد، یہ تصور کر لیا جائے کہ ہم نے اسلام کے نظامِ کلی کو سمجھ لیا ہے تو ایسا کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اسلام کے نظامِ حیات کا صحیح تصور سامنے رکھا جائے۔ اور اس کے بعد دیکھا جائے۔ کہ اس کلی نظام میں یہ اجزاء کیا کام کرتے ہیں۔ اور اُس نصب العین کے حصول میں کس طرح مدد و معاون ہوتے ہیں جو انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ بالفاظِ دیگر، یہ مختلف نظام، مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ یہ مقصد کیا ہے اور مختلف نظام۔ یا کم از کم معاشی نظام۔ اس مقصد کے حصول میں کس طرح مدد و معاون ہوتے ہیں، یہ وہ سوال نہیں جن کا جواب ایک نشست میں دیا جاسکے۔ اسے تو ہماری درسگاہوں کا نصابِ تعلیم ہونا چاہیے تھا۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آسکتی تھی۔ کہ اسلام کیا ہے۔ اسلامی معاشرہ کسے کہتے ہیں۔ اس کے فرائض و واجبات کیا ہیں۔ اور مقصود و مطلوب کیا۔ میں بہر حال کوشش کروں گا۔ کہ اس مختصر سے وقت میں اس امر کی وضاحت کروں کہ قرآن کریم کی رو سے اسلام کا معاشی نظام کیا ہے۔ اور اس کے پیش کردہ کلی نظام میں اس کا مقام کیا۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔

مَعَاشِي نِظَامِ كِي اہمیت

قرآن کریم کی رو سے انسانی زندگی میں معاشیات کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ سورۃ النحل کی ایک آیت سے لگائیے۔ جس میں اس نے ایک مثال سے بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ قرآن کریم کا یہ عالم انداز ہے۔ کہ وہ مجرد حقائق کو محسوس تمثیلات سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس آیت جلیلہ میں کہا گیا ہے۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرِيبًا كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنِّتَةً يٰۤاَيُّهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ۔ ایک بستی تھی بڑی مطمئن اور خوشحال۔ چاروں طرف سے سامانِ زینت بڑی فراوانی سے اس کی طرف چلا آتا تھا فَكَفَّرَتْ بِاَنْعَمِ اللّٰهِ۔ لیکن اس کے باشندوں نے کفرانِ نعمت کیا۔ جس مقصد کے لئے انہیں یہ سب کچھ

۱۴ اس خطاب میں بیشتر باتیں ایسی سلسلے آئیں گی جو معاشی نظام کے سلسلے میں اس سے پہلے بھی پیش کی جا چکی ہیں۔ اس میں وہ امور زیادہ وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں۔

دیا گیا تھا۔ اُسے اس کے لئے استعمال نہ کیا۔ فَأَذَاقَهَا اللهُ لِبَاسِ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہ بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہا۔ اور رہی نہیں بلکہ خود اس قوم کی ہستی خطرے میں پڑ گئی۔

یہ کچھ کیوں ہوا۔ اس کا جواب قرآن کریم نے ایک لفظ میں دیدیا ہے۔ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۱۳۱)۔ کہا۔ کہ یہ کچھ یونہی نہیں ہو گیا۔ خدا کسی قوم کو یونہی بیٹھے بھٹائے مبتلائے عذاب نہیں کر دیتا۔ یہ اس لئے ہوا۔ کہ انہوں نے رزق کی تقسیم کے صحیح نظام خداوندی کو چھوڑ کر، ایک (غلط) نظام خود وضع کیا۔ رزق تو دہی ہوتا ہے۔ اگر اس کی تقسیم خدا کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق کی جائے تو اس کا نتیجہ ہر ایک کی خوش حالی ہوتا ہے۔ اگر اس کی جگہ انسانوں کا خود ساختہ نظام لے لے، تو اس کی تقسیم ناہموار ہو جاتی ہے اور ناہمواریوں کا نتیجہ غربت، افلاس اور بے روزگاری کی خطرات ہوتے ہیں۔

اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آگئی کہ اگر کسی قوم میں رزق کی قلت ہے۔ اور یہ قلت ہنگامی طور پر پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ اس قوم کا ہیج زندگی ہی ایسا ہو چکا ہے۔ یا اس قوم کو ہر وقت اپنی جداگانہ ہستی اور آزادی کے متعلق خطرہ لاحق رہتا ہے۔ تو اس قوم کو کسی خوش حالی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔ اسے سمجھ لینا چاہیے۔ کہ وہ خدا کے عذاب میں گرفتار ہے۔

قانون خداوندی سے اعراض

اس حقیقت کو سورہ طہ کی ایک آیت میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا۔ جو قوم ہمارے قوانین سے اعراض برتی ہے۔ ان سے پہلو تہی کرتی ہے۔ گریز کی راہیں نکالتی ہے تو اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ جو قوم غربت اور افلاس کی زندگی بسر کر رہی ہو، اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی زندگی قوانین خداوندی کے مطابق نہیں۔ وہ ان سے اعراض برت رہی ہے۔

ہمارے ہاں اس سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ اگر کسی قوم کی اس دنیا کی زندگی ذلت اور پستی میں گذرتی ہے تو کوئی بات نہیں۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ اصل زندگی تو آخرت کی ہے۔ کامیابی اور کامرانی تو اس کی ہے جس کی آخرت سنور جائے۔ یہ دنیا مومنین کے لئے ہے ہی نہیں۔ ان کے لئے آخرت کی زندگی ہے،

رہے) خدا کے مقرب بندوں کی نشانی ہی یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں غربت اور افلاس کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ نہ کھلنے کو روٹی، نہ پہننے کو کپڑا، نہ رہنے کو مکان۔ یہ ہیں اللہ کے بندوں کی نشانیاں آخرت میں یہی لوگ جنت کی آسائشوں کے مالک ہوں گے۔ یہ ہمارے ہاں کا عام عقیدہ ہے اور اسے محراب و منبر سے ہمیشہ دہرایا جاتا ہے۔ لیکن دیکھئے کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا ارشاد ہے۔ سورہ طہ کی جو آیت ابھی ابھی میں نے پیش کی ہے، وہ پوری آیت نہیں آدھی ہے۔ پوری آیت یوں ہے۔

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنِّي فَإِن لَّهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَخِشْرًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْلَىٰ ۝ (۲۳۱)

جو ہمارے قوانین سے اعراض برتا ہے اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے اور اسے قیامت میں بھی اندھا ہی اٹھایا جائے گا۔

دوسری جگہ ہے

وَمَنْ كَانَ فِي حُزْنٍ أَعْلَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْلَىٰ وَاصْلًا سَبِيلًا ۝ (۲۳۲)

جس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ بلکہ اس سے بھی لیا گذرا۔

آپ نے غور فرمایا عزیزان! کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے؟ یہ کہ

(۱) جو قوم قوانین خداوندی سے اعراض برتی ہے، اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ اور

(۲) جس قوم کی روزی تنگ ہو، اس کی عاقبت بھی خراب ہوگی۔ جس قوم

کی اس دنیا کی زندگی درخشاں و تابناک نہیں، آخری زندگی میں بھی اس کا کچھ حصہ نہیں۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں۔

جو آج جگر سوز و خود اس روز نہیں ہے!

جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے!

وہ کل کے غم و غیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا

وہ قوم نہیں لائق بہت گامہ فردا!

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد آگے بڑھیے۔

رزق کا معاملہ

یہ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ تمدنی زندگی میں رخص میں انسان کو مل جل کر رہنا ہوتا ہے، رزق

کا معاملہ کسی ایک فرد کا ذاتی معاملہ نہیں رہتا۔ یہ مسئلہ معاشرتی اور اجتماعی ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے موجودہ معاشرہ میں ایک مزدور دن بھر مزدوری کی تلاش میں مارا مارا پھرے اور کہیں کام نہ مل سکے، تو وہ اور اس کے بچے رات کو بھوکے سوئیں گے۔ یا اگر اسے مزدوری ملی ہے۔ لیکن اس کی اجرت اتنی نہیں جس میں اس کا، اور اس کے بال بچوں کا گزارا ہو سکے۔ تو انہیں اسی طرح دن کاٹنے ہوں گے۔ اس مزدور نے اپنی طرف سے حصولِ رزق کی پوری پوری کوشش کی لیکن اس کے باوجود اس کی بھوک کا علاج نہ ہو سکا۔ یہ اس لئے کہ رزق کا معاملہ پورے معاشرہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ کسی فرد کا الگ معاملہ نہیں۔ کسی جنگل یا صحرا میں ایک فرد تنہا نہ امیر ہو سکتا ہے نہ غریب، اس کی یہ پذیرش معاشرہ کے اندر ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم، افراد کے رزق کے لئے معاشرہ کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ یعنی اسے انفرادی مسئلہ کے بجائے معاشرتی مسئلہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اسی کو نظام کہتے ہیں۔ غلط نظام میں رزق کی تقسیم ناہموار ہوتی ہے۔ ایک کے کتوں کو دودھ اور گوشت ملتا ہے اور دوسرے کے بچے بھوکے سوتے ہیں۔ صحیح نظام میں ہر ایک کے رزق کی ذمہ داری نظامِ معاشرہ پر ہوتی ہے جسے عصر حاضر کی اصطلاح میں مملکت (سٹیٹ) کہا جاتا ہے۔ جو مملکت تو حینِ خداوندی کے مطابق نظام قائم کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے اسے حکمتِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ یہ مملکت لوگوں سے خدا کے قوانین کی اطاعت کراتی ہے، اس لئے یہ ان تمام ذمہ داریوں کو بھی پورا کرتی ہے۔ جنہیں، انسانوں کے سلسلے میں، خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ رزق کے متعلق خدا کی ذمہ داری ان الفاظ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ (۱۴)

روئے زمین پر کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

یہ ذمہ داری اسلامی مملکت اپنے سر پر لیتی ہے۔ اور افراد معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی

ہے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّا هُمْ (۱۵)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

اس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ ان (اور انہی جیسی دیگر) آیات سے عام طور پر یہ

عقیدہ پیدا کیا جاتا ہے کہ جب رزق کی ذمہ داری خدا نے خود اپنے سر لے رکھی ہے تو اس کے لئے پریشان

ہونے کی کیا بات ہے۔ وہ جس انسان کو پیدا کرتا ہے اس کے لئے رزق بھی ساتھ ہی ہتیا کر دیتا ہے اس لئے یہ کہنا کہ رزق کی پیدائش اور تقسیم کے لئے خاص نظام کی ضرورت ہے۔ مشیتِ خداوندی کی خلاف ورزی ہے۔

یہ عقیدہ غلط ہے اور اس کا ازالہ خود قرآن کریم نے کر دیا ہے۔ سورہ یٰسین میں ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّقُوا اللَّهَ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ - جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو رزق خدا نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی دو۔ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا تو کفار مومنین سے کہتے ہیں کہ اَنْطَعِمُ مَنْ كُوِيَ شَاءَ اللَّهُ اَطَعَمَهُ تَطَعُ کہ کیا ہم ان (محتاجوں) کی رزق کا انتظام کریں۔ جنہیں اگر روٹی دینا مقصود ہوتا تو خدا خود روٹی دیتا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ اِنْ اَنْتُمْ زَاوٍ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (۳۶)۔ ان سے کہو کہ تم کیسی کھلی ہوئی گمراہی میں ہو جو یہ کہتے ہو کہ جنہیں رزق دیا جانا مقصود ہو، انہیں خدا خود براہِ راست رزق پہنچاتا ہے۔ اس نے صفحہ ۱۷ پر رزق بکھیر دیا ہے۔ ہر ایک ضرورت مند تک پہنچانا، انسانی معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔ جو معاشرہ اس ذمہ داری کو پورا کرتا ہے وہ مشیتِ خداوندی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ لہذا قرآن کریم کی وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ رزق کی ہم ساری خد کے ذمے ہے، اس نظامِ مملکت کو اس کی ذمہ داری سے آگاہ کرتی ہیں جو خد کے نام پر مشکل ہوتا ہے۔

معاشرہ، مملکت، نظام

میں نے یہاں معاشرہ، مملکت، نظام، افرادِ معاشرہ وغیرہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان اصطلاحات کا قرآنی مفہوم بھی سمجھ لیا جائے۔ کہ جب تک ان کا صحیح تصور سامنے نہیں آئے گا۔ معاشی مسئلہ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکے گا۔

اگر آج کوئی غیر مسلم مسلمان ہونا چاہے تو اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ کلمہ شہادت پڑھ کر اسلام قبول کر لے۔ اس کے بعد وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ وہم پیدائشی مسلمانوں کے لئے اس کی بھی ضرورت نہیں۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے مسلمان ہونے کے لئے کچھ اور ہی شرط ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ جب آپ کسی انجن، کسی سوسائٹی، کسی کلب کا ممبر بننا چاہیں تو آپ کو اس کا فارم رکنیت پُر کرنا ہوتا ہے۔ فارم رکنیت

پُر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس انجن، اس سوسائٹی کے قواعد و ضوابط کی پابندی کا اقرار کرتے ہیں۔ اسلام بھی ایک برادری، ایک سوسائٹی مثمن کرنا ہے۔ اس سوسائٹی کی رکفیت کے لئے ایک معاہدہ ضروری ہے اس معاہدہ کی رو سے ایک اقرار اس نمبر کی طرف سے ہوتا ہے اور دوسرا اقرار اس سوسائٹی کی طرف سے۔ وہ معاہدہ یہ ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِآنَ لَكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ (۱۱۱)

اس معاہدہ کی رو سے اس سوسائٹی کا ممبر اپنا جان اور مال، خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ اور اس کے بدلے میں، خدا اس کی ذمہ داری لیتا ہے کہ وہ اُسے جنت عطا کر دے گا۔ یہ معاہدہ، افراد اور اسلامی مملکت کے درمیان ہوتا ہے جو خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا عہد کرتی ہے۔

جنت کے متعلق ہمارے ذہن میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ یہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں جا کر ملے گی۔ مرنے کے بعد دوسری زندگی کی جنت اپنے مقام پر برحق اور اس پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن جنت اور جہنم کی زندگی کا نقشہ اس دنیا میں بھی سامنے آجاتا ہے۔ غلط (غیر قرآنی) معاشرہ، جہنم کا نمونہ ہوتا ہے اور صحیح (قرآنی معاشرہ) میں زندگی جنت بد اماں گزرتی ہے۔ اس جنت کے متعلق جو اس دنیا میں شکل ہوتی ہے اور جس کی ذمہ داری، اسلامی مملکت لیتی ہے۔ کہا گیا ہے۔

إِنَّ لَكَ أَلًا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۗ وَأَنكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْفَىٰ ۗ (۱۱۲)

اس میں ہتھیں نہ بھوک کا خوف ہوگا، نہ کپڑوں کی مسکرا، نہ اس میں پیاس کی تکلیف ہوگی نہ مکان کی تنگی۔

دوسری جگہ ہے کہ اس جنت کی کیفیت یہ ہوگی۔ کہ

وَكُلُوا حَيْثُ شِئْتُمَا (۱۱۳)

انسان جہاں سے جی چاہے، نہایت فراوانی سے کھا پی سکے گا۔

آپ نے غور کیا، عزیزان! کہ یہ معاشرہ، تمام افراد معاشرہ کو ان کی بنیادی ضروریات زندگی

خوراک، لباس، مکان، وغیرہ) کی ضمانت دیتا ہے۔ جو نظام معاشرہ اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا، اسے اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کی طرف منسوب کرے۔ اسی لئے حضور نبی اکرم (صلعم) نے فرمایا تھا کہ

”جس بستی میں کسی شخص نے اس حالت میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی سے اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔“
(مسند امام احمد)

اور حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ

اگر وجہ کے کنارے کوئی کتابھی بھوک سے مر گیا۔ تو خدا کی قسم بھر سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم نے رزق کے مسئلہ کو، فرد کی انفرادی ذمہ داری کے بجائے کس طرح معاشرہ کی اجتماعی ذمہ داری بنا دیا؟ حقیقت یہ ہے کہ جس دامن کا ایک ایک تار ہزاروں، لاکھوں انسانوں کے مفاد کے ساتھ بندھا ہو۔ جس کا تانا بانا پورے معاشرے میں باہم گروہ پیوست ہو۔ جو معاشرہ کے مختلف النوع مسائل کے ساتھ کس طرح گتھا اور گندھا ہوا ہو۔ کسی ایک کی حرکت باقی تمام عناصر کو متاثر کرے۔ اس مسئلہ کو انفرادی قرار دینا، حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا ہے۔ قرآن کریم نے اسے اجتماعی مسئلہ قرار دے کر اس کی اصل دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس نے نظام معاشرہ کا اولین فریضہ یہ قرار دیا کہ وہ تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچائے۔

ملکیت زمین

سوال یہ ہے کہ معاشرہ اپنی اس عظیم ذمہ داری کو پورا کس طرح کرے گا؟ اس کے لئے ایک چیز بالکل واضح اور بدیہی ہے اور وہ یہ کہ معاشرہ اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برار ہو نہیں سکتا جب تک وسائل پیداوار پر اس کا کنٹرول نہ ہو۔ وسائل و ذرائع پیداوار میں، بنیادی حیثیت زمین کو حاصل ہے رہشیاے خوردنوش کے علاوہ، جملہ مصنوعات کے لئے خام مصالحہ ہیں سے ملتا ہے، اس کے متعلق قرآن کریم نے کہہ دیا۔ کہ اس پر انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا ارشاد ہے کہ۔

وَالْأَرْضُ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ (۲۵)

زمین کو ہم نے تمام مخلوق کی پرورش کے لئے پیدا کیا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جو چیز تمام مخلوق کی پرورش کا ذریعہ بنائی گئی ہو اسے کسی فرد کی ملکیت میں کیسے دیا جاسکتا ہے؟
خدا نے ہوا کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ تمام جانداروں کی زندگی کا ذریعہ بنے۔ اگر ہوا کو انفرادی ملکیت میں دے دیا جائے
تو اس سے جس طرح بے شمار مخلوق دم گھٹ گھٹ کر مر جائے گی اس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ بعینہ یہی پورٹین زمین
کی ہے۔ اس لئے اس نے کہا کہ اسے انفرادی ملکیت کے بجائے سَمَوَاتٍ لِلشَّآئِئِطِينِ۔ (۱۱)۔ رہنا چاہیے۔
یعنی اس کا انتظام ایسا کرنا چاہیے کہ یہ تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر چلی
رہے۔ یہ مَتَاعًا لِلْمُقْوِينَ (۲۵) ہے۔ یعنی بھوکوں کے لئے متاع حیات۔ اس میں رِزْقًا لِلْعِبَادِ
(۲۵) ہے۔ یعنی خدا کے تمام بندوں کے لئے رزق۔

قرآن کریم کی انہی آیات کی تشریح کرتے ہوئے نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ
زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے، اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے
رہنی چاہیے۔ (ابوداؤد)

لہذا، زمین کو ایسی حیثیت دے دینا، جس سے یہ تمام مخلوق کے لئے مشترک ذریعہ پرورش رہنے
کے بجائے کسی فرد یا انفرادی ملکیت اور جاہید بن جائے، اس مقصد کے خلاف ہوگا جس کے لئے خدا نے
اسے پیدا کیا ہے۔ یہ معاشرہ کی تحویل میں رہے گی اور معاشرہ ایسا انتظام کرے گا۔ جس سے ہر فرد کو اس کی ضرورت
کے مطابق رزق ملتا جائے۔

زمین اور ہوا میں مشرق

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ زمین یا ہوا (یا سورج کی روشنی) میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ہوا، روشنی
وغیرہ فطرت کی طرف سے تیار شدہ حالت میں ملتی ہے۔ لیکن زمین سے، محنت کر کے، رزق حاصل کرنا
پڑتا ہے اس لئے اس کی پیداوار، ہوا اور روشنی کی طرح عام نہیں کی جاسکتی۔ قرآن کریم اس سوال کا
بھی جواب دیتا ہے اور نہایت شگفتہ اور دل نشین انداز میں دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا دعویٰ یہ
ہے کہ ہم محنت کر کے زمین کو قابل کاشت بنا لیتے ہیں۔ اس میں ہل چلاتے ہیں۔ تخم ریزی کرتے ہیں۔ پانی

دیتے ہیں۔ اس طرح اس سے پیداوار ہوتی ہے۔ لہذا اس پیداوار کے ہم واحد مالک ہیں۔ اس میں کسی اور کا حصہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن ذرا غور کرو کہ اس تمام کاروبار میں، تمہارا حصہ کس قدر ہے اور ہمارا (خدا کا) کس قدر۔ باوقی تدبیریات سامنے آجائے گی کہ یہ تمہارا اور ہمارا مشترکہ کاروبار تھا۔ اس میں سب سے پہلے تو یہ دیکھو کہ پیداوار کا بنیادی ذریعہ (زمین) ہماری پیدا کردہ تھی۔ تمہاری نہیں تھی۔ اب اس سے آگے بڑھو۔

آخِرَاءَ بَيْتِهِمْ مَا تَحْرُثُونَ ۝ (۶۹-۷۳)۔ جو کچھ تم بولتے ہو۔ کیا تم نے اس پر بھی غور کیا ہے؟

تَشْرَبُونَ مِمَّا شَرَبَ آدَمُ ۝ تَم نَقَطَ زَمِينٍ مِّنْ رَّيْحٍ مُّطَّرَّةٍ ۝ كَبُورًا لِّمَن يَخْتَرُ ۝

تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلَمْتُمْ تَفْلِكُونَ ۝ اِنَّا الْمَعْرُومُونَ ۝

بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ۝ اگر ہمارا تانوں زراعت ایسا نہ ہوتا تو فضل کا پروان چڑھنا تو ایک طرف یہ خشک ہو کر چورا چورا ہو جاتی۔ اور تم ششدر اور حیران رہ جاتے کہ یہ کیا ہو گیا۔ ہم پر مغت میں حتیٰ پڑ گئی۔ ہمارا بیج بھی ضائع ہو گیا۔

پھر آگے بڑھو۔ آخِرَاءَ بَيْتِهِمُ الْمَاءُ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۝ کیا تم نے اس پانی پر بھی غور کیا ہے۔ جو تمہارے لئے وجہ زیست اور تمہاری کھیتی کے لئے ذریعہ پیداوار ہے؟

مِنَ الْمُنِّ الْمُنِزَلُونَ ۝ کیا اسے باولوں سے تم برساتے ہو یا ہم برساتے ہیں لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ اُحْجَابًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ۝۔ اگر ہمارے نظام ربو بیت کا یہ تقاضا نہ ہوتا کہ نوع انسان کی پرورش ضروری ہے، تو ہم اسے ایسا کھاری بنا دیتے جسے نہ تم پی سکتے۔ نہ اس سے تمہاری کھیتیاں اگ سکتیں۔ تم اس کے سپاس گزار کیوں نہیں ہوتے۔

اور آگے بڑھو۔ آخِرَاءَ بَيْتِهِمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۝ کیا تم اس آگ پر غور نہیں کرتے جسے تم روشن کرتے ہو۔

ءَا أَنْتُمْ أَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ۝ کیا ان درختوں کو جن سے آگ کا سامان حاصل ہوتا ہے۔ تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔

تم ان وضع بدیہی اور محسوس حقائق پر غور کرو کہ یہ سامان زیست جسے تم اپنی واحد ملکیت تصور کرتے ہو۔ اس میں ہمارا حصہ کس قدر ہے۔ اور تمہارا کس قدر؟ غُنُّ جَعَلْنَاهَا شَدًّا كَرِيمًا۔ ہم تمہیں اس حققت کی یاد دہانی کرانا چاہتے ہیں جسے تم فراموش کر چکے ہو۔ اس مشترکہ کاروبار سے جو کچھ حاصل ہوا ہے اس میں سے تم اپنا حصہ لے لو۔ اور ہمیں ہمارا حصہ دیدو۔ تم پوچھو گے کہ آپ کا حصہ کسے دیدیں؟ ہمارا جواب یہ ہے

کہ ہم نے اسے مَتَاعًا لِّلْمُقْوِسِينَ ۝ (۳، ۵۶) بنایا ہے۔ یعنی اسے بھوکوں کے لئے سامانِ زینت۔ اسے تم ان کے حوالے کر دو۔ یوں ہمارا حصہ ہم تک پہنچ جائے گا۔ علامہ اقبالؒ نے اسی قرآنی حقیقت کو الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

پالتا ہے جج کو مٹی کی تاریکی میں کون

کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھا لے سحاب

کون لایا کھینچ کر پھپھم سے باد ساز گارا

فاگ یہ کس کی ہے کس کا یہ نورِ آفتاب

کس نے بھردی موتیوں سے خوشہ گندم کی تیب

موسموں کو کس نے سکھلائی بے نوبتِ انقلاب

وہ خدا یا! یہ زمیں تیسری نہیں تیسری نہیں

تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں تیسری نہیں

کمانے کی استعداد میں فرق

قرآن کریم نے جو کچھ ان آیات میں زمین کے متعلق کہا ہے، وہی کچھ وہ خود انسانی صلاحیتوں کے متعلق کہتا ہے۔ تارون گوستان نے نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے وہ کہتا ہے کہ اس کی ذہنیت یہ تھی کہ اِنَّمَا اُوْتِيْتَهُ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِي (۲۱۳)۔ میری تمام دولت، میری اپنی ہنرمندی اور قابلیت کی بنا پر مجھے ملی ہے۔ اس لئے اس میں کوئی اور دخل نہیں دے سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلٰكِنْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۱۳)۔ یہ ذہنیت بڑی غلط تھی اور گمراہی پر مبنی ہے۔ لیکن لوگ اکثر اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ جو کچھ کوئی کماتا ہے وہ اس کی تنہا واحد قابلیت یا کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اس میں بالواسطہ اور بلاواسطہ پورے معاشرہ کی تگ و تاز بھی شامل ہوتی ہے۔ اس میں متعدد عناصر ایسے ہوتے ہیں جن میں اسے انفرادی طور پر کچھ دخل نہیں ہوتا۔ مثلاً اس کی پیدائشی صلاحیتیں، تعلیم و تربیت، باول، معاشرہ کا نظم و نسق، مناسب مواقع کا حصول دیگر افراد کا تعاون وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے جو کچھ ایک فرد کماتا ہے وہ بھی اس کی واحد ملکیت نہیں قرار پاسکتا۔ وہ حاصل ہوتا ہے

بہت سے دیگر عناصر کا۔ لہذا اسے بھی ہی نسبت سے بٹنا چاہیے۔ اس نے، اسے سورہ نحل کی ایک آیت میں بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ **وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ** ہم اسے تسلیم کرتے ہیں کہ بعض افراد میں، دوسروں کے مقابلہ میں، اکتسابِ رزق کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے لیکن یہ صلاحیت بنیادی طور پر ہماری عطا کردہ ہوتی ہے۔ مگر یہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ چنانچہ **فَمَا آتَيْنَا النَّبِيْنَ فَضَّلُوْا بِرَادِي رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ** جن لوگوں کو اکتسابِ رزق کی زیادہ صلاحیت حاصل ہوتی ہے وہ اس فاصلہ کمائی کو ان لوگوں کی طرف نہیں لوٹاتے جو ان کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ درحقیقت انہیں کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ رزق ہوتا ہی ان کا ہے اس لئے اسے ان کی طرف ہی لوٹا دینا چاہیے۔ لیکن لوگ ایسا نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ **فَلَا تُفْخَرُ فِيْهِ سَوَاءٌ وَاٰه**! اس طرح تو گدھا گھوڑا سب برابر ہو گئے۔ اگر یہ کمائی انہیں دیدی جائے تو پھر ہم میں اور ان میں منسوق کیا رہا؟

اب سنئے ان کے اس اعتراض کا جواب۔ کہا **اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ** (۱۶)۔ یہ لوگ اس سے انکار کرتے ہیں کہ جو کچھ انہیں زائد حاصل ہوا ہے وہ ان اسباب کی وجہ سے ہے جو ان کے پیدا کردہ نہیں، بلکہ انہیں خدا کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ وہ اس کمائی کے واحد مالک ہیں ان کا اس حقیقت سے انکار ہے کہ اس میں کتنا کچھ ایسا ہے جو ان کا اپنا پیدا کردہ نہیں۔ یہ عناصر وہ ہیں جن کے متعلق دوسری جگہ کہا گیا۔ کہ **وَمَا يَكْمُرُ مِنْ نِّعْمَةٍ فَرِحَ بِهَا** (۱۶)۔ یاد رکھو! یہ تمام اسباب و ذرائع، انعاماتِ خداوندی ہیں۔ تمہارے پیدا کردہ نہیں۔ اس لئے ان کا ما حاصل تمہاری واحد ملکیت نہیں ہو سکتا۔

اصل یہ ہے کہ یہ کم اور زیادہ کمائی کا تصور بھی سکے کا پیدا کردہ ہے۔ ایک مزدور اور ایک انجینئر دن بھر کام کرتے ہیں۔ ہم مزدور کو شام کو تین روپے دیتے ہیں اور انجینئر کو تیس روپے۔ یوں مزدور کی کمائی

مزدور کا معاوضہ تین روپیہ اور انجینئر کا معاوضہ تیس روپیہ، طلب و رسد (SUPPLY AND DEMAND) کا مقرر کردہ ہے۔ اگر مزدور انجینئروں کی طرح کمایا ہوں تو ان کا معاوضہ بھی تیس روپے ہو اور اگر انجینئر مزدوروں کی طرح عام ہو جائیں تو ان کا معاوضہ تین روپے ہو جائے۔ غلط معاشرہ ایسے حالات پیدا کرتا ہے جس میں مزدور عام ہیں تاکہ سرمایہ دار کو ان کی محنت کا معاوضہ زیادہ نہ دینا پڑے۔

انجینئر کی کمائی سے کم ہوتی ہے۔ لیکن یہی مزدور اور انجینئر (دو کھائی) اپنا مکان تعمیر کر رہے ہوں تو اس وقت ان کی کمائی میں کمی اور مٹی کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ دونوں کے ذمے کچھ کام ہوتا ہے اور وہ اس کام کو محنت سے سرانجام دیتے ہیں۔ لہذا کمائی میں کمی اور مٹی اس وقت سامنے آتی ہے جب ہم کام کے معاوضہ کا معیار رکھ کر قرار دیں۔ جب صرف کام سامنے ہو تو کمائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سوال ضروریات کا ہوتا ہے جسے معاشرہ پوری کرتا ہے۔

اسلامی نظام میں معاشرہ پوری کی پوری ملت کا اپنا گھر ہوتا ہے جس کی تعمیر اور تزئین تمام افراد کا فریضہ ہوتا ہے۔ وہ سب اپنے اپنے مفوضہ کام کو فریضہ سمجھ کر سرانجام دیتے ہیں اس لئے ان کے ہاں اس کے معاوضہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یوں نگران کے معاشی نظام میں، جب وہ اپنی مکمل شکل میں قائم ہو کمائی کم اور مٹی ہی نہیں۔

دولت

عربی زبان میں "دولت" کے معنی گردش کرنے والی چیز کے ہیں۔ اور یہ بیشتر مشتمل ہوتی ہے، سونے اور چاندی کے سکوں (یا ان کے بدل، کرنسی نوٹوں) پر۔ ان سکوں کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ شروع شروع میں، جب انسان کی تمدنی زندگی اس قدر وسیع اور پیچیدہ نہیں تھی، لوگ اپنی مختلف ضروریات پوری کرنے کے لئے، اشیاء مستعملہ کا تبادلہ کر لیا کرتے تھے۔ اسے انگریزی زبان میں بارٹر سسٹم سے تعبیر کیا جاتا ہے، بعد میں جب زندگی پھیل گئی اور اشیاء کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا وقت طلب ہو گیا تو سکے رائج کئے گئے۔ یہ تبدیلی کی گئی تھی انسان کی سہولت کی خاطر، لیکن مفاد پرست گروہ نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اشیاء مستعملہ کا درجہ اس زمانے میں بیشتر کھانے پینے کی چیزوں پر مشتمل ہوتی تھیں (زیادہ عرصہ تک ذخیرہ کرنا مشکل تھا۔ اس لئے وہ بہر حال لوگوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے گردش میں رہتی تھیں۔ لیکن روپیہ پیسہ کو جب تک جی چاہے دبا کر رکھا جاسکتا تھا۔ اس طرح اس گروہ نے روپیہ جمع کرنا شروع کر دیا اور دولت، گردش میں رہنے کے بجائے، مالداروں کے دھنوں میں بند ہوتی گئی۔ دولت کی گردش رک جانے سے جو مفاسد پیدا ہو سکتے ہیں ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ دولت کو جس قدر گردش سے روکا جائے گا اسی قدر لوگوں کی ضروریات رُک رہی گی۔ قرآن کریم

دولت جمع کرنے اور روک رکھنے کو سنگین جرم اور تباہی کا موجب قرار دیا ہے۔ اس نے کہا تباہی اور بربادی ہے اس کے لئے۔

الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ (۳۱)

جو مال جمع کرتا ہے اور پھر اس کی ذہنیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ رتنا نوے کے پھیر میں پھر کر اسے گنتا رہتا ہے۔

اس کے بعد اس نے کہا کہ اس روش زراذذی سے اس جہنم کی آگ بھڑک اٹھتی ہے جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ "سورہ معارج میں ہے کہ جہنم اس شخص کو آدازیں دے دے کر بلاتی ہے جس کی کیفیت یہ ہو کہ جَمَعَ فَأَوْعَى (۳۲) وہ دولت جمع کرتا ہے اور پھر اسے روک کر بیٹھ جاتا ہے۔ سورہ ماعون میں ہے کہ دولت اور دیگر ذرائع رزق کو چشمہ جاریہ کی طرح بہتے رہنا چاہیے تاکہ ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اس سے بہ رہے ہو سکے۔ لیکن لوگ يَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ۔ ان چیزوں کے آگے بند لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور یوں انسانیت کے لئے مشکلات پیدا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ اگر دیندار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ تو ان کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے۔ یہ دین کی تکذیب کرتے ہیں یہ اگر اپنے آپ کو نمازی کہتے ہیں تو ان کی نمازیں ان کے لئے تباہی کا موجب ہیں۔ (۳۳)۔ اور عذاب جہنم کا باعث۔ سورہ نوبہ میں ہے الَّذِينَ يَكْنُزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۳۴)۔ جو لوگ چاندی اور سونے کے جمع کر رکھتے ہیں اور انہیں نوع انسان کی بیبود کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسول! ان کے لئے ایک الم انگیز عذاب کا اعلان کر دو۔ يَوْمَ نُحْجِي عَلَيْهِمْ فِي ذُرَائِهِمْ جَهَنَّمَ فَتُكْوَى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَأَمْشُؤُهُمْ هُمْ هَذَا مَا كَنْزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كَنْزْتُمْ تَكْنِزُونَ (۳۵)۔ جس دن ان سگوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا۔ اور ان سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں کو دایا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہ سگے ہیں جنہیں تم نے صرف اپنے ذاتی مفاد کی خاطر روک رکھا تھا۔ لہذا آج تم اس الم انگیز عذاب کا مزہ چکھو جو تمہاری غلط روش کا نظری نتیجہ ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کریم نے، دولت کے روک رکھنے کے مقابلہ میں "الفاق" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ نَفَقَ اس سرنگ کو کہتے ہیں جس کے دونوں منہ کھلے ہوں۔ اس سے دولت کے متعلق

تقرآن کریم کا نقطہ نگاہ واضح ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس بخل کا لفظ ہے۔ یعنی دولت کو عالمگیر انسانیت کے لئے کھلا رکھنے کے بجائے اپنی ذات کے لئے روک رکھنا۔ جو قوم اپنے ہاں اس قسم کا معاشی نظام رائج کرے جس میں اس روش کو جرم نہ مقرر دیا گیا ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے وَ يَسْتَبَدِلُ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أُمَّةً لَّكُمْ (۱۳۳)۔ اور اس کی جگہ ایسی قوم لے لیتی ہے جو جیسی نہیں ہوتی۔ یعنی اس قوم کا معاشی نظام اس قسم کا نہیں ہوتا۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم کی رو سے قوموں کے عروج و زوال میں ان کے معاشی نظام کا کس قدر بنیادی دخل ہے۔

دولت کی گردش

اتنا ہی نہیں کہ دولت گردش میں رہے۔ بلکہ اس کی گردش ایسی ہو کہ وہ معاشرہ میں اس طرح رواں دواں رہے جس طرح جسم کی رگوں میں خون گردش کرتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ادھر کے طبقہ ہی میں گردش کرتی رہے۔ كَيْ لَا يَكُونَ بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِثْلُكُمْ (۱۳۵)۔ وہ تم میں سے امیروں کے گھروں میں ہی نہ پھرتی رہے۔

رِئَاسَاتٌ

دولت کیوں جمع کی جاتی ہے؟ اس لئے کہ انسان کو محنت کر کے کمانا پڑے، بلکہ خود دولت کمانی کا ذریعہ بن جائے۔ یہاں سے وہ سوال سامنے آتا ہے جو نظام معیشت کی اصل اور بنیاد ہے۔ یعنی یہ کہ معاوضہ محنت کا ہونا چاہیے یا سرمایہ کا۔ قرآن کریم اس باب میں کھلے کھلے الفاظ میں کہتا ہے۔ کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعَىٰ (۱۳۲)۔ "انسان صرف اس کا حصدار ہے جس کے لئے وہ محنت کرے" معاوضہ محنت کا ہے۔ سرمایہ کے معاوضہ کو وہ رِئَاسَاتٌ سے تعبیر کرتا ہے۔ ہمارے ہاں رِئَاسَاتٌ کا ترجمہ عام طور پر سود کیا جاتا ہے اور اس سے پھر اس قسم کی بحثیں چھڑ جاتی ہیں کہ سود کس قسم کا جائز ہے اور کس قسم کا ناجائز۔ سوال سود کا نہیں رِئَاسَاتٌ کا ہے اور رِئَاسَاتٌ کے معنی ہیں سرمایہ پر بھرتی۔ خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ یہ ہے رِئَاسَاتٌ جسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔ رِئَاسَاتٌ الرِّئَاسَاتُ (۱۳۵)۔ چونکہ ایسا معاشی نظام جس میں، سرمایہ کا معاوضہ جائز مقرر دیا جائے

قرآن کے معاشی نظام کی یکسر نفیض ہے اس لئے قرآن کریم نے اسے اسلامی نظام کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا ہے۔ (۲۷۸)۔

بیع (تجارت)

قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَ أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَ حَزَمَ الْبُرْجَا (۲۷۹)۔ خدا نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور رنجا کو حرام۔ اس سے یہ سوال سنا آتا ہے کہ بیع (تجارت) میں بھی تو سرمایہ پر منافع لیا جاتا ہے اس لئے کیسے طرح جائز ہو سکتی ہے۔ اور اگر یہ جائز ہے تو پھر یہ اصول صحیح نہیں کہ قرآنی نظام معیشت میں خالی سرمایہ پر منافع جائز نہیں۔ یہ سوال آج کی ذہنیت کا پیدا کردہ نہیں۔ زمانہ نزولِ قرآن میں بھی ایسے لوگ تھے جو اس ذہنیت کے حامل تھے اور کہتے تھے کہ إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الْبُرْجَا (۲۷۹)۔ بیع (تجارت) بھی تو رنجا ہی کی مثل ہے۔ پھر یہ کیوں ہے کہ بیع حلال ہے۔ اور رنجا حرام۔

اس سلسلہ میں، پہلے تو بیع کے لفظ پر غور کیجئے۔ یہ لفظ خریدنے اور فروخت کرنے، دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ یعنی ایسی شکل جس میں ایک شخص بیک وقت کچھ بیچتا ہے اور کچھ خریدتا ہے۔ یہ شکل (بارٹر سسٹم) ہی میں ممکن العمل ہے۔ اس میں ایک شخص اپنی ایک جنس بیچتا ہے اور اس کے بدلے میں دوسری جنس خریدتا ہے۔ اس سے ایک ہی سودے میں دونوں طرف سے، خرید اور فروخت عمل میں آجاتی ہے۔ جب سکوں کے عوض کسی شے کو خریدا جائے تو خریدار دوسرے کی شے کو خریدتا ہے۔ اس کے ہاتھوں کچھ بیچتا نہیں۔ اس لئے بیع (بارٹر سسٹم) میں رنجا سرمایہ پر بڑھوتی کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔

اب رہی بیع (تجارت) کی موجودہ شکل جس میں کاروبار سکوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ جب قرآنی معیشت کے یہ اصول واضح ہیں کہ

(۱) معاوضہ محنت کا ہے۔ اور

(۲) خالی سرمایہ پر منافع حرام ہے۔

تو تجارت کی صورت وہ شکل جائز ترار پائے گی جس میں تاجر اپنی محنت کا معاوضہ لے سکے۔ جو سرمایہ اس نے لگایا ہے اس پر منافع لے۔ یعنی اس میں اصول یہ ہو کہ

قیمت فروخت - لاگت + محنت کا معاوضہ

اور "محنت کا معاوضہ" نظامِ مملکت کی طرف سے متعین ہو۔

کارِیگر اور دوکاندار

تجارت کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ کارِیگر کوئی چیز بنا لے۔ دوکاندار اسے خریدتا ہے اور پھر اپنے منافع کے ساتھ آگے بھجیے۔ غلط نظامِ معیشت میں، دوکاندار کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کارِیگر کو کم از کم دے اور گاہک سے زیادہ سے زیادہ لے۔ قرآنِ کریم نے اس ذہنیت کو فاسقانہ اور اس قسم کے نظام کو جس میں بیرونی عام ہو بجز ماند قرار دیا ہے اور اس کا نتیجہ قوم کے لئے تباہی بتایا ہے۔ وہ کہتا ہے

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ﴿۲۳﴾ تباہی ہے ایسے لوگوں کے لئے جن کی کیفیت یہ ہو کہ إِذَا كَانُوا عَلَى النَّاسِ يَتَوَفَّوْنَ لَهُمُ ﴿۲۴﴾۔ جب وہ دوسروں سے لیں تو پورا پورا لیں۔ وَإِذَا كَانُوا لَهُمْ أَوْ لِزَنٍ ؕ يُخْسِرُونَ ﴿۲۵﴾۔ اور جب انہیں دیں تو ماپ اور تول میں کمی کر دیں۔

ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کی عام کردہ شرائط کو پورا کرنے کے لئے بیع کی وہ شکل زیادہ مناسب ہوگی جس میں اشیائے مستعملہ خود نظامِ مملکت کے زیرِ تحویل تیار ہوں اور وہی ان کی تقسیم کا انتظام کرے۔

فاضلہ دولت

عزیز ازمن میں نے جو کچھ اس وقت تک کہا ہے وہ ایک صحیح رسترائی (نظامِ معاشی کے اصول و مبادیات ہیں۔ درنہ قرآنِ کریم نے، ایک مختصر اور سادہ حکم سے پورے نظامِ سرمایہ داری کو اس کی جڑ اور بنیاد سے اکھیر کر رکھ دیا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) اگر افراد معاشرہ کے پاس فاضل دولت نہ رہے تو نظامِ سرمایہ داری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں سنئے کہ قرآنِ کریم کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۗ لَئِي رَسُوْلٍ ۗ يَبْحَثُ فِي سُوْرَتِهِمْ مِمَّا رَزَقُوْهُمْ اَنْ يُنْفِقُوْا ۗ اِنَّ سُوْرَةَ الْاَنْفِقُوْنَ (۲۴) ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے، سب کی سب۔ آپ نے غور کیا کہ اس ایک حکم سے کس طرح نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

ضروریات کا تعین کون کرے گا؟

اس مقام پر ایک دلچسپ اعتراض سامنے لایا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ان ضروریات کا تعین کون کرے گا؟ اگر اسے لوگوں کی اپنی مرضی پر چھوڑ دیا جائے گا تو وہ اپنی ضروریات ہی اتنی بتائیں گے جن کے پورا ہونے کے بعد کچھ باقی نہ بچے۔ اور اگر ان ضروریات کا تعین حکومت کی طرف سے ہوگا۔ تو یہ زندگی، جیل خانے کے قیدیوں کی سی ہوگی جس میں ان کی ضروریات کا تعین جن کے قواعد کی رُو سے ہوتا ہے۔

اس قسم کے اعتراضات کی وجہ یہ ہے کہ ہم نظام تو اسلام کا سامنے لاتے ہیں اور اس کا اطلاق اپنے آپ پر کرتے ہیں جن کی حالت یہ ہے کہ نہ ہمارا ذہن متراستی، اور نہ ماحول متراستی۔ ظاہر ہے کہ قرآن کے اصول و احکام قرآنی ذہنیت و تصورات کے حامل افراد کے لئے ہیں۔ اور وہ متراستی ماحول اور نظام کے اندر فٹ ہو سکتے ہیں اگر ہم ان کا اطلاق اپنے آپ پر کرنے لگیں گے۔ تو وہ ایسا ہی ہوگا جیسے کسی ٹیرے پاؤں میں سیدھا جوتا پہنانے کی کوشش کی جائے۔ جن مسلمانوں نے اس نظام کو عملاً متشکل کیا تھا، ان کی ضروریات اور ضروریات کے تعین کی کیفیت کیا تھی؟ اس کا اندازہ دو ایک واقعات سے لگائیے۔ جب حضرت ابو بکر خلیفہ منتخب ہوئے تو سوال یہ پیدا ہوا کہ خلیفہ کا وظیفہ کیا مقرر کیا جائے۔ بخت و تمیص کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ اسے خود خلیفہ پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنی ضروریات کے لئے کتنا وظیفہ کافی سمجھتے ہیں۔ حضرت ابو بکر نے دریافت کیا کہ مدینہ میں ایک مزدور کی کم از کم آمدنی کیا ہے۔ وہی آمدنی آپ نے اپنے لئے بطور وظیفہ مقرر کی۔ جب پوچھا گیا کہ اس میں آپ کا گزارہ کیسے ہوگا تو آپ نے فرمایا۔ کہ اتنی آمدنی میں جس طرح اُس مزدور کا گزارہ ہوتا ہے۔ اسی طرح میرا گزارہ ہوگا۔ میں کوشش کروں گا کہ اس مزدور کی آمدنی بڑھتی جائے تاکہ اس طرح میرے وظیفہ میں بھی اضافہ ہوتا جائے۔

اب رہا ضروریات کا تعین۔ ایک دن کھانے کے بعد آپ نے بیوی سے کہا کہ کوئی میٹھی چیز نہیں؟ اس نے کہا کہ بیت المال سے بورشن آتا ہے اس میں میٹھی چیز کوئی نہیں ہوتی۔ بات آئی گئی ہوئی۔ سات آٹھ روز کے بعد آپ نے دیکھا کہ کھانے کے ساتھ دسترخوان پر حقوڑا سا حلوہ بھی رکھا ہے آپ نے اسے کھایا۔ اور پھر پوچھا کہ یہ حلوہ آج کیسے بن گیا؟ بیوی نے کہا کہ میں نے اُس دن آپ کی خواہش کو محسوس کر کے یہ کیا کہ ہر روز آٹا گوندتے وقت ایک مٹھی بھر آٹا الگ رکھ لیتی تھی۔ سات آٹھ روز کے بعد

وہ آٹا اٹھا ہو گیا کہ بازار سے اس کے عوض تھوڑا سا شیرہ مل گیا۔ اس سے میں نے یہ حلوہ تیار کر لیا۔
آپ گھر سے نکلے اور سیدھے ریشن ڈپو پر گئے اور موڈی سے کہا کہ ہمارے ہاں جتنا آٹا ہر روز
جاتا ہے آٹہ اس سے ایک مٹھی بھر کم جائے گا کیونکہ تجربہ نے بتایا ہے کہ ہمارا گزارہ مٹھی بھر کم آنے
میں بھی ہو جاتا ہے۔

یہ تھا معیار ان کا اپنی ضروریات کے تعین کے لئے۔ اپنی ضروریات کا پورا کرنا تو ایک طرف قرآن کریم
نے ان کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ **يُؤْتِيهِمْ مِنْ عَمَلِهِمْ جَزَاءً وَكَانَ رِجْزًا لِلَّذِينَ ظَلَمُوا** (۲۶)
وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں خواہ خود تنگی میں گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس
دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینے کی کیفیت یہ تھی کہ ایک دن مصر کا گورنر باب خلافت میں آیا۔ اس نے
دیکھا کہ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ زیتون کے تیل کے ساتھ جو کی روٹی کھا رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ اب
مصر سے کافی گیہوں آ رہا ہے۔ آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ آپ نے کہا کہ اس وقت مجھے
یقین ہے کہ ملک کے ہر فرد کو جو کی روٹی مل جاتی ہے۔ جس دن تم اس کا یقین دلا دو گے کہ ملک
کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے اس دن میں بھی گیہوں کی روٹی کھاؤں گا۔
قرآن کا معاشی نظام، قلب و نظر میں کس قسم کی تبدیلی چاہتا ہے۔ اس نکتہ کے متعلق میں
تفصیل سے ذرا آگے چل کر بیان کروں گا۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامی معاشرہ میں
ضروریات کا تعین اس طرح ہوتا ہے۔

حاصل بحث

اس وقت تک میں نے جو کچھ کہا ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ قرآن کریم کے
معاشی نظام کی رو سے۔

(۱) تمام افراد ملک کو ان کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچانا، ملک کا فرضیہ۔ بلکہ
اس کی ہستی کی وجہ جواز ہے، ان بنیادی ضروریات میں، کھانا، پینا، لباس، مکان، علاج، تعلیم
وغیرہ سب شامل ہیں انہیں اس طرح پورا کیا جائے گا کہ (REGIMENTATION) کے بجائے افراد کے

ذاتی ذوق کی تسکین بھی ہوتی ہے۔

- (۲) مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری سے اسی صورت میں عہدہ براہو سکتی ہے کہ ذرائع رزق اس کی تحویل میں رہیں۔ اس لئے قرآن کریم کی رو سے، ذرائع رزق پر کسی کی انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب نظام معاشرہ کے کنٹرول میں رہیں گے۔ ملکیت اس پر کسی کی بھی نہیں ہوگی۔
- (۳) ہر فرد اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرے گا۔ اس سے مستثنیٰ وہی ہوں گے جو کسی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہیں۔ معذور ہوں۔ کام کی تقسیم، افراد کی صلاحیت اور امکانی استعداد کے مطابق ہوگی۔
- (۴) اگر ہم قرآن کے اصولوں کو دور حاضر کے معاشی تصورات کی روشنی میں سمجھنا چاہیں تو کہا جائیگا۔ کہ اس میں معاوضہ محنت کا ہوگا سرمایہ کا نہیں ہوگا۔ خالی سرمایہ پر ہر قسم کا منافع ممنوع ہوگا۔ فاضلہ دولت کسی کے پاس نہ رہے گی اور جب فاضلہ دولت ہی نہ ہوگی تو روپیہ جمع کرنے یا جائیدادیں کھری کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

کیونترزم اور اسلام

میں یہ کہہ رہا ہوں، اور میری نگاہیں اس سوال کو بجانب رہی ہیں جو آپ کے افق قلبی سے اٹھ کر آپ کے ذہن کو متاثر کر رہا ہے۔ آپ کے دل میں سوال یہ پیدا ہو رہا ہے کہ یہ تو پھر کیونترزم ہو گیا۔ اس سوال کا جواب ضروری ہے اسے غور سے سنئے۔

پہلے تو یہ دیکھئے کہ اگر قرآن کا معاشی نظام اور کیونترزم کا معاشی نظام ایک ہی ہیں یا ان دونوں میں مماثلت ہے تو آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ دنیا کی کسی قوم نے اسلام کے معاشی نظام کو اپنا یا ہے۔ قرآن کریم نے یہ نظام چودہ سو سال پہلے دیا تھا اور کیونترزم کا نظام بیسویں صدی کی پیداوار ہے، اس لئے یہی کہا جائے گا کہ کیونترزم نے یہ نظام، اسلام سے لیا ہے نہ یہ کہ اسلام اس نظام کو کیونترزم سے مستعار لے رہا ہے۔

دوسری بات یہ ہے اور مجھے اس کا اکثر تجربہ ہوتا رہتا ہے، کہ جو لوگ موافقاً یا مخالفاً کہتے ہیں کہ اسلام اور کیونترزم ایک ہی ہے، وہ نہ اسلام کو سمجھتے ہیں نہ کیونترزم کو۔ کیونترزم اس معاشی نظام ہی کا نام نہیں جو روس یا چین میں رائج ہے۔ کیونترزم ایک مخصوص فلسفہ زندگی یا نظریہ حیات ہے جس پر

ہں کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام بھی کسی معاشی یا سیاسی نظام کا نام نہیں۔ یہ ایک فلسفہ زندگی اور نظریہ حیات ہے جس کی بنیادوں پر اس کے تمام نظام استوار ہوتے ہیں۔ کمیونزم کا فلسفہ زندگی یا نظریہ حیات، اسلام کے فلسفہ زندگی یا نظریہ حیات کی یکسر نقیض ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ وقت نہیں کہ میں آپ کو تفصیل سے بتا سکوں کہ اسلام کا فلسفہ حیات کیا ہے اور کمیونزم کا فلسفہ زندگی کیا۔ اس وقت میں ان کے صرف نمایاں اصولوں پر اکتفا کروں گا۔ کمیونزم کا فلسفہ زندگی یہ ہے کہ

(۱) زندگی صرف یہی طبعی زندگی ہے جو انسانوں اور حیوانوں دونوں میں مشترک ہے۔ انسان طبعی قوانین کے ماتحت زندہ رہتا ہے اور انہی کے مطابق اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور جب یہ میز جاتا ہے تو اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بعینہ اسی طرح جس طرح ایک حیوان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

(۲) دنیا میں ایک نظام وجود میں آتا ہے۔ وہ بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے۔ جب وہ اپنے شباب تک پہنچتا ہے تو اس پر زوال آنا شروع ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک اور نظام برآمد ہونا شروع ہو جاتا ہے جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ شروع سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ جب پوچھا جائے کہ وہ کون سی توت ہے جس سے یہ گردش دو لابی اس طرح جاری ہے تو اس کے جواب میں کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ سب تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کی رو سے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے نظام سرمایہ داری کا دور تھا۔ اب اس کی جگہ اس کی ضد، اشتراکی نظام کی باری ہے (اس فلسفہ کی رو سے اشتراکی نظام کے بعد پھر نظام سرمایہ داری کا دور آجائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی شکل سابقہ نظام سرمایہ داری سے قدرے مختلف ہوگی۔

(۳) اس نظام کی تشکیل اور انسانی زندگی کے دیگر معاملات کے متعلق ہر فیصلہ مملکت کی منسلحت کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں کوئی ایسے مستقل اصول و اقدار نہیں جن کی پابندی ضروری ہو۔

(۴) اس فلسفہ زندگی کو ماننے والے، نہ خدا کے وجود کے قائل ہوتے ہیں نہ وحی کے، نہ (طبعی جسم سے ماوراء) انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کو تسلیم کرتے ہیں نہ حیات آخرت کو۔ ان کے نزدیک

موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب

اس کے برعکس، قرآن کا عطا کردہ فلسفہ زندگی ہے جس کی رُو سے :-

(۱) انسانی زندگی، محض طبعی جسم کی زندگی کا نام نہیں۔ انسان میں طبعی جسم کے علاوہ، ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔

(۲) انسانی زندگی کا مقصد انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ نشوونما یافتہ ذات، فرد کی موت کے بعد زندہ رہتی ہے اور زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔

(۳) انسانی ذات کی نشوونما ان مستقل اقدار کی پابندی سے ہوتی ہے جو انسان کو وحی کی رُو سے عطا ہوئی ہیں۔ ان اقدار میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔

(۴) چونکہ زندگی کی موجودہ سطح پر انسانی ذات کی نشوونما جسم کے اندر رہتے ہوئے ہو سکتی ہے اس لئے انسانی جسم کی پرورش نہایت ضروری ہے۔ اس کے لئے ایک ایسا معاشی نظام دیا گیا ہے جس میں جسم انسان کی پرورش اس انداز سے ہوتی چلی جاتی ہے کہ حصولِ رزق کی جدوجہد، انسانی ذات کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتی، بلکہ یہ اس کے نشوونما کے لئے مدد و معاون ہوتی ہے۔ یوں کہئے کہ یہ نظام، افراد معاشرہ کو روٹی کی منگی سے آزاد کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو بلند مقاصد حیات کے حصول کے لئے وقف کر سکیں۔ ان مقاصد کے حصول کی جدوجہد سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔

جذبہ محرکہ

اس مقام پر شاید آپ کہہ دیں کہ کسی فلسفہ زندگی کا معاشی نظام سے کیا تعلق ہے؟ اس کا تعلق بڑا گہرا ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ انسان کا ہر عمل، اس کے جذبہ محرکہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جذبہ محرکہ کے بغیر عمل کا نشوونما بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ (۱) انسان کے سامنے ایک مقصد ہوتا ہے (۲) اس مقصد کے حصول کے لئے اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے۔ (۳) جب وہ خواہش مستحکم اور شدید ہو جاتی ہے تو وہ ارادے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی کو جذبہ محرکہ کہتے ہیں۔ اور (۴) جب یہ جذبہ، انسان کی طبعی توتوں کی رُو سے، محسوس شکل میں سامنے آتا ہے تو اسے انسان کا عمل کہا جاتا ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ انسان کے عمل کی بنیاد اس کے پیش نظر مقصد پر ہوتی ہے۔ اور

مقصد کا تعین، وہ فلسفہ حیات کرتا ہے جسے انسان بطور ایمان اپنے لئے اختیار کرتا ہے۔ "ایمان" کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس فلسفہ زندگی کو اس قدر سچا اور گراں بہا سمجھتا ہے کہ وہ اس کی خاطر ہر ترسانی کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔

یہ فلسفہ حیات (آئیڈیالوجی) کا تعلق معاشی نظام کے ساتھ۔ اب آپ پوچھیں گے کہ کیونزیم کے فلسفہ حیات میں وہ کیا خرابی ہے جس کی بنا پر اسے انسان کے معاشی نظام کی بنیاد و تراز نہیں دیا جاسکتا۔ یہ نکتہ بھی اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ صحیح معاشی نظام کی بنیاد اس اصل الاصول پر ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اپنی رقم از کم، ضروریات کے بعد، جو کچھ فاضل ہو اسے دوسروں کی ضروریات کے لئے عام کر دے۔ سوال یہ ہے کہ انسان ایسا کیوں کرے؟ وہ کیوں زیادہ سے زیادہ محنت کر کے کمائے اور اس محنت کے ما حاصل کو دوسروں کے لئے عام کر دے؟ دوسرے یہ کہ اگر کسی انسان کو اس کا یقین ہو کہ اس کی بنیادی ضروریات بہ نفع پوری ہوتی رہیں گی تو وہ کام ہی کیوں کرے گا۔ اور اگر وہ کام کرے گا تو بڑی بے دلی سے کرے گا۔ جان مار کر کبھی نہیں کرے گا بالخصوص جبکہ اسے معلوم ہے کہ اس کی زائد از ضروریات کمائی دوسرے لوگ لے جائیں گے۔ کیونزیم کے فلسفہ حیات کی رو سے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے کہ جو زیادہ کماسکتا ہے وہ اپنی فاضلہ کمائی ان لوگوں کو دیدے جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے مکتفی نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ تو خالص جذبہ باقی دلیل ہے۔ اس کا تعلق کیونزیم کے فلسفہ حیات سے کچھ نہیں۔ کیونزیم کا فلسفہ حیات اس قسم کا جذبہ محض پیدا کر ہی نہیں سکتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس فلسفہ حیات کی وجہ سے کیونزیم کے ساتھ ہو گیا ہے؟ روس نے مظلوم و مقہور مزدوروں کو آواز دی کہ اٹھو اور ان دو لختوں کو لوٹ کر انہیں ختم کرو۔ وہ اٹھے اور انہیں ختم کر دیا۔ ان کا یہ عمل انتقام کے جذبہ کی پیداوار تھا جب وہ لخت طبقہ باقی نہ رہا۔ توجہ یہ انتقام بھی باقی نہ رہا۔ اور جب یہ جذبہ ہی باقی نہ رہا تو پھر سچی ہوئی عمارت کس طرح قائم رہتی؟

۱۵۹
۱۶۰
۱۶۱
۱۶۲
۱۶۳
۱۶۴
۱۶۵
۱۶۶
۱۶۷
۱۶۸
۱۶۹
۱۷۰
۱۷۱
۱۷۲
۱۷۳
۱۷۴
۱۷۵
۱۷۶
۱۷۷
۱۷۸
۱۷۹
۱۸۰
۱۸۱
۱۸۲
۱۸۳
۱۸۴
۱۸۵
۱۸۶
۱۸۷
۱۸۸
۱۸۹
۱۹۰
۱۹۱
۱۹۲
۱۹۳
۱۹۴
۱۹۵
۱۹۶
۱۹۷
۱۹۸
۱۹۹
۲۰۰
۲۰۱
۲۰۲
۲۰۳
۲۰۴
۲۰۵
۲۰۶
۲۰۷
۲۰۸
۲۰۹
۲۱۰
۲۱۱
۲۱۲
۲۱۳
۲۱۴
۲۱۵
۲۱۶
۲۱۷
۲۱۸
۲۱۹
۲۲۰
۲۲۱
۲۲۲
۲۲۳
۲۲۴
۲۲۵
۲۲۶
۲۲۷
۲۲۸
۲۲۹
۲۳۰
۲۳۱
۲۳۲
۲۳۳
۲۳۴
۲۳۵
۲۳۶
۲۳۷
۲۳۸
۲۳۹
۲۴۰
۲۴۱
۲۴۲
۲۴۳
۲۴۴
۲۴۵
۲۴۶
۲۴۷
۲۴۸
۲۴۹
۲۵۰
۲۵۱
۲۵۲
۲۵۳
۲۵۴
۲۵۵
۲۵۶
۲۵۷
۲۵۸
۲۵۹
۲۶۰
۲۶۱
۲۶۲
۲۶۳
۲۶۴
۲۶۵
۲۶۶
۲۶۷
۲۶۸
۲۶۹
۲۷۰
۲۷۱
۲۷۲
۲۷۳
۲۷۴
۲۷۵
۲۷۶
۲۷۷
۲۷۸
۲۷۹
۲۸۰
۲۸۱
۲۸۲
۲۸۳
۲۸۴
۲۸۵
۲۸۶
۲۸۷
۲۸۸
۲۸۹
۲۹۰
۲۹۱
۲۹۲
۲۹۳
۲۹۴
۲۹۵
۲۹۶
۲۹۷
۲۹۸
۲۹۹
۳۰۰
۳۰۱
۳۰۲
۳۰۳
۳۰۴
۳۰۵
۳۰۶
۳۰۷
۳۰۸
۳۰۹
۳۱۰
۳۱۱
۳۱۲
۳۱۳
۳۱۴
۳۱۵
۳۱۶
۳۱۷
۳۱۸
۳۱۹
۳۲۰
۳۲۱
۳۲۲
۳۲۳
۳۲۴
۳۲۵
۳۲۶
۳۲۷
۳۲۸
۳۲۹
۳۳۰
۳۳۱
۳۳۲
۳۳۳
۳۳۴
۳۳۵
۳۳۶
۳۳۷
۳۳۸
۳۳۹
۳۴۰
۳۴۱
۳۴۲
۳۴۳
۳۴۴
۳۴۵
۳۴۶
۳۴۷
۳۴۸
۳۴۹
۳۵۰
۳۵۱
۳۵۲
۳۵۳
۳۵۴
۳۵۵
۳۵۶
۳۵۷
۳۵۸
۳۵۹
۳۶۰
۳۶۱
۳۶۲
۳۶۳
۳۶۴
۳۶۵
۳۶۶
۳۶۷
۳۶۸
۳۶۹
۳۷۰
۳۷۱
۳۷۲
۳۷۳
۳۷۴
۳۷۵
۳۷۶
۳۷۷
۳۷۸
۳۷۹
۳۸۰
۳۸۱
۳۸۲
۳۸۳
۳۸۴
۳۸۵
۳۸۶
۳۸۷
۳۸۸
۳۸۹
۳۹۰
۳۹۱
۳۹۲
۳۹۳
۳۹۴
۳۹۵
۳۹۶
۳۹۷
۳۹۸
۳۹۹
۴۰۰
۴۰۱
۴۰۲
۴۰۳
۴۰۴
۴۰۵
۴۰۶
۴۰۷
۴۰۸
۴۰۹
۴۱۰
۴۱۱
۴۱۲
۴۱۳
۴۱۴
۴۱۵
۴۱۶
۴۱۷
۴۱۸
۴۱۹
۴۲۰
۴۲۱
۴۲۲
۴۲۳
۴۲۴
۴۲۵
۴۲۶
۴۲۷
۴۲۸
۴۲۹
۴۳۰
۴۳۱
۴۳۲
۴۳۳
۴۳۴
۴۳۵
۴۳۶
۴۳۷
۴۳۸
۴۳۹
۴۴۰
۴۴۱
۴۴۲
۴۴۳
۴۴۴
۴۴۵
۴۴۶
۴۴۷
۴۴۸
۴۴۹
۴۵۰
۴۵۱
۴۵۲
۴۵۳
۴۵۴
۴۵۵
۴۵۶
۴۵۷
۴۵۸
۴۵۹
۴۶۰
۴۶۱
۴۶۲
۴۶۳
۴۶۴
۴۶۵
۴۶۶
۴۶۷
۴۶۸
۴۶۹
۴۷۰
۴۷۱
۴۷۲
۴۷۳
۴۷۴
۴۷۵
۴۷۶
۴۷۷
۴۷۸
۴۷۹
۴۸۰
۴۸۱
۴۸۲
۴۸۳
۴۸۴
۴۸۵
۴۸۶
۴۸۷
۴۸۸
۴۸۹
۴۹۰
۴۹۱
۴۹۲
۴۹۳
۴۹۴
۴۹۵
۴۹۶
۴۹۷
۴۹۸
۴۹۹
۵۰۰
۵۰۱
۵۰۲
۵۰۳
۵۰۴
۵۰۵
۵۰۶
۵۰۷
۵۰۸
۵۰۹
۵۱۰
۵۱۱
۵۱۲
۵۱۳
۵۱۴
۵۱۵
۵۱۶
۵۱۷
۵۱۸
۵۱۹
۵۲۰
۵۲۱
۵۲۲
۵۲۳
۵۲۴
۵۲۵
۵۲۶
۵۲۷
۵۲۸
۵۲۹
۵۳۰
۵۳۱
۵۳۲
۵۳۳
۵۳۴
۵۳۵
۵۳۶
۵۳۷
۵۳۸
۵۳۹
۵۴۰
۵۴۱
۵۴۲
۵۴۳
۵۴۴
۵۴۵
۵۴۶
۵۴۷
۵۴۸
۵۴۹
۵۵۰
۵۵۱
۵۵۲
۵۵۳
۵۵۴
۵۵۵
۵۵۶
۵۵۷
۵۵۸
۵۵۹
۵۶۰
۵۶۱
۵۶۲
۵۶۳
۵۶۴
۵۶۵
۵۶۶
۵۶۷
۵۶۸
۵۶۹
۵۷۰
۵۷۱
۵۷۲
۵۷۳
۵۷۴
۵۷۵
۵۷۶
۵۷۷
۵۷۸
۵۷۹
۵۸۰
۵۸۱
۵۸۲
۵۸۳
۵۸۴
۵۸۵
۵۸۶
۵۸۷
۵۸۸
۵۸۹
۵۹۰
۵۹۱
۵۹۲
۵۹۳
۵۹۴
۵۹۵
۵۹۶
۵۹۷
۵۹۸
۵۹۹
۶۰۰
۶۰۱
۶۰۲
۶۰۳
۶۰۴
۶۰۵
۶۰۶
۶۰۷
۶۰۸
۶۰۹
۶۱۰
۶۱۱
۶۱۲
۶۱۳
۶۱۴
۶۱۵
۶۱۶
۶۱۷
۶۱۸
۶۱۹
۶۲۰
۶۲۱
۶۲۲
۶۲۳
۶۲۴
۶۲۵
۶۲۶
۶۲۷
۶۲۸
۶۲۹
۶۳۰
۶۳۱
۶۳۲
۶۳۳
۶۳۴
۶۳۵
۶۳۶
۶۳۷
۶۳۸
۶۳۹
۶۴۰
۶۴۱
۶۴۲
۶۴۳
۶۴۴
۶۴۵
۶۴۶
۶۴۷
۶۴۸
۶۴۹
۶۵۰
۶۵۱
۶۵۲
۶۵۳
۶۵۴
۶۵۵
۶۵۶
۶۵۷
۶۵۸
۶۵۹
۶۶۰
۶۶۱
۶۶۲
۶۶۳
۶۶۴
۶۶۵
۶۶۶
۶۶۷
۶۶۸
۶۶۹
۶۷۰
۶۷۱
۶۷۲
۶۷۳
۶۷۴
۶۷۵
۶۷۶
۶۷۷
۶۷۸
۶۷۹
۶۸۰
۶۸۱
۶۸۲
۶۸۳
۶۸۴
۶۸۵
۶۸۶
۶۸۷
۶۸۸
۶۸۹
۶۹۰
۶۹۱
۶۹۲
۶۹۳
۶۹۴
۶۹۵
۶۹۶
۶۹۷
۶۹۸
۶۹۹
۷۰۰
۷۰۱
۷۰۲
۷۰۳
۷۰۴
۷۰۵
۷۰۶
۷۰۷
۷۰۸
۷۰۹
۷۱۰
۷۱۱
۷۱۲
۷۱۳
۷۱۴
۷۱۵
۷۱۶
۷۱۷
۷۱۸
۷۱۹
۷۲۰
۷۲۱
۷۲۲
۷۲۳
۷۲۴
۷۲۵
۷۲۶
۷۲۷
۷۲۸
۷۲۹
۷۳۰
۷۳۱
۷۳۲
۷۳۳
۷۳۴
۷۳۵
۷۳۶
۷۳۷
۷۳۸
۷۳۹
۷۴۰
۷۴۱
۷۴۲
۷۴۳
۷۴۴
۷۴۵
۷۴۶
۷۴۷
۷۴۸
۷۴۹
۷۵۰
۷۵۱
۷۵۲
۷۵۳
۷۵۴
۷۵۵
۷۵۶
۷۵۷
۷۵۸
۷۵۹
۷۶۰
۷۶۱
۷۶۲
۷۶۳
۷۶۴
۷۶۵
۷۶۶
۷۶۷
۷۶۸
۷۶۹
۷۷۰
۷۷۱
۷۷۲
۷۷۳
۷۷۴
۷۷۵
۷۷۶
۷۷۷
۷۷۸
۷۷۹
۷۸۰
۷۸۱
۷۸۲
۷۸۳
۷۸۴
۷۸۵
۷۸۶
۷۸۷
۷۸۸
۷۸۹
۷۹۰
۷۹۱
۷۹۲
۷۹۳
۷۹۴
۷۹۵
۷۹۶
۷۹۷
۷۹۸
۷۹۹
۸۰۰
۸۰۱
۸۰۲
۸۰۳
۸۰۴
۸۰۵
۸۰۶
۸۰۷
۸۰۸
۸۰۹
۸۱۰
۸۱۱
۸۱۲
۸۱۳
۸۱۴
۸۱۵
۸۱۶
۸۱۷
۸۱۸
۸۱۹
۸۲۰
۸۲۱
۸۲۲
۸۲۳
۸۲۴
۸۲۵
۸۲۶
۸۲۷
۸۲۸
۸۲۹
۸۳۰
۸۳۱
۸۳۲
۸۳۳
۸۳۴
۸۳۵
۸۳۶
۸۳۷
۸۳۸
۸۳۹
۸۴۰
۸۴۱
۸۴۲
۸۴۳
۸۴۴
۸۴۵
۸۴۶
۸۴۷
۸۴۸
۸۴۹
۸۵۰
۸۵۱
۸۵۲
۸۵۳
۸۵۴
۸۵۵
۸۵۶
۸۵۷
۸۵۸
۸۵۹
۸۶۰
۸۶۱
۸۶۲
۸۶۳
۸۶۴
۸۶۵
۸۶۶
۸۶۷
۸۶۸
۸۶۹
۸۷۰
۸۷۱
۸۷۲
۸۷۳
۸۷۴
۸۷۵
۸۷۶
۸۷۷
۸۷۸
۸۷۹
۸۸۰
۸۸۱
۸۸۲
۸۸۳
۸۸۴
۸۸۵
۸۸۶
۸۸۷
۸۸۸
۸۸۹
۸۹۰
۸۹۱
۸۹۲
۸۹۳
۸۹۴
۸۹۵
۸۹۶
۸۹۷
۸۹۸
۸۹۹
۹۰۰
۹۰۱
۹۰۲
۹۰۳
۹۰۴
۹۰۵
۹۰۶
۹۰۷
۹۰۸
۹۰۹
۹۱۰
۹۱۱
۹۱۲
۹۱۳
۹۱۴
۹۱۵
۹۱۶
۹۱۷
۹۱۸
۹۱۹
۹۲۰
۹۲۱
۹۲۲
۹۲۳
۹۲۴
۹۲۵
۹۲۶
۹۲۷
۹۲۸
۹۲۹
۹۳۰
۹۳۱
۹۳۲
۹۳۳
۹۳۴
۹۳۵
۹۳۶
۹۳۷
۹۳۸
۹۳۹
۹۴۰
۹۴۱
۹۴۲
۹۴۳
۹۴۴
۹۴۵
۹۴۶
۹۴۷
۹۴۸
۹۴۹
۹۵۰
۹۵۱
۹۵۲
۹۵۳
۹۵۴
۹۵۵
۹۵۶
۹۵۷
۹۵۸
۹۵۹
۹۶۰
۹۶۱
۹۶۲
۹۶۳
۹۶۴
۹۶۵
۹۶۶
۹۶۷
۹۶۸
۹۶۹
۹۷۰
۹۷۱
۹۷۲
۹۷۳
۹۷۴
۹۷۵
۹۷۶
۹۷۷
۹۷۸
۹۷۹
۹۸۰
۹۸۱
۹۸۲
۹۸۳
۹۸۴
۹۸۵
۹۸۶
۹۸۷
۹۸۸
۹۸۹
۹۹۰
۹۹۱
۹۹۲
۹۹۳
۹۹۴
۹۹۵
۹۹۶
۹۹۷
۹۹۸
۹۹۹
۱۰۰۰

نتیجہ یہ کہ لینن کے زمانہ تک تو کمیونزم کا معاشی نظام چلا۔ اس کے بعد اسٹیلن کو، اسے چلانے کے لئے ڈنڈے کی ضرورت پڑی۔ لیکن ڈنڈے کے زور پر کوئی نظام زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اسٹیلن کے بعد اس کی گاڑی رک گئی۔ اور روس کو اس نظام میں خاصا رد و بدل کرنا پڑا۔ اس وقت چین اور روس میں جو تنازع چل رہا ہے وہ یہی ہے کہ روس میں یہ نظام اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہا اور چین اس پر مضرب ہے کہ اسے اس شکل میں باقی رکھا جائے۔ چین میں یہ نظام اپنی اصلی شکل میں اس لئے قائم ہے کہ اس وقت ان کے ہاں، وہ پارٹی موجود ہے جس کے ہاتھوں یہ انقلاب عمل میں آیا تھا۔ اس اعتبار سے، چین اس وقت اس مقام پر ہے جس مقام پر روس لینن کے زمانہ تک تھا۔ جب چین کی موجودہ نسل کے بعد، اگلی نسل آئے گی تو ان کے سینوں میں بھی وہ جذبہ باقی نہیں رہے گا جو اس نظام کے قیام کے لئے اس قدر تریبانی چاہتا ہے۔ اس وقت وہاں بھی پہلے اسٹیلن کے ڈنڈے کی ضرورت پڑے گی۔ اور اس کے بعد اس نظام کی گاڑی آگے چلنے سے رک جائے گی۔

یہ بنیادی نقص، کمیونزم کے فلسفہ حیات کا جس کی وجہ سے ان کا معاشی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔

اسلام کا فلسفہ حیات

اس کے برعکس، اسلام کے فلسفہ حیات کو لیجئے۔ میں نے بتایا ہے کہ اسلام کے فلسفہ حیات کی رُو سے انسانی زندگی کا مقصود، انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ اور یہ نشوونما ان مستقل اقدار کی پابندی سے ہو سکتی ہے جو انسان کو وحی کی رو سے عطا ہوئی ہیں۔ ان اقدار میں ایک بنیادی قدر یہ ہے کہ

اَلَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ۝ (۱۲۰)۔ جو شخص اپنی کمائی دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیتا ہے، اس کی ذات کی نشوونما ہو جاتی ہے۔ اب آپ دیکھئے کہ قرآن کے فلسفہ حیات کی

(۱) انسانی زندگی کا مقصد پھر، انسانی ذات کی نشوونما۔ اور

(۲) انسانی ذات کی نشوونما اس طرح ہوتی ہے کہ انسان پوری محنت سے کمائے اور زیادہ

سے زیادہ دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بطیب خاطر دے۔

جس شخص کا اس فلسفہ حیات پر ایمان (یقین) ہوگا اس سے کام کرانے کے لئے نہ کسی ڈنڈے کی ضرورت پڑے گی اور نہ ہی اس کی زائد کمائی کو اس سے ذبردستی چھیننے کی حاجت۔ وہ خود اپنی ذات کی بھلائی کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت کرے گا اور اس میں سے کم از کم اپنے لئے رکھ کر باقی سب، اپنے دل کی کامل رضامندی سے دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے دیدے گا۔ یہ ہے کمیونزم کے فلسفہ حیات اور اسلام کے فلسفہ حیات کا اثر ان کے معاشی نظام پر۔ پروفیسر ہاٹری (HAWTREY) نے لکھا ہے کہ

جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبہ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام پر آمادہ کرتا ہے۔

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ (جزئیات میں اس قدر مماثلت کے باوجود) متراں کا معاشی نظام کمیونزم کے معاشی نظام سے کس قدر متمیز ہے۔ کمیونزم کے معاشی نظام کے پاس وہ بنیاد نہیں جس پر اس قدر عظیم عمارت قائم رہ سکے۔ اور متراں کا معاشی نظام ایسی محکم بنیادوں پر استوار ہے کہ لَا اَنْفِصَامَ لَهَا۔ وہ کبھی منہدم ہی نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ حقیقت کہ بڑی بے جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے روس کی توجہ خاص طور پر مبذول کرانی تھی۔ انہوں نے پہلے، کمیونزم کے فلسفہ حیات کا تجزیہ کیا اور بتایا کہ

کردہ ام اندر ممتا تاش نگاہ
لا سلاطین۔ لا کلیسا۔ لا الحج

یعنی ان کا جذبہ محرکہ سارے کا سارا تخریبی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب آپ کسی غلط نظام کہنے کی جگہ دوسرا نظام لانا چاہیں گے تو آپ کو (سب سے پہلے) اس نظام کو اوپر سے نیچے تک منہدم کرنا پڑے گا۔ یہ عمل یکسر تخریبی ہوگا۔ لیکن یہ اس پر وگرام کی پہلی کڑی ہوگی۔ اس تخریب کے بعد تعمیر شروع ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ

در ممتام لایبیا ساید حیات

سوئے الآ می حنرا مدکانات

لا (تخریب) کے بعد الآ (تعمیر) لاینفک ہے۔ اگر الآ (تعمیر) نہ ہو تو زندگی کو کبھی اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد انہوں نے روس کو مخاطب کر کے کہا کہ

بگذرا ز آ۔ جانب الآ حرام

کردہ کار حنرا ونداں تمام

تو نے باطل کے ہر خدا کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ تو نے ملوکیت کو جڑ بنیاد سے اکھڑ دیا۔ تو نے نظام سرمایہ دار کا جنازہ نکال دیا۔ تو نے مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ کر دیا۔ تو نے یہ کچھ تو کر دیا۔ اور یہ بہت بڑا کارنامہ ہے جو تیرے ہاتھوں میں انجام پایا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے بعد وہ مثبت بنیاد کونسی ہے جس پر تو اپنے نظام نو کی عمارت استوار کرنا چاہتا ہے۔

اے کہ می خواہی نظامِ عالی

جستہ اور اساس محکمے!

یہ اساس محکمہ جو نظام سرمایہ داری کی شکست و ریخت کے بعد ایک صحیح معاشی نظام کی بنیاد بن سکنے کے قابل ہے، صرف قرآن کے عطا کردہ فلسفہ حیات سے مل سکتی ہے۔ اسی لئے انہوں نے مسلمانوں میں سرفرائس ینگ کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ

(BOLSHEVISM PLUS GOD IS ALMOST IDENTICAL

WITH ISLAM.)

اگر بالشوزم کے ساتھ خدا کو شامل کر دیا جائے تو وہ اسلام کے حامل ہو جاتا ہے۔ خدا کو شامل کرنے سے ان کی مراد یہی تھی کہ اس نظام کو خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ انہیں امید تھی کہ روس جب اپنے جذباتی بحران سے نکل جائے گا تو اس "اساس محکمہ" کی تلاش ضرور کرے گا۔ لیکن روس نے اپنا مقام ہی چھوڑ دیا۔ اب وہی پوزیشن چین کی ہے۔ اس نے بھی ملوکیت۔ سرمایہ داری۔ اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ لیکن اس حصہ لاکے بعد، حصہ آٹھ اس کے پاس بھی نہیں۔ اے کاش! آج کوئی اقبال، چین کو بتا سکے کہ وہ اساس محکمہ کونسی ہے جس پر اس کے نظام کی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا، تو ظاہر ہے کہ جو کچھ روس کے ساتھ ہوا ہے، وہی کچھ ایک نسل کے بعد چین کے ساتھ بھی ہو گا۔ اور اگر ایسا ہوا تو یہ دنیا کی انتہائی بد قسمتی ہوگی۔ دنیا کی قسمت کے ستارے تو قرآن کے سر اجا منیڈر ہی سے جگمگا سکتے ہیں۔

ایک اعتراض

نظام سرمایہ داری کے حامیوں کی طرف سے اعتراض کیا جاتا ہے (اور یہی اعتراض اس نظام کے حق

میں بطور دلیل محکم پیش کیا جاتا ہے کہ ذاتی مفاد ہی وہ جذبہ محرکہ ہے جس کے ماتحت انسان محنت و مشقت کرتا ہے اگر اس جذبہ کو نکال دیا جائے تو کوئی شخص جان مار کر محنت نہیں کرتا۔ اس اعتراض کو پیش کیا جاتا ہے اور پھر روس کی مثال دے کر کہا جاتا ہے کہ دیکھ لیجئے! اس جذبہ کو نکال دینے سے اشتراکی نظام کس طرح ناکام رہ گیا۔

یہ اعتراض کیونترزم کے فلسفہ حیات کے پیش نظر واقعی بڑا دفع ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی بتایا ہے۔ روس کے ناکام تجربہ نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ اس فلسفہ کی رو سے انسان کے لئے کام کرنے کا جذبہ محرکہ کوئی نہیں رہتا۔ لیکن متراں کریم کی آئیڈیالوجی کے مطابق اس اعتراض کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہتی۔ یہ درست ہے کہ انسان اپنے ذاتی مفاد کو کبھی نہیں چھوڑتا۔ اور ذاتی مفاد ہی کام کے لئے جذبہ محرکہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ انسان بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے فائدے کو قربان کر دیتا ہے۔ (مثلاً) انسان مال سے محبت رکھتا ہے اسے محنت سے کماتا اور بڑی احتیاط سے جمع کرتا ہے، لیکن جب وہ بیمار ہو جاتا ہے تو اپنی جان بچانے کے لئے بے دریغ مال خرچ کر دیتا ہے جو ایسا نہیں کرتا اس پر سب نعن طعن کرتے ہیں، یہ اس لئے کہ اس کے نزدیک، اس کی جان کی قیمت مال کی قیمت سے زیادہ ہے۔ وہ زیادہ قیمتی متاع کو بچانے کی خاطر، کم قیمت کی متاع صرف کر دیتا ہے۔

تراخی آئیڈیالوجی کی رو سے مال کی بھی ایک قیمت ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ قیمت انسانی ذات کی ہے۔ لہذا، جب وہ اپنی ذات کے استحکام کی خاطر، مال دوسروں کو دیتا ہے تو وہ اپنے بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے فائدے کو قربان کر دیتا ہے اور اسے نفع کا سودا سمجھتا ہے۔ لہذا، اس فلسفہ حیات کے مطابق، انسان اپنے فائدے کو چھوڑتا نہیں بلکہ کم فائدے کو چھوڑ کر، زیادہ فائدے کی طرف لپکتا ہے۔ اس لئے نظام سرمایہ داری کے حامیوں کی طرف سے جو اعتراض کیا جاتا ہے، اس کا جواب کیونترزم کے فلسفہ حیات کی رو سے تو واقعی نہیں مل سکتا۔ لیکن تراخی نظریہ زندگی کی رو سے اس اعتراض کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہتی۔ اور اس کا اعتراف تو خود اس نظام کے علمبردار بھی کرتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کے محسوسے نصب اور ان کی یادگاریں قائم کرتے ہیں جنہوں نے بڑی محنت سے مال کمایا اور اسے نوع انسان کی بہبود کی خاطر وقف کر دیا۔ دنیا میں آج تک کسی شخص یا کسی قوم نے کسی ایسے آدمی کی یادگار قائم نہیں کی جس نے

کروروں روپے مکملے لیکن اس دولت کو اپنے یا اپنی اولاد کے لئے مخصوص رکھا اور اسی حالت میں مر گیا۔ دنیا نے ایسے افراد پر ہمیشہ لعنت بھیجی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے بقا اور دوام کا اصول یہ ہے کہ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فِيمَا كَفَرُوا فِي الْأَرْضِ (۱۳)

دنیا میں باقی وہی رہتا ہے جو عالمگیر انسانیت کیلئے منفعت بخش ہو۔

دیگر اقوام میں اس قسم کے افراد مستثنیات میں سے ہوتے ہیں، قرآن کریم ہر مومن کو اسی خصوصیت کا حامل بناتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک سوسائٹی کی تشکیل کرتا ہے جس کی ممبر شپ رکینیت کی اولین شرط

وہ معاہدہ ہے جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے یعنی — اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰ مِنَّا

اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۱۴)۔ وہ عہد کرتا ہے کہ میں نے اپنا مال حتیٰ کہ اپنی جان

اس نظام کے ہاتھوں فروخت کر دی ہے جو نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے تو این خداوندی کے مطابق

تاقیم ہوا ہے۔ اس معاہدہ کے بعد ایک شخص، اسلامک سوسائٹی کا ممبر بنتا ہے۔ اسے مسلمان کہتے ہیں لہذا

مسلمان کی تو کوئی شے بھی ذاتی ملکیت کی نہیں ہوتی۔ وہ دن رات محنت کرتا ہے اور اس کے ماحصل کو اس

نظام خداوندی کی تحویل میں دیدیتا ہے۔ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے اور عند الضرورت

اپنی جان تک بھی اس مقصد عظیم کی خاطر قربان کر دیتا ہے۔ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُونَ

وَيُقْتَلُونَ قَدْ (۱۵)۔ وہ خدا کی راہ میں جنگ کرنے کی خاطر سر بکھٹ میدان میں نکل آتے ہیں پھر یا تو

فاتح و منصور واپس آتے ہیں اور یا میدان میں سر دیدیتے ہیں۔ یوں وہ ایک بڑے فائدے کی خاطر کم فائدے

کو قربان کر دیتے ہیں۔ یہ ہے وہ سوسائٹی جو دنیا میں اس معاشی نظام کو قائم کرتی ہے جس کی تفصیل میں

قرآن کریم کی آیات کی رو سے، آپ کے سامنے پیش کی ہیں۔ اس قسم کا نظام، یہی سوسائٹی قائم کر سکتی

ہے۔ اس سوسائٹی نے عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہک میں اس نظام کو قائم کر کے دکھا دیا۔

اور یہی ہے وہ نظام جو دنیا میں آخر الامر قائم ہو کر رہے گا خواہ ملکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوا

کی قوتیں اس کے راستے میں کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ پیدا کریں قرآن کریم کو قیامت تک محفوظ ہی اس لئے

رکھا گیا ہے کہ اسے نوع انسان کا عالمگیر ضابطہ حیات بنانا ہے۔ جس قوم نے بھی اسے اپنا ضابطہ حیات

بنالیا، اس کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہوگا۔

واضح رہے کہ قرآن کریم اس نظام کے قیام کے لئے ذرائع بھی کوئی اسے استعمال نہیں کئے دیتا

جو مستقل اقدار کے خلاف ہوں۔ اس کے نزدیک جس طرح غلط راستہ صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتا اسی طرح غلط ذریعہ سے صحیح مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ ذریعہ اور مقصد میں فرق ہی نہیں کرتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے یوگوسلاویہ کے مشہور اشتراکی، ڈاکٹر جیلاس نے (جسے اسی اختلاف کی بنا پر وہاں کے اشتراکیوں نے قید کر دیا تھا) ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

تاریخ میں کسی ایسے مثالی معاشرہ کی مثال نہیں ملتی جو غیر مثالی اور غیر نظری طریقوں سے حاصل کیا گیا ہو، بالکل ایسے ہی جیسے غلاموں نے کبھی کوئی آزاد معاشرہ قائم نہیں کیا۔ نصب العین کی عظمت اور حقیقت کا اظہار صرف اس سے ہوتا ہے کہ اس کے حصول کے لئے طریقے کیا اختیار کئے گئے ہیں۔

آپ قرآن کریم پر غور کیجئے۔ وہ "صحیح راستہ" کا سراغ دیتا ہے۔ وہ صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ ہدایت یعنی "راہِ نمائی" عطا کرتا ہے۔ وہ "سبیلِ اللہ" (خدا کی طرف لیجانے والے راستے) کو اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ کہ جس نے صحیح راستہ اختیار کر لیا وہ صحیح منزل تک ضرور پہنچ جائے گا۔ لیکن جب راستہ ہی غلط ہو تو پھر صحیح منزل کیسے ملنے آئے گی؟

یہ ہے عزیزانِ سن! میری بصیرت کے مطابق قرآن کریم کا معاشی نظام۔

سوالات

رخطاب کے بعد سامعین کی طرف سے بعض نکات کا وضاحت کے لئے کچھ سوالات کئے گئے۔ ان میں سے دو ایک سوالات کے جواب تو اسی وقت دیدیئے گئے لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے باقی دعوتِ فردا پر رکھ دیئے گئے۔ ان میں سے اہم سوالات اور ان کے جوابات درج ذیل ہیں۔ ان سے نفسِ مضمون کے مزوری مقامات کی تشریح ہو جاتی ہے۔

پہلا سوال — اقوامِ مغرب

آپ نے کہا ہے کہ جس کی اس دنیا کی زندگی ذلت اور سستی کی ہوگی اس کی عاقبت بھی خراب ہوگی۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس کی اس دنیا کی زندگی خوش حالی کی ہوگی وہ عاقبت میں کبھی سرخرو ہوگا۔ اقوام مغرب کی اس دنیا کی زندگی بڑی خوش حالی کی زندگی ہے۔ کیا وہ آخرت میں جنت میں جائیں گی؟

جواب

میرے عزیز! میں نے جو کچھ کہا ہے اور آپ نے اس سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ میں کہتا ہوں کہ جو طالب علم اپنی کلاس (ATTEND) نہیں کرے گا وہ امتحان میں کامیاب نہیں ہوگا۔ اس پر آپ کہتے ہیں کہ [اس کے یہ معنی ہوئے کہ] جو طالب علم کلاس میں حاضر رہے گا وہ امتحان میں کامیاب ہو جائے گا۔ آپ نے غور کیا کہ آپ کا یہ نتیجہ کس قدر غلط ہے۔ جو طالب علم کلاس میں حاضر ہوگا اسے امتحان میں کامیابی کے لئے کچھ اور کبھی کرنا ہوگا۔ جو کچھ پڑھایا جائے اسے غور و فکر سے سنتا اور سمجھتا۔ اسے یاد رکھتا۔ اس کے اظہار کی قابلیت پیدا کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ جو طالب العلم ان تمام شرائط کو پورا کرے گا وہ امتحان میں کامیاب ہوگا، نہ کہ وہ طالب العلم جو کلاس میں حاضر تو رہے لیکن دیگر شرائط کو پورا نہ کرے۔

دین وہ پروگرام دیتا ہے جس سے انسان کی اس دنیا کی زندگی کامیابی و کامرانی کی زندگی ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی سرفرازی و سرخروئی کی زندگی۔ اگر ایک نفلہ میں کہنا چاہیں تو اس کا پروگرام یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے سے اس دنیا کی زندگی مرزا الحالی کی زندگی ہو جاتی ہے۔ اور ان قوتوں کے حاصل مستقل اقدار کے مطابق صرف کرنے سے عاقبت سنور جاتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو دنیا میں تین قسم کی قومیں ملیں گی۔

- (۱) وہ قوم جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کرے۔ اس قوم کی اس دنیا کی زندگی بھی درخشندہ ہوگی اور عاقبت بھی تابندہ۔ اسے جامع مومنین کہا جاتا ہے۔
- (۲) وہ قوم جو فطرت کی قوتوں کو تو مسخر کر لے لیکن انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف نہ کرے۔ اس قوم کو اس دنیا میں مرزا الحالی نصیب ہو جائے گی لیکن اس کی عاقبت تاریک رہے گی۔ اور
- (۳) وہ قوم جو فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کرتی اس کی اس دنیا کی زندگی سستی اور ذلت کی ہوگی۔ اور جب وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتی۔ تو ان قوتوں کو مستقل اقدار کے مطابق صرف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اس لئے اس قوم کا آخرت کی زندگی میں کیا حصہ ہو سکتا ہے؟ یہ قوم کونسی ہے؟

ہیں کے متعلق آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے۔

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی،

دوسرا سوال۔ مغرب کے خدا پرست

مغرب کی جمہوری قومیں خدا پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور روس اور چین کے کمیونسٹ خدا کے منکر و دھڑکیے ہیں۔ آپ اسلام کے نقطہ نگاہ سے ان دونوں میں سے کسے ترجیح دیں گے۔

جواب

جہاں تک قرآنی نقطہ نگاہ سے خدا کو ماننے کا تعلق ہے، مغرب کے (مزعومہ) خدا پرست اور روس اور چین کے دھڑکیے دونوں ایک جیسے ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اس کی تعین کردہ اتداری اصول و احکام کو اپنے معاملات کے فیصلوں کا معیار اور حکم بنایا جائے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ اس کے نزدیک خدا پرست نہیں کافر ہے۔ اس کا واضح اعلان ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ﴿۸۷﴾

جو کتاب اللہ کے مطابق زندگی کے معاملات کے فیصلے نہیں کرتا۔ تو یہی لوگ کافر ہیں۔

لہذا، قرآنی فلسفہ زندگی کے مطابق، مغرب کی قوموں اور روس و چین میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ جہاں تک ان کے معاشی نظام کا تعلق ہے، مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام، قرآن کے معاشی نظام کی یکسر نقیض ہے اور شتر کی نظام، قرآن کے معاشی نظام سے ملتا جلتا ہے۔ شتر کی نظام میں اگر (بقول اقبال) خدا شامل کر لیا جائے تو اسلامی نظام ہو سکتا ہے۔ لیکن مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں خدا کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں۔

یہ انسانیت کی بدقسمتی تھی کہ کارل مارکس کے سامنے جو خدا آبادہ مذہبی پیشوائیت کا تراشیدہ خدا تھا۔ اس خدا کا تصور ذاتی نظام ملکیت و سرمایہ داری کا پیدا کردہ اور عوام کے لئے "افیون" تھا۔ وہ اس خدا سے انکار نہ کرتا تو کیا کرتا؟ اگر اس کے سامنے کہیں قرآن کے پیش کردہ خدا کا تصور ہوتا تو وہ اسے اپنا ہادی و مرشد مانتا۔ مارکس زیادہ سے زیادہ یہاں تک پہنچا تھا کہ ذرائع پیداوار ہر کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ اور قرآن کے خدا کا اعلان ہے کہ کائنات کی کسی شے پر بھی کسی انسان کی

ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ سوچئے کہ اس خدا کو ملنے والے سے بڑا "کمیونسٹ" اور کون ہو سکتا ہے۔ کارل مارکس درحقیقت اس مذہبی پیشوائیت کا انکار کرنا چاہتا تھا جس کے ہاتھوں انسانیت اس قدر زار و نالاں تھی۔ لیکن چونکہ مذہبی پیشوائیت اپنے آپ کو خدا کا نمائندہ قرار دیتی تھی اس لئے اسے اس خدا سے بھی انکار کرنا پڑا۔ اس کے دل ورو مندی یہی وہ ذہنی لغزش تھی جس کی بنا پر اقبال اسے کبھی "پینے بے تیل" کہتا ہے اور کبھی "قلب اومومن ومانعش کافر است" سے تعبیر کرتا ہے (جاوید نامہ صفحہ ۹۶)۔ کبھی اسے "کلیم بے تجلی" کہتا ہے اور کبھی "سچ بے صلیب" اور "نیت پیغمبر لیکن در نعل دار و کتاب" سے اس کے نظام کی تعریف اور اس کے فلسفہ کی تردید کرتا ہے۔ (ارمغان حجاز صفحہ ۳۱۹)۔ مغرب کی سرمایہ پر قوموں نے مارکس کی اس اجتہادی غلطی سے فائدہ اٹھایا اور دنیا کے خدا پرستوں کو اکٹھے ہو جاؤ "کے نعرے اشتراکیت کی مخالفت کے لئے ایک "مقدس متحدہ محاذ" قائم کر لیا اور اس کا ہر اہل دستہ خود مسلمانوں کو بنایا۔ ان مسلمانوں کو جن کا دین، سرمایہ پرستی کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ یہ ہے مغرب کی وہ ایسی سیاست جو خدا کا نقاب اوڑھ کر وجہ فریب عالم بن رہی ہے اور بھولا بھالا بلکہ یوں کہئے کہ خود فراموش مسلمان اس کا سب سے پہلا شکار ہو رہا ہے۔

تیسرا سوال۔ مسلمانوں کے ہاں یہ تبدیلی کیسے پیدا ہوتی

آپ نے کہا ہے کہ عبد بنی کریم اور صحابہ میں قرآن کا یہ معاشی نظام قائم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ان کی گاڑی اس پڑی سے ہٹ گئی اور سرمایہ دارانہ نظام ان کے ہاں ور آیا۔ یہ کیسے ہوا اور کب ہوا؟

جواب

یہ اس وقت ہوا جب مسلمانوں میں ملوکیت آگئی۔ واضح رہے کہ ملوکیت کے معنی وراثتی بادشاہت ہی نہیں۔ اسلام کی رو سے کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حکومت کا حق صرف خدا کو ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی ایک انسان یا انسانوں کی جماعت کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اپنی طرف سے قوانین مرتب کر کے ان کی اطاعت دوسروں سے کرائے۔ انسانوں کی اطاعت کے لئے قوانین ذات درخدا نے مقرر کر دی ہیں۔ حکومت اس ایجنسی کا نام ہے جو ان قوانین کو دنیا

میں نافذ کرتی ہے۔ اس ایکجیسی کو "خلافت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ملکیت اس انداز حکومت کو کہتے ہیں جس میں انسانوں کو قانون سازی کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اسلام نے ملکیت کو مٹایا اور اس کی جگہ خدا کی حکومت کو قائم کیا تھا۔ خدا کی حکومت میں نظام سرمایہ داری باہمی نہیں پاسکتا۔ اسی لئے تو ابو جہل نے اپنے خداؤں کے ہاں فریاد کرتے ہوئے کہا تھا کہ۔ خوب می دامنم کہ سماں مزد کی است۔ (جہادینامہ) جب مسلمانوں میں ملکیت آگئی تو اس کا فطری نتیجہ سرمایہ داری اور جاگیر داری کا نظام تھا۔ ملکیت، عالمگیر انسانیت کے مفاد کا نہیں بلکہ ایک خاص گروہ کے مفاد کا تحفظ کرتی ہے۔ لیکن اتنی بڑی تبدیلی "خدائی سند" کے بغیر کیسے پیدا کی جاسکتی تھی؟۔ یہ خدائی سند مذہبی پیشوائیت نے اپنی خود تراشیدہ شریعت کی رو سے بہم پہنچادی۔ ملکیت سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ شروع سے چلا آ رہا ہے۔ اسی لئے تو قرآن کریم نے فرعون کے ساتھ قارن اور ہامان کو بھی ایک جھمٹ میں گھرا کیا ہے۔ وہ دن اور آج کا دن ملکیت سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت، اسلام کے اقنوم ثلاثہ بنے ہوئے ہیں۔ یہی وہ نظام ہے جو آج اسلام کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔ قرآن کریم نے بے نص صریح دولت جمع کرنے کو جہنم کا عذاب بتایا۔ رسول اللہ نے تمام عمر ایک پائی بھی جمع نہ کی۔ حتیٰ کہ وفات کے وقت حضور کو معلوم ہوا کہ گھر میں کہیں سے سات دینا آئے ہیں۔ "آپ نے انہیں اسی وقت بیت المال بھجوا دیا یہ فرماتے ہوئے کہ میں خدا کے سامنے اس حالت میں نہیں جانا چاہتا کہ میرے گھر میں چاندی اور سونے کے ٹکڑے ہوں۔ یہ تھا وہ اسلام جسے خدا نے انسانوں کے لئے تجویز کیا اور جس پر اس کے رسول نے عمل کر کے دکھایا۔ لیکن اب ان حضرات کی طرف سے جو اسلام پیش کیا جاتا ہے اس کا فیصلہ یہ ہے کہ

جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس کے تعلق رکھتے والے شرعی حقوق و واجبات

ادا کئے جاتے رہیں ابلا حد و نہایت رکھی جاسکتی ہے۔ روپیہ۔ پیسہ۔ جانور۔ استعمالی اشیاء

مکانات۔ سواری۔ غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔

حالت اب یہ ہے کہ یہ حضرات اسے تو بہ شد و مد بیان کریں گے کہ پاجامہ ٹخنوں سے نیچے رکھنا خلاف سنت ہے لیکن یہ کبھی نہیں بتائیں گے کہ گھر میں چاندی سونے کے سگے جمع رکھنا خلاف حکم خداوندی اور خلاف

سنت رسول اللہ ہے۔ یہ اڑھائی فی صد کے حساب سے زکوٰۃ نکال دینے کے بعد باقی کروڑوں روپوں کو پاک اور صاف قرار دیدیں گے لیکن اسے کبھی نہیں بیان کریں گے کہ رسول اللہ نے ساری عمر زکوٰۃ ادا نہیں کی کیونکہ آپ نے کبھی روپیہ جمع ہی نہیں کیا تھا۔ یہ حضرات اس اہم مسئلہ پر تو گھنٹوں بحث کریں گے کہ یتیم پوتے کو اس کے دادا کے ترکہ سے حصہ نہیں مل سکتا۔ کیونکہ وہ یتیم ہے! لیکن یہ کبھی نہیں بتائیں گے کہ حضور نبی اکرم نے خود کوئی ترکہ کیوں نہیں چھوڑا تھا اور جو شیلے سے مستعد چھوڑی تھیں اس کے متعلق یہ کیوں نہ مایا تھا کہ کسی کو وراثت میں نہیں مل سکتیں۔ اس کے لئے یہ حضرات یہ کہہ دیتے ہیں کہ حضور نے نہ سرمایہ کیا تھا کہ ہم گروہ انبیاء کا ترکہ وراثت میں تقسیم نہیں ہو سکتا۔ گویا ان حضرات کے نزدیک حضرات انبیاء کرام کے لئے اسلام کوئی اور ہوتا تھا اور ان کی امت کے لئے کوئی اور۔ (یا اللعجب!) یہ حضرات سرقہ چوری، کے نصاب کے متعلق تو پیروں گفتگو فرمائیں گے لیکن یہ نہیں بتائیں گے کہ حضرت عمر نے ان غلاموں کو چوری کا مجرم کیوں قرار نہیں دیا تھا جنہوں نے بھوک سے مجبور ہو کر کھانے کی چیزوں کی چوری کی تھی اور ان کی جگہ ان کے مالک کو یہ کہہ کر سزا دی تھی کہ تم نے انہیں بھوکا کیوں رکھا جس کی وجہ سے یہ چوری کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ اس لئے نہیں بتائیں گے کہ اس سے ان کے پیش کردہ معاشی نظام (سرمایہ داری) کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے۔

وہ تھا اسلام جسے خدا نے انسانوں کے لئے تجویز کیا اور جس پر اس کے رسول اور حضور کے متبعین نے عمل کر کے دکھایا۔ اور یہ ہے وہ اسلام جو ہمارے دورِ ملوکیت کا پیدا کردہ ہے۔

چوتھا سوال — ترکہ۔ صدقہ۔ زکوٰۃ کے احکام

لیکن قرآن مجید میں صدقہ۔ وراثت۔ زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بھی تو ہیں۔ اگر روپیہ جمع نہیں کیا جاسکتا تو ان احکام کے معنی کیا ہوں گے۔

جواب

جس طرح اسلامی مملکت کا قیام ایک دن میں عمل میں نہیں آسکتا تھا۔ یہ بتدریج عمل میں آئی تھی لہٰذا قرآن مجید میں بہتس احکام کے متعلق یہ آیا ہے کہ وہ رسول اللہ کی ذات کے لئے مخصوص تھے جیسے حضور کی ازواج معہرات کے ساتھ کسی اور کا نکاح نہیں ہو سکتا تھا، لیکن معاشی نظام کے سلسلہ میں کوئی ایسا حکم نہیں ہے حضور کی ذات کے لئے مخصوص کیا گیا ہو۔

اسی طرح، اس کا معاشی نظام بھی شباشب وجود میں نہیں آسکتا تھا۔ اسے بھی بتدریج ہی عمل میں لایا جاسکتا تھا۔ قرآن کریم نے اسی تدریجی پروگرام کے مطابق اپنے احکام دیئے ہیں۔ صدقہ۔ وراثت وغیرہ احکام اس دور سے متعلق ہیں جب یہ نظام ہنوز اپنی آخری شکل میں قائم نہیں ہوا تھا لیکن اسے بتدریج عمل میں لایا جا رہا تھا۔ ان احکام پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان کی رُو سے بھی ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھتا ہے جو قرآنی نظام کا منہتی ہے۔ یعنی ان کی رُو سے دولت، افراد کے ہاں مرکزیت کے بجائے معاشرہ میں بکھرتی جاتی ہے۔ عبوری دور میں یہ احکام نافذ العمل رہے تا آنکہ یہ نظام قائم ہو گیا جس میں یہ کہدیا گیا کہ۔ **يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (۲۱۹)** یہ پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال دوسروں کی ضروریات کے لئے دیدیں ان سے کہد کہ جس قدر ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ واضح رہے کہ رسول اپنی امت کو بتدریج اس منہتی کی طرف لاتا ہے لیکن اس کی اپنی زندگی شروع ہی سے اس آئیڈیل (منہتی) کے مطابق ہوتی ہے تاکہ وہ لوگوں کے لئے نمونہ بنے۔ یہ وجہ ہے کہ حضور نے ساری عمر نہ مال جمع کیا۔ نہ کوئی جا پیدا بنائی۔ اور اس لئے نہ ہی کچھ ترکہ میں چھوڑا اور بجز چند مستعمل اشیاء کے اور ان کے متعلق کہدیا کہ وہ وراثت میں تقسیم نہیں ہوں گی۔ حضور کا یہ فیصلہ اپنی ذات (یا عرفہ انبیاء کریم) کے لئے نہیں تھا۔ یہ قرآن کے پیش کردہ مثالی معاشرہ کا آئینہ دار تھا جس تک وہ سب کو بتدریج پہنچانا تھا۔

جب ملکیت آگئی تو اسلام کا معاشی نظام رنگا ہوں سے اوجھل کر دیا گیا اور یہ عبوری دور کے احکام مستقل احکام بنا دیئے گئے۔ اب یہ احکام ہماری شریعت ہیں۔ یعنی سفر بلا منزل۔



اساس حکم

(شائع شدہ ستمبر ۱۹۶۶ء)

کیونترزم اور اسلام سے متعلق عنوان میں ہم نے کہا یہ تھا کہ روس میں کمیونترزم اس لئے ناکام ہو گئی ہے کہ ان کے پاس وہ اساس حکم نہیں جس پر یہ عمارت استوار کی گئی تھی۔ اور چونکہ چین کے ہاں بھی اس اساس کا فقدان ہے اس لئے وہاں بھی یہ کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اس سلسلے میں ہم سے پوچھا گیا ہے کہ وہ اساس حکم کیا ہے جس کی عدم موجودگی سے ان کا اس قدر انقلابی پروگرام کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ اور اسلام وہ کون سی اساس بتیا کرتا ہے جس سے اس کا عالمگیر معاشی پروگرام کامیاب ہو سکتا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم اور عمودی ہے۔ لیکن ہم نے اس عنوان میں اس کی وضاحت اس لئے نہیں کی تھی کہ اس موضوع پر طلوع اسلام میں بڑی شرح و بسط سے یہ اصرار و تکرار لکھا جا چکا ہے۔ پیرویز صاحب کے مقالات، خطبات اور تشریحات اور اس موضوع پر ان کی مستقل تصنیف "نظام رپوبیت" میں اس سوال کو بڑی وضاحت سے سامنے لایا گیا ہے۔ لیکن چونکہ طلوع اسلام کے قارئین کا حلقہ دن بدن وسیع ہو رہا ہے اس لئے ان نو واردان کی طرف سے اس قسم کے استفسارات فطری اور لازمی ہیں۔ بنا بریں ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ اس نکتہ کی مزید وضاحت کر دی جائے۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ مسئلہ زیر نظر ہے کیا؟ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کمیونترزم محض ایک معاشی نظام کا نام ہے جسے کبھی سوشلزم اور کبھی کمیونترزم کہا جاتا ہے۔ یہ خیال غلط ہے۔ مارکس نے ایک فلسفہ زندگی دیا تھا جس پر ایک معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہ معاشی نظام اپنی ابتدائی

اسٹیج میں سوشلزم کہلاتا ہے اور اس کی انتہائی شکل کا نام کمیونزم ہے۔ سوشلزم اور کمیونزم میں قدر مشترک یہ ہے کہ وسائل پیداوار افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے ملکیت کی ملکیت میں رہتے ہیں جو مزدوروں اور کاشتکاروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان میں فرق یہ ہے کہ سوشلزم میں۔

ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جاتا ہے اور کام کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔

اور کمیونزم میں

ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جاتا ہے اور اس کی ضروریات کے مطابق دیا جاتا ہے۔

جہاں تک سوشلزم کا تعلق ہے، اس میں بنیادی سوال یہ سلسلے آتا ہے کہ "کام کا معاوضہ متعین کرنے کا معیار کیا ہے؟ سرمایہ دار ملکوں میں بھی مزدور کو اس کے کام کی اجرت ملتی ہے اور انجینئر کو اس کے کام کی اجرت۔ یہی کچھ سوشلزم میں ہو رہا ہے پھر، سوشلزم میں جو کچھ کسی کی ضروریات سے زائد ہوتا ہے وہ اس کی ملکیت میں رہتا ہے۔ یہی کیفیت سرمایہ داری نظام میں ہوتی ہے۔ سوشلسٹ نظام میں البتہ اس فائدہ دولت سے جا سیدادیں نہیں کھڑی کی جاسکتیں، روزمرہ کی اشیائے مستعملہ خریدی جاسکتی ہیں۔ نظام سرمایہ داری کے حامیوں کا اس کے خلاف اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی کو جا سیدادیں بنانے (یعنی وسائل پیداوار کو اپنی ملکیت میں لینے) کی اجازت نہ ہو تو اس کے لئے کام کرنے کا جواز یہ ہے کہ (INCENTIVE) نہیں رہتا۔ یہ اعتراض کمیونزم کے نظام میں اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں کام ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق لیا جاتا ہے، لیکن دیا جاتا ہے انہیں ان کی ضروریات کے بقدر۔ ظاہر ہے کہ۔ اس معاشرہ میں کام کرنے والا طبقہ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ ایک وہ جن کے کام کا حاصل ان کی ضروریات سے زائد ہو۔ اور دوسرا وہ جن کی محنت کی پیداوار ان کی ضروریات پوری نہ کر سکیں۔

کمیونزم کے نظام کی رو سے، اول الذکر طبقہ کی زائد از ضروریات کمائی، ثانی الذکر طبقہ کی ضروریات پوری کرنے کے کام میں لائی جائے گی اور یوں معاشرہ کی ناہمواریاں دور کر دی جائیں گی۔ اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اول طبقہ کے افراد میں سے جسے یہ معلوم ہو کہ وہ خواہ کتنا ہی کام کیوں نہ کرے اسے اس کی ضروریات سے زائد کچھ نہیں مل سکے گا۔ اور ثانی الذکر طبقہ کو اس کا علم ہو کہ وہ کتنی ہی کم محنت

کیوں نہ کریں، ان کی ضروریات بہر حال پوری ہوتی رہیں گی، تو وہ جذبہ محرکہ کیا ہوگا جس سے یہ سب جان مار کر پوری پوری محنت کریں گے۔ یہ ہے اہل سوال! یہ ہے وہ نقطہ، اس کے گرد اس نظام کی پوری مشینہ ی گردن کرتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جذبہ محرکہ، اس فلسفہ حیات، اس نظریہ زندگی سے پیدا ہوتا ہے جس پر ان کو ایمان ہے۔ نظام سرمایہ داری میں نظریہ زندگی یہ ہے کہ تم جس قدر کمائی کرو وہ سب کی سب تمہاری ملکیت ہوگی۔ تمہیں اس سے غرض نہیں کہ معاشرہ میں دوسروں پر کیا گزرتی ہے۔ یہ نظریہ، وہ جذبہ محرکہ پیدا کرتا ہے جس سے انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرتا اور سب کچھ اپنے لئے رکھتا ہے۔ لیکن کمیونزم کا نظام نصب العین یہ پیش کرتا ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ محنت کرو لیکن تمہیں ملے گا اتنا ہی جس سے تمہاری ضروریات پوری ہو سکیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ جو فلسفہ حیات وہ پیش کرتا ہے، وہ انسان کے اندر یہ جذبہ پیدا کر سکتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے اپنی ضروریات سے زائد سب کا سب دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیدے؟

کمیونزم کا فلسفہ حیات خالص مادی (MATERIALISTIC) ہے اس فلسفہ زندگی کا حاصل یہ ہے کہ انسان کی زندگی، دیگر حیوانات کی طرح، محض طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے۔ جس میں جذبات محرکہ محض حیوانی تعاضے (ANIMAL INSTINCTS) ہوتے ہیں۔ یہ تعاضے جیسا کہ ارباب علم و تحقیق کو معلوم ہے۔ (i) تحفظِ خویش (SELF - PRESERVATION) اور مقصد کے لئے (ii) غلبہ خویش (SELF AGGRESSION) اور افزائش نسل (SELF REPRODUCTION) ہیں۔ ان میں، نہ تو کسی دوسرے کی ضروریات پورا کرنے کا تصور پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی تحفظِ خویش کے لئے "جائز اور ناجائز" کی تمیز کا سوال ابھرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، مادی نظریہ زندگی میں، بلند اقدار (HIGHER VALUES) کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ اس میں معاشرہ کا ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے، معاشرتی قوانین و ضوابط کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ یہ چیز دی ہے جسے حیوانیت میں (HERD INSTINCT) کہا جاتا ہے یعنی جب ایک فرد محسوس کرتا ہے کہ گروہ کے ساتھ رہنے میں وہ زیادہ محفوظ رہ سکتا ہے تو وہ گروہ کے عاید کردہ قواعد و ضوابط کی پابندی کرتا ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں نظریہ حیات مادی (MATERIALISTIC) کا رنہا ہے جس کا نتیجہ

یہ ہے کہ یہ خطہ ارض، انسانوں کی بستی نہیں، درندوں کا بھٹ بن کر رہ گیا ہے۔ اس وقت زمین پر بسنے والے انسان، حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا جذبہ محرکہ احساس قومیت (NATIONALISM) ہے۔ یعنی (HERD INSTINCT)۔ بلذات انی اقدار کا تصور کہیں نہیں۔ نظام سرمایہ داری، اس تصور حیات کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس فلسفہ حیات کے تابع کوئی دوسرا نظام بروکھا آہی نہیں سکتا۔

لیکن کمیونزم، اس قسم کے خالص مادی نظریہ حیات کے تابع، وہ معاشی نظام قائم کرنا چاہتی ہے جس کی اس نظریہ کے اندر گنجائش ہی نہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ مادی نظریہ حیات یعنی حیوانی سطح زندگی، میں دوسروں کی ضروریات کے احساس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور کمیونزم کے معاشی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ انسان، اپنا خون پسینہ ایک کر کے، زیادہ سے زیادہ کام کرے، اور اس کے حاصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے رکھ کر باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیدے۔ یہ اجتماع منہین ہے۔ یہ جمع بین النقیضین ہے۔ یہ تصور (SELF CONTRADICTORY) ہے۔ یہ نارمولانا قابل عمل ہے۔ مادی نظریہ زندگی اس قابل ہی نہیں کہ انسان کو حیوانی سطح زندگی سے بلند لے جا کر اس کے سینے میں کسی بلند انسانی قدر کا احساس پیدا کر دے۔ لہذا جب کمیونزم کے نظریہ حیات کی رُو سے بلند انسانی قدر پیدا ہی نہیں ہو سکتی تو وہ نظام جس کی قوت محرکہ بلند انسانی اقدار ہیں، چل کس طرح سکتا ہے۔

کمیونزم جو ہنگامی انقلاب لاتی ہے (اسے "انقلاب" کی بجائے "انتشار کہنا زیادہ مناسب ہے) اس کا جذبہ محرکہ نفرت اور انتقام ہوتا ہے۔ یعنی وہ غریبوں اور محنت کشوں سے کہتی ہے کہ دیکھو، یہ سرمایہ دار تمہاری محنت کی کمائی کو کس طرح لوٹ کھسوٹ کر لئے جا رہے ہیں۔ تم اٹھو اور ان سے اپنی غصہ شدہ دولت چھین لو۔ اس سے ان کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں اور وہ اٹھ کر ان سے اسباب پیداوار چھین لیتے ہیں۔ جب تک یہ طبقہ باقی رہتا ہے ان کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات بھی ابھرتے رہتے ہیں۔ جب اس کا خاتمہ ہو کر کمیونزم کا اپنا نظام قائم ہو جاتا ہے تو یہ جذبات (نفرت و انتقام بھی) ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اپنی (سابقہ) مزدوروں اور محنت کشوں سے کہا جاتا ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ محنت کرو۔ لیکن اس میں سے تمہیں صرف بقدر تمہاری ضروریات کے ملے گا۔ اس سے زیادہ نہیں ملے گا۔ وہ

سوچتے ہیں کہ اس نظام میں، اور نظام سرمایہ داری میں، فرق کیا ہے؟ نظام سرمایہ داری میں بھی ہم زیادہ سے زیادہ محنت کرتے تھے اور اس میں سے ہمیں بقدر اپنی ضروریات ہی کے ملا کرتا تھا بلکہ بعض اوقات اس سے کچھ زیادہ ہی مل جاتا تھا، اور اب بھی ہم سے یہی کہا جا رہا ہے؟ نتیجہ اس کا یہ کہ اس انقلاب کی المسابقون الاولون (PIONEERS) کی جماعت کے بعد، وہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا جو اس انقلاب کو قائم رکھے۔ اس سے ان کی اگلی نسل محبور ہو جاتی ہے کہ اس نظام سرمایہ داری سے سمجھوتہ کرے جو ان کے فلسفہ حیات کا لازمی نتیجہ ہے۔ ایک آدھ نسل، محض پندار نفس کی بنا پر، اس قسم کا سمجھوتہ کرتی ہے اور اس کے بعد پھر وہی نظام سرمایہ داری قائم ہو جاتا ہے۔ مادی نظریہ حیات کے ماتحت اس نظام سے مختلف کوئی دوسرا نظام قائم رہ نہیں سکتا۔ آپ اس نظریہ حیات کے مدعی رہ سکتے ہیں کہ آپ کہتے ہیں کہ میں جان مار کر محنت کروں اور اس میں سے پھر بقدر اپنی ضرورت کے رکھ کر باقی سب دوسروں کو دیدوں۔ میں ایسا کیوں کروں؟ آپ دیکھیں گے کہ اس "کیوں" کا اس کے پاس کوئی تسلی بخش جواب نہیں ہوگا۔ اسے مجبوراً یہ کہنا پڑے گا کہ ایسا کرنا انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے۔ لیکن ایسا کہنے سے اس نے کمیونزم کے نظریہ حیات کو خیر باد کہہ دیا۔ کمیونزم کا نظریہ حیات صرف طبعی قوانین (PHYSICAL LAWS) کو تسلیم کرتا ہے، اور طبعی قوانین میں کسی سے ہمدردی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا "ہمدردی" ایک انسانی جذبہ ہے، فطرت کا طبعی قانون نہیں۔ ایک بیوہ مال جس کے جوان بیٹے کے کپڑوں میں آگ لگ جائے وہ آگ کی ہزار منتیں کیسے کرے کہ اس بچے کے مر جانے سے میں تباہ و برباد ہو جاؤں گی۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں رہے گا۔ اسے مت جلاؤ۔ وہ آگ اس کی ایک نہیں سنے گی۔ اس کے سینے میں ہمدردی کی دق تک پیدا نہیں ہوگی۔ چارہ کھانے والا بیل، بھوکے بیل کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ یہ طبعی قانون کا فطری نتیجہ ہے۔ لیکن اگر کسی کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا بھی ہو جائے، تو یہ فلسفہ زندگی نہیں بن سکتا۔ اس لئے اسے کسی مستقل انقلاب کی اساس قرار نہیں دیا جاسکتا۔ آج دنیا میں جو انسانی ہمدردی اس طرح مفقود ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ دنیا میں مادی نظریہ حیات کا دور دورہ ہے۔ لہذا مادی نظریہ حیات کی قائل و بلکہ پرستار، کمیونزم، انسانی ہمدردی کا واسطہ کس طرح دلا سکتی ہے؟ اور اگر وہ اس جذبہ کو اپیل بھی کرے تو یہ اس قدر عظیم انقلاب کی اساس کیسے بن سکتی ہے۔ انقلاب کی اساس سطحی جذبات نہیں بن سکتے، کوئی حکم فلسفہ زندگی ہی بن سکتا ہے۔

کیونترم کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ ایمان رکھتی ہے مادی نظریہ معیات پر جس میں بلند انسانی اقدار کا تصور ہی ناپید ہوتا ہے اور نظام قائم کرنا چاہتی ہے وہ جس کی بنیاد ہی بلند انسانی اقدار پر رکھی ہے یہ منکرے برون و ہمزنگ مستان زلیستن کی زندگی دو تدم بھی نہیں چل سکتی۔ یہ ہے مطلب ہمارے اس کہنے کا کہ کیونترم کے پاس وہ اساس حکم نہیں جس پر اس کے اسقدر بلند آہنگ معاشی نظام کی سرفلک عمارت قائم ہو سکے۔

یہ اساس حکم، قرآن کریم بتاتا ہے۔ اس کا پیش کردہ تصور حیات یہ ہے کہ انسانی زندگی، حیوانات کی طرح محض طبعی زندگی نہیں۔ وہ طبعی جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی رکھتا ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY)۔ یا نفس (SELF)۔ یا خود ہی کہا جاتا ہے۔ انسان کا جسم تو طبعی قوانین کے تابع زندہ رہتا اور انہی کے مطابق ایک دن مردہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی ذات نہ تو انہی طبعی کے تابع ہوتی ہے، نہ ہی جسم کی موت سے فنا ہو جاتی ہے۔ یہ جسمانی موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے اور اگر اس کی مناسب نشوونما ہو چکی ہو تو یہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو کر حیات جاودا حاصل کر سکتی ہے۔ انسانی جسم کی نشوونما، طبعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے، لیکن انسانی ذات کی نشوونما ان بلند انسانی اقدار کی پابندی سے ہوتی ہے، جو عقل انسانی کی پیداوار نہیں ہوتیں، بلکہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتی ہیں ان کا محرکہ خارجی (OBJECTIVE) ہوتا ہے داخلی (SUBJECTIVE) نہیں ان اقدار (VALUES) میں ایک بنیادی قدر یہ ہے کہ انسان جس قدر دوسروں کی ضروریات کے لئے دے، اسی قدر اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ ان اقدار پر ایمان، انسان کے اندر یہ جذبہ محرکہ بیدار کرتا ہے کہ وہ جان مار کر زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اس میں سے کم از کم اپنی ضروریات کے لئے رکھ کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشوونما کے لئے کھلا چھوڑ دے، تاکہ اس کی اپنی ذات کی زیادہ سے زیادہ نشوونما ہو سکے۔ ان اقدار پر ایمان وہ اساس حکم ہے جو اس قدر عظیم معاشی نظام کی بلند و بالا عمارت کا بوجھ برداشت کرنے کی تحمل ہو سکتی ہے۔

کیونترم اپنے نظام کو دو مراحل میں سے گزارتی ہے۔ مرحلہ اول کو سوشلزم کہا جاتا ہے۔ اور مرحلہ دوم کو کیونترم۔ پہلے مرحلہ میں اصول یہ ہوتا ہے کہ

ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لو اور کام کے مطابق معاوضہ دو۔

دوسرے مرحلہ میں اصول یہ کارسزا ہوتا ہے کہ

ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لو اور اس کی ضروریات کے مطابق اُسے دو۔

و ابھی ہستراکی مالک مرحلہ اول ہی سے گزر رہے ہیں۔ مرحلہ دوم تک ان میں سے کوئی نہیں پہنچا۔ اور ان کے نظام کی شکست و ریخت مرحلہ اول ہی میں ہونے لگ گئی ہے۔ اس مرحلہ کو قابل عمل بنانے کے لئے ضروری تھا کہ وسائل پیداوار ملکیت کی تحویل میں چلے جائیں۔ جذبہ محرکہ نہ ہونے کی وجہ سے لوگ اسے بھی برداشت نہیں کر رہے کہ وسائل پیداوار ان کی ملکیت میں نہ رہیں (روس اس وقت اسی بحران سے دوچار ہے۔ اور جب مرحلہ اول ہی میں یہ حالت ہے تو یہ ظاہر ہے کہ مرحلہ دوم میں قدم تک رکھنا بھی اس نظام کی قسمت میں نہیں ہو سکتا۔)

قرآن کریم بھی اپنے معاشی نظام کی انتہائی منزل تک بتدریج لے جاتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔ (۱۱۱)۔ اس کا بنیادی مسلک ہے۔ عدل کا تعلق مرحلہ اول سے ہے جس میں ہر ایک کو اس کے کام کا پورا پورا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ لیکن پورا معاوضہ لے کر یہ لوگ (مومن) اس مال و دولت پر سائبان بن کر نہیں بیٹھ جاتے کیونکہ انہیں ساتھ ہی "فحشاء و المنکر سے روکا گیا ہے۔ یعنی بخل اور حقل فریب کاری کی جیلہ جوبیوں سے جو انسان کو صرف مفاد خویشی کا تحفظ سکھاتی ہے۔ اس مرحلہ میں افراد معاشرہ دیگر ضرورت مندوں کی مدد کرنے کا کام انفرادی طور پر کرتے ہیں۔

اس ٹریننگ کے بعد قرآن کریم اس کا روانہ کو دوسری منزل میں لے جاتا ہے جہاں یہ اجتماعی طور پر احسان پر کار بند ہوتے ہیں۔ احسان کے معنی ہیں دوسرے کی کمی کو پورا کر کے اس کے توازن کو برقرار رکھنا۔ یہاں ان کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ۔ يَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ۔ قُلِ الْعَفْوَ (۱۱۹)۔ یہ سچ سے پوچھتے ہیں کہ ہم دوسروں کی ضروریات کے لئے کہاں تک کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ حقہ تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہو، سب کا سب، چونکہ ان کے اس عمل کی بنیاد ان کے اس ایمان پر ہوتی ہے کہ ہم جس قدر دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیدیں گے اسی قدر ہماری اپنی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی، اس لئے وہ اس حد سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں اور ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ يُوْشِرُونَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَاَوْكَاۤءًا بِهٖمْ خَصٰصَةٌ (۱۱۹)۔ وہ خود تنگی میں گزارو

کر لیتے ہیں اور دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور چونکہ وہ یہ سب ایشیا اپنی ذات کی نشوونما کے لئے کرتے ہیں، اس لئے وہ جن کی مدد کرتے ہیں ان سے کہہ دیتے ہیں کہ۔ لَا تَرْسُدْ مِنْكُمْ مَرْجَاةٌ وَ لَا شُكُورًا۔ (۲۴) ہم تم سے اس کا کوئی بدلہ نہیں چاہتے۔ جتنی کہ ہم شکر یہ تک کے بھی متمنی نہیں۔ واضح رہے کہ یہ ذہنیت اور اندازہ نسبت جماعتِ مومنین کے مستثنیٰ افراد (EXCEPTIONAL INDIVIDUALS) کا نہیں بلکہ اس پوری کی پوری جماعت کا ہوتا ہے، جس کے ہاتھوں یہ انقلاب رونما اور یہ نظام متشکل ہوتا ہے قرآن کریم کی رو سے ہر مومن کا اندازہ نگاہ اور پنج زندگی یہی ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک جو شخص مسلمان ہونا چاہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک معاہدہ پر دستخط کرے۔ یعنی اس معاہدہ پر جس میں کہا گیا ہے

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِآتٍ لَهُمْ
الْجَنَّةَ۔ (۹)

یہ مسلمان ہونے والا فرد، معاہدہ کرتا ہے کہ میں نے اپنا جان اور مال بیچ دیا ہے اور اس کے بدلے میں جنت خرید لی ہے۔ ان افراد کے مجموعہ کا نام ہے وہ جماعتِ مومنین، جو اس نظام کو قائم کرتی ہے۔ یہ نظام اس قسم کے افراد کے علاوہ، اور کسی کے ہاتھوں قائم نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ اس کے لئے جس جذبہ محرکہ کی ضرورت ہے وہ اس ایمان کے علاوہ اور کسی صورت میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس معاہدہ کی رو سے ذاتی ملکیت کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے۔

ترجمہ

تصریحاتِ بالا سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آگئیں۔

(۱) مادی نظریہ حیات کا لازمی نتیجہ نظام سرمایہ داری ہے۔ جو معاشرہ اس نظریہ حیات کا حاصل ہو گا اس میں سرمایہ داری کے علاوہ کوئی دوسرا نظام چل نہیں سکتا۔ کیونکہ سرمایہ داری کی بنیاد یہ ہے کہ یہ نظریہ حیات تو رکھتی ہے مادی اور نظام قائم کرنا چاہتی ہے ایسا جو سرمایہ داری کے نظام کی ضد ہے۔ یہ اجتماع ضدین ناممکن ہے۔

(۲) قرآن کریم مادی نظریہ حیات کا مخالف ہے۔ اس لئے یہ نظام سرمایہ داری کا بھی مخالف ہے جس نظریہ زندگی کا پیامبر ہے، اس کی رو سے ہر فرد، دوسروں کی ضروریات پورا

کرنے میں خود اپنی ذات کا فائدہ دیکھتا ہے۔ اس لئے اس قسم کا معاشی نظام صرف اس ایمان کی بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے۔

کیونکہ ہم کے پروگرام میں صرف حصہ لآ ہوتا ہے۔ یعنی ملکیت۔ نظام سرمایہ داری — مذہبی پیشوا کو مٹانا — انہیں مٹانے کے بعد وہ سمجھ لیتی ہے کہ بس اب میدان مار لیا۔ اب ہمارا نظام خود بخود قائم ہو جائے گا۔ لیکن کوئی نظام، خود بخود قائم نہیں ہوا کرتا۔ نظام کے قیام کے لئے، مخالفتوں کو مٹانا، بیشک ضروری ہوتا ہے، لیکن اس کے بعد ایک مثبت اساس کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس پر اس جدید نظام کی عمارت استوار کی جاسکے۔ قرآن کریم نے لآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ کے عظیم انقلابی فارمولے سے ایک مکمل پروگرام عطا کیا ہے۔ دیکھئے۔ وہ ازلۃ کی منزل سر کر لینے کے بعد، کہ جب تمام مخالفتوں کو راستے سے ہٹا دیا جائے، کس طرح اس حقیقت کو اجاگر کر کے سامنے لاتا ہے کہ اس سے تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ بس اب کرنے کا کام ختم ہوا۔ اب اس فتح و کامرانی کے ثمرات کو اطمینان سے بیٹھ کر کھاؤ۔ وہ کہتا ہے کہ اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحِ وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللهِ اَفْوَاجًا — جب فتح و کامرانی تمہارے قدم چومے۔ جب مخالفتیں سب سرنگوں ہو جائیں۔ جب لوگ فوج در فوج تمہارے نظام میں داخل ہونا شروع ہو جائیں۔ تو اس وقت یہ نہ سمجھ لو کہ تمہارا پروگرام مکمل ہو گیا۔ تم نے کامیابی حاصل کر لی۔ بالکل نہیں اس کے بعد تمہارے پروگرام کا نیا مرحلہ شروع ہو گا۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ اسْتَغْفِرْ لَكَ — اس کے بعد تمہیں اس نظام کے مستحق حمد و ستائش بنانے کے لئے اور بھی زیادہ سرگرم عمل ہونا پڑے گا۔ اور قدم قدم پر اپنی حفاظت کا سامان طلب کرتے رہنا ہو گا۔ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (س۔ ۱۱) — یہ ہے وہ طریق کار جس سے خدا تمہاری طرف لوٹ کر آئے گا۔ حصہ لآ سے تم نے اس کے آنے کے لئے صرف راستہ صاف کیا ہے اسے لآنے کے لئے ابھی بہت کچھ اور کرنا ہو گا۔

دوسری جگہ نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ جس بوجھ نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی وہ بوجھ اٹھ گیا ہے۔ مشکلات کے بعد آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تمہارا پروگرام بھی ختم ہو گیا ہے۔ بالکل نہیں۔ فَاِذَا حَرَغْتَ فَاَنْصَبْ — جب تو اس حصہ لآ سے فارغ ہو گیا ہے، تو پروگرام کے دوسرے حصے کی تکمیل کے لئے جم کر کھڑا ہو جا۔ اور وہ پروگرام یہ ہے کہ الی رَبِّكَ فَاَرْعَبْ۔ (س۔ ۹۲)۔ اپنی تمام توجہات، خدا کے نظام ربوبیت کے متشکل اور مستحکم کرنے پر

مركز کرنے۔ یہ ہے اَلَا اِنَّ اللہَ کَامرَحَلۃٍ یعنی مخالفتوں کے سچوم سے فارغ ہو جانے کے بعد "خدا کی طرف متوجہ ہو جانے" کا پروگرام۔!

یہ ہے وہ پیغام، جس کے متعلق ہم نے کہا تھا کہ اگر اسے چین کے اربابِ عمل و عقد اور کمیونزم کے اربابِ فکر و نظر تک پہنچا دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس پر غور کر کے اپنے نظام کو انسانیت کی ان بلند اقدار پر تشکل کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں جس سے نوع انسان اس عذاب سے محفوظ رہ سکے جو ان کے موجودہ نظام کی ناکامی کے بعد اس پر مسلط ہونے والا ہے، اس لئے کہ اس کے بعد نظامِ سربراہی واری پور سے جذبہ انتقام کے ساتھ بھرے گا اور جن جن رستوں سے اس نے دیکھا تھا کہ اس کی مخالفت تو توں نے سر نکالا تھا انہیں اس طرح بند کرے گا کہ اُدھر سے دوبارہ داخل ہونے کا کسی کو یارا نہ رہے۔

کہا جائے گا کہ جو اساس، قرآنِ کریم تجویز کرتا ہے اس کے لئے ماورائے عقل انسانی سرچشمہ علم (وحی) پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے۔ اور کمیونزم کے حامی کسی ایسے ذریعہ علم کے وجود کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں اس لئے وہ کس طرح وحی کی عطا کردہ اقدار کے تصور کو قابلِ اعتناء قرار دیں گے۔؟ یہ اعتراض بظاہر بڑا دینی نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم کے حامی ہی نہیں، بلکہ مادی نظریہ حیات کے ماننے والے، سب کے سب خارج از عقل انسانی سرچشمہ قوانین پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ قوانینِ فطرت کو مانتے ہیں اور ان قوانین کی کیفیت یہ ہے کہ یہ نہ تو عقل انسانی کے پیدا کردہ ہیں اور نہ ہی عقل انسانی ان کی کوئی توجیہ پیش کر سکتی ہے۔ مثلاً یہ تو ن کہ پانی اتنے درجہ حرارت پر پہنچ کر کھولنے لگ جاتا ہے، عقل انسانی کا پیدا کردہ نہیں۔ اور نہ ہی انسانی عقل یہ بتا سکتی ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کے باوجود، مادی نظریہ حیات کے قائلین ان قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ نظریہ قائم ہی اس بنیاد پر ہے کہ فطرت کے قوانین اٹل ہیں اور عقل انسانی کے پیدا کردہ نہیں۔!

اور کمیونزم کے حامی تو صرف فطرت کے طبیعی قوانین ہی کو خارجی (OBJECTIVE) نہیں جانتے، وہ اپنے معاشی نظام کے اصولوں کو بھی خارجی تسلیم کرتے ہیں۔ مگر کس کا نظریہ تاریخی و جوب (HISTORICAL NECESSITY) عقل انسانی کا پیدا کردہ نہیں۔ اس کا وجود خارجی ہے!

اسی بنا پر مادّزے تنگ نے کہا ہے کہ

طبقاتی جنگ ایک خارجی حقیقت ہے جس کا مدار لوگوں کے چاہنے یا نہ چاہنے پر نہیں۔

ریکنگ ریویو - مورخہ ۱۹۶۱ء - صفحہ ۱۰

اور اس پر اس اخبار کا مدیر اپنے مقالہ افتتاحیہ میں تبصرہ کرتا ہوا لکھتا ہے کہ
کہ یہ امر بالکل معمول کے مطابق اور حارجی قوانین (OBJECTIVE LAWS) کے
موافق ہے کہ (ایسا ہو)

اب ظاہر ہے کہ جو لوگ (OBJECTIVE LAWS) کے قائل ہوں انہیں یہ سمجھانا ناممکن
نہیں ہو سکتا کہ بلند اقدار انسانیت، خارج سے ملتی ہیں (اسی کو وحی کہا جاتا ہے) ان لوگوں نے وحی کا
انکار اس لئے نہیں کیا تھا کہ ان کے نزدیک مادرائے عقل انسانی کسی سرچشمہ قوانین کا ماننا عقلاً ناممکن
تھا۔ انہوں نے اس سے اس لئے انکار کیا تھا کہ ان کے سامنے جو کچھ وحی کہہ کر پیش کیا جاتا تھا (یعنی عیسائیت
کے عقائد) انہیں ان کی عقل صحیح تسلیم نہیں کرتی تھی۔ اس لئے انہوں نے کہہ دیا کہ اگر وحی کی تعلیم یہی ہے
تو یہ وحی تمہیں مبارک۔ ہم اسے تسلیم کرنے سے باز آئے۔ اگر ان کے سامنے وہ وحی پیش کی جائے جس
نے معاشی نظام تو اسی قسم کا پیش کیا ہے جس قسم کا نظام کمیونٹزم کا منتہی نگاہ ہے اور اس کے لئے
بنیاد دہی مہیا کی ہے جس کا کمیونٹزم میں نقد ان ہے۔ اور جس کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک میری بات عقل و
فکر کی رُو سے سمجھی نہ جائے، اسے مت قبول کرو، ہو نہیں سکتا کہ وہ اسے درخور اعتنا نہ سمجھیں۔



کہا یہ جائے گا۔ (اور یہ اعتراض عام طور پر کیا جاتا ہے) کہ اگر قرآن کریم نے اس قسم کا معاشی نظام
دیا تھا، اور اس کے لئے ایسی اساس محکم بھی مہیا کر دی تھی تو وہ نظام (تھوڑے سے عرصہ کے بعد) آگے کیوں
نہ چلا؟ یہ اعتراض بڑا سطح بینی پر مبنی ہے۔ ایک ڈاکٹر کسی مریض کے لئے ایک نسخہ تجویز کرتا ہے، وہ اُسے
چند دنوں تک استعمال کرتا ہے۔ اسے اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ اس کا استعمال چھوڑ
دیتا ہے اور اس طرح اس کا مرض دور نہیں ہوتا بلکہ اور بڑھ جاتا ہے۔ تو اس کے بعد کیا آپ کہیں گے
کہ اگر وہ نسخہ واقعی شفا بخش تھا تو اس سے اس مریض کا مرض دور کیوں نہ ہوا؟

اگر وہ اس نسخہ کو متواتر استعمال کرتا رہتا اور اس کے باوجود مرض دور نہ ہوتا، تو ہم کہہ سکتے تھے
کہ اس نسخہ میں شفا بخشی کی صلاحیت نہیں تھی۔ لیکن اسے ترک کر دینے کے بعد تو اس پر یہ اعتراض وارد
نہیں کیا جاسکتا۔ وہ نسخہ آج بھی موجود ہے اور اس کا دعوے ہے کہ اس میں آج بھی اس کی صلاحیت

کہ وہ اس مرض کو دور کر دے۔ اس کے دعوے کے کذب و صداقت کو پرکھنے کا طریق یہ ہے کہ اسے شہاد
کر کے دیکھا جائے۔

اور ہم چین کے اربابِ بسبب و کشادگانک یہ پیغام اس لئے پہنچانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے اس منزل کا
آدھا سفر طے کر لیا ہوا ہے۔ یعنی وہ اس کے حصّہ لآپر عمل پیرا ہو چکے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے منزل مقصود تک
پہنچنا دوسروں کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ ان تک اگر یہ آواز پہنچا دی جائے، تو چہ عجب کہ اقبال نے جو کہا
تھا کہ ع

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے

وہ حقیقت دنیا کے سامنے ایک بار پھر آجائے۔

چینی عوام کے سامنے اس وقت جذبہ محرکہ صرف مادّزے تنگ کی شخصیت ہے۔ وہ اس کی پرستش
کرتے ہیں۔ اس کی خاطر سب کچھ لٹا دینے کے لئے تیار ہیں۔ وہ بڑی سے بڑی صبر آزما قربانی کے لئے محض اس
آبادہ رہتے ہیں کہ اس سے مادّ خوش ہوگا۔ ان کی تمام توجہات کا نقطہ ماسکہ ان کی سعی و عمل کا مرکزہ ان کی تباہ
عنت و مشقت کا محور مادّ کی ذات ہے۔ لیکن مادّ تو بہر حال ایک فانی انسان ہے۔ اس نے زود یا بدیر
مرجانا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد چین کے پاس جذبہ محرکہ کیا ہوگا؟ جو لوگ چین سے ہو کر آتے ہیں
وہ بتاتے ہیں کہ چین کے اربابِ حل و عقد کو خود اس امر کا احساس ہے اور وہ اس مشکل ترین سوال کا
حل دریافت کرنے کے لئے سب سے حد متفکر اور مشوش ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس مشکل کا حل انہیں مل نہیں
سکتا۔ شخصیتیں بہر حال آنے جانے والی ہوتی ہیں۔ جو نظام شخصیات کے سہارے قائم ہوگا وہ ناپائید
ہوگا۔ پائیدگی تو نظریہ حیات اور فلسفہ زندگی ہی کے لئے ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس میں زلزلے کے تقاضوں
کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ہو۔ اور یہ نظریہ حیات کیونترم کے ہاں ہے نہیں۔ اس لئے چین کے ارباب
فکر و نظر کی ہزار تمناؤں اور صد ہزار کاوشوں کے باوجود انہیں اس مشکل کا حل مل نہیں سکتا۔
یہ سوال خود قرآن کریم کے بھی پیش نظر تھا جس کا حل اس نے یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ یاد رکھو:-

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ - قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَآسِنُ

مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْفُلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ (۱۰۴)

محمد بجز اس نیست، اللہ کا ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے بہت سے رسول آئے اور اپنے

فرانض سر انجام دے کر دنیا سے چلے گئے تو کیا یہ اگر کل کو دفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو تم دیکھ کر کہ یہ نظام اس کی ذات سے وابستہ تھا، اس لئے اس کی دفات سے ختم ہو گیا، پھر اپنے نظام کہن کی طرف پلٹ جاؤ گے؟

اور یہی کتنی وہ حقیقت کبریٰ جس کا حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس وقت اعلان کیا جب نبی اکرمؐ کی دفات سے بعض قلوب میں یہ خیال ابھر کہ اب کیا ہوگا؟ اس خیال کو رفع کرنے کے لئے جناب صدیق اکبرؓ نے مبر پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اے جماعت مومنین! اس حقیقت کو سمجھ لو کہ تم میں سے جو شخص محتفل کی عبودیت اختیار کئے ہوئے تھا اس کا معبود واقعی دفات پا گیا ہے۔ لیکن جو خدا کی عبودیت اختیار کئے ہوئے تھا، اس کو جان لینا چاہیے کہ اس کا معبود زندہ و پایندہ ہے۔ اس اعلان عظیم سے آپ نے شخصیات اور نظریہ زندگی کے فرق کو نمایاں کر کے بتا دیا اور اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اسلام خدا کے عطا کردہ اس نظریہ زندگی کا نام ہے جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہے گا۔ اس کی بقا شخصیتوں سے وابستہ نہیں۔ اس لئے شخصیتیں آتی اور فانی ہوتی ہیں۔ خدا کا عطا کردہ نظریہ حیات زندہ و پایندہ ہے۔ یہ نظریہ حیات آج بھی اسی طرح قائم و دائم ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس پر جب بھی عمل کیا جائے گا۔ یہ اپنے نتائج سامنے لے آئے گا۔ برعکس اس کے، چین کا موجودہ نظام ماؤزے تنگ کی ذات سے وابستہ ہے۔ اس کی بنیاد کسی ایسے فلسفہ حیات پر نہیں جو ماؤ (یا ان کے دیگر زعماء) کی دفات کے بعد بھی باقی رہے۔ برعکس اس کے، ان کا فلسفہ حیات وہ ہے جس پر اس نظام کی عمارت قائم رہ نہیں سکتی۔

یہ ہے وہ حقیقت جس کے پیش نظر ہم نے کہا ہے کہ اگر آج کوئی شخص، چین کے ارباب فکر و نظر کے سامنے قرآن کریم کا فلسفہ حیات پیش کر کے، ان پر اس کی اہمیت واضح کر دے، تو وہ نوع انسان کا بہت بڑا دشمن ہوگا۔

لہٰذا ہم نے اس مقالہ میں اس نکتہ سے بحث نہیں کی کہ سیکل کے فلسفہ میں، جس پر مارکس کے تخیل کی عمارت استوار ہوتی ہے، ثبات (PERMANENCE) کا تصور ہی نہیں۔ اس کی بنیاد تغیر (CHANGE) پر ہے اس لئے اس کی رو سے مستقل اقدار کا تصور ہی غلط ہے۔ اس کے برعکس، قرآن کا فلسفہ حیات، مستقل اور غیر متبدل اقدار کا حامل ہے، جو شخصیات سے وابستہ ہیں، نہ تاریخی و جوہ کے بدل جانے سے قابل تغیر۔ اس نکتہ کی وضاحت اس مقالہ میں کی گئی ہے جس کا عنوان ہے۔ "ماؤزے تنگ اور قرآن۔"

ماؤنٹے تنگ

اور شران

(پڑھیں)

اسلام ایک دین ہے۔ دین کے معنی ہیں ایسا نظام زندگی جس کی بنیاد کسی فلسفہ حیات (IDEOLOGY) پر ہو۔ وہ کوئی مذہب (RELIGION) نہیں۔ مذہب کا تعلق نظام زندگی سے ہوتا ہی نہیں۔ وہ دنیاوی کاروبار سے الگ تھلگ رہنا سکھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی مذہب نے کسی نظام حیات کے جنم نہیں دیا۔ یہودیت، عیسائیت، مجوسیت، ہندومت، بدھ مت وغیرہ مذاہب ہیں جو انسان کو ملکی یا نجات کے طور پر ترقی سکھاتے ہیں۔ کوئی نظام زندگی عطا نہیں کرتے۔ دوسری طرف، اسلام کے علاوہ کوئی نظام زندگی ایسا نہیں جس کی بنیاد آئیڈیالوجی پر ہو۔ اسلام کے بعد، کیونززم ایک ایسا نظام زندگی ہے جو ایک فلسفہ حیات پر متفرع ہے۔ بالفاظ دیگر، صرف کیونززم ایک دین کی حیثیت سے اسلام کے مد مقابل آیا ہے۔ اس لئے اسلام کو ایک دین ماننے والوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ کیونززم کا ہر نقطہ نگاہ سے مطالعہ کریں۔ اور پھر دیکھیں کہ ان میں سے کون سا نظام زندگی ایسا ہے جو انسانی زندگی کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے اور اس میں باقی رہنے اور آگے چلنے کی صلاحیت ہے۔ ہمارے ہاں، مشکل یہ ہے کہ مسلمانوں نے بالعموم اسلام کو ایک مذہب سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے وہ اس کا مقابلہ مذاہبِ عالم سے

کرتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف، کمیونسٹوں کو بھی بالعموم اتنا ہی معلوم ہے کہ کمیونزم ایک معاشی نظام کا نام ہے۔ حالانکہ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، یہ ایک نظام زندگی ہے جو ایک خاص فلسفہ حیات کی بنیادوں پر ستوار کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے عصر حاضر میں 'انسانی ہیئت اجتماعیہ کے مستقبل کے متعلق کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے اسلام اور کمیونزم کا تقابلی مطالعہ ناگزیر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت دنیا میں اس سے زیادہ اہم موضوع کوئی ہے ہی نہیں۔ میں اس حقیقت کو اس سے پہلے بھی کئی بار پیش کر چکا ہوں۔ کہ

(۱) ایک چیز ہے کمیونزم کا فلسفہ حیات اور دوسری چیز ہے اس کا معاشی نظام جسے وہ اس فلسفہ حیات کی بنیادوں پر ستوار کرنے کا مدعی ہے۔

(۲) جہاں تک کمیونزم کے معاشی نظام کا تعلق ہے وہ قرآن کریم کے تجویز کردہ معاشی نظام کے مثال ہے۔ لیکن کمیونزم کا فلسفہ زندگی اور قرآن کا فلسفہ حیات ایک حد تک ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلنے کے باوجود اصل و بنیاد کی رعیت سے ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔

(۳) کمیونزم کا فلسفہ حیات بنیادی طور پر اس قدر کمزور ہے کہ اس کے پیش کردہ معاشی نظام کی عمارت اس کی بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کے برعکس،

(۴) اس معاشی نظام کی عمارت صرف اس فلسفہ حیات پر قائم ہو سکتی اور برقرار رہ سکتی ہے جسے قرآن کریم پیش کرتا ہے۔

میں نے متعدد مقامات پر ان ہر دو فلسفہ ہائے زندگی کے اصولی خطوط کو سامنے لا کر بتایا ہے کہ یہ کس طرح باہم متضاد ہیں لیکن عصر حاضر کے اس اہم ترین مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے احباب کا تقاضا ہے کہ تفصیل سے بتایا جائے کہ یہ دونوں فلسفے کیا ہیں، کس حد تک ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور کہاں سے ان کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ احباب کے اس تقاضے سے قطع نظر مجھے خود اس کا احساس ہے کہ یہ موضوع تفصیلی گفتگو کا محتاج و مستحق ہے۔ لیکن اس قدر پیچیدہ فلسفیانہ بحث کو عام فہم انداز میں پیش کرنے اور اسے ایک مقالہ میں سمٹانے کی دقت میری عنان گیر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے مباحث کے لئے موزوں یہی ہوتا ہے کہ یا تو اسے متعدد خطبات کی شکل میں درسا درسا سامنے لایا جائے اور یا انہیں مبسوط تصنیف کی صورت میں پیش کیا جائے۔ لیکن چونکہ ان باتوں کا سرِ دست امکان نہیں اس لئے میں نے رجالات موجودہ، یہی مناسب سمجھا ہے کہ اسے مختصر الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش

کردوں اور تفصیل کو کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھوں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

— ۲۵ —

کیونترم کا فلسفہ

کیونترم کے فلسفہ حیات کی ابتداء ہیگل سے کرنی چاہیے اور پھر مارکس اور لینن کو ساتھ لیتے ہوئے ماؤزے تنگ تک پہنچ جانا چاہیے۔ لیکن یہ راستہ طول طویل بھی ہے اور (نئی اعتبار سے) دشوار گزار بھی۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ ہیگل اور مارکس کے تصورات کے متعلق سرسری اشارات پر اکتفا کیا جائے اور ماؤزے تنگ کے تصور کو تفصیل سے پیش کیا جائے، بالخصوص اس لئے کہ وہی اس دور میں اس فلسفہ کا عظیم علمبردار اس کے پیدا کردہ انقلاب کا قائمہ اور اس کی بنیادوں پر اتوار معاشی نظام کا سب سے بڑا داعی و مہماری ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ نہ صرف عمل کے امتزاج کی ٹرڈ سے دیکھا جائے تو اس وقت دنیا میں اس کا ہر کہیں نظر نہیں آئے گا۔

ہیگل نے کہا کہ دنیا میں ایک تصور (IDEA) وجود میں آتا ہے۔ وہ بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے۔ جب وہ اپنے شباب پر پہنچ جاتا ہے۔ تو اس میں سے، اس کی ضد ایک اور تصور پھوٹتا ہے۔ وہ بھی اسی طرح پروان چڑھتا ہے، تو پھر ایک تیسرا تصور ایسا پیدا ہوتا ہے جو ان دونوں باہم گرتصویرات کی صفات کو لئے ہوئے ابھرتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ تصورات آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ روح عصر (SPIRIT OF THE AGE) اس عمل پیہم کی محرک ہوتی ہے۔

مارکس اسی سکتب فکر سے متعلق تھا۔ لیکن اس نے کہا کہ یہ تضاد و تغیر، تصورات میں نہیں، بلکہ انسانی زندگی کے معاشی نظام میں ہوتا رہتا ہے اور تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) اسکی قوت محرکہ ہے۔

ماؤزے تنگ بھی اصولی طور پر اسی فلسفہ تضاد کا مؤید ہے۔ لیکن وہ ہیگل (بلکہ مارکس سے بھی ایک حد تک) اختلاف رکھتا ہے۔ اس کا فلسفہ اس کے مجموعہ تحریرات (WORKS) میں مختلف مقامات میں بکھرا ہوا ہے، اور اس کی اصل و بنیاد قانون تضاد (LAW OF CONTRADICTION) ہے اس کے جہل کو ذیل کے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) کائنات کی نشوونما کے سلسلہ میں، شروع ہی سے دو تصورات شانہ بشانہ چلے آتے نظر آتے ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ ایک تصور وہ ہے جسے عام طور پر مادہ اور اہل الطبعیاتی (METAPHYSICAL) کہا جاتا ہے اور دوسرے کو مادی جدلیت (DIALECTIC MATERIALISM) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۲) مادہ اور اہل الطبعیاتی فلسفہ کی رُو سے سمجھایا جاتا ہے کہ کائنات کی ہر شے ایک مستقل وجود رکھتی ہے وہ دیگر اشیائے کائنات سے بالکل لائق اور الگ تھلگ ہوتی ہے اور شروع سے آخر تک وہی شے رہتی ہے۔ اس کی ذات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ وہ کچھ اور بن ہی نہیں سکتی۔ خارجی عناصر اس پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں لیکن اس سے اس کے صرف مظاہر میں تبدیلی آتی ہے، اس کی اہل دنیا میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یعنی اس کی تبدیلی کیت کی (QUANTITATIVE) ہوتی ہے۔ کیفیت کی (QUALITATIVE) نہیں ہوتی۔ جن اشیاء میں کچھ پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، وہ اپنے جیسی چیز ہی پیدا کر سکتی ہیں۔ جیسے آم کی گٹھلی سے آم پیدا ہو جاتا ہے اور بکری کا بچہ، آخر کار بکری بن سکتا ہے، کچھ اور نہیں۔ اسی سلسلہ میں نظریہ ارتقار کے حاملین (یعنی ڈارون کے متبعین) بھی اتنا ہی بتا سکے ہیں، کہ ارتقار کی رُو سے، اشیائے کائنات کی شکل و صورت ہی میں فرق پیدا ہوتا ہے، ان کی ذات (ESSENCE) دیسی کی وہی ہی رہتی ہے۔ لہذا، کائنات میں تخلیق کا عمل، گردشِ دولابی (REPETITION) سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی اصول، اشیائے کائنات میں کار فرما ہے اور یہی قانون، انسانی فکر و تصورات کی دنیا میں۔ اہل کے اعتبار سے تبدیلی نہ ان میں ہوتی ہے نہ ان میں۔

(۳) اس کے برعکس، جدلیاتی فلسفہ کی رُو سے کائنات نشوونما کا تصور یہ ہے کہ

(ا) کائنات کی ہر شے کے اندر شروع سے آخر تک، ہمیشہ دو متضاد عناصر موجود ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ ان کے اس باہمی تضاد یا ٹکراؤ کی جہت سے اس فلسفہ کو جدلیاتی (DIALECTIC) کہا جاتا ہے۔

(ب) ان متضاد عناصر میں سے ایک وقت میں ایک عنصر غالب رہتا ہے۔ اسے (PRINCIPAL) کہا جاتا ہے اور دوسرا مغلوب جسے (SECONDARY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی ان میں سے ایک کا پورا بھاری رہتا ہے اور دوسرے کا بلکا۔ بھاری یا غالب عنصر کی جو کیفیات ہوں، ان کی نسبت سے وہ شے متعارف ہوتی ہے۔

(ج) باہمی تضاد سے، کچھ وقت کے بعد، مغلوب عنصر، غالب ہو جاتا ہے اور غالب عنصر، مغلوب اور چونکہ ہر شے کا شخص، غالب عنصر کی نسبت سے متعین ہوتا ہے اس لئے اس تبدیلی سے وہ شے خود ایک دوسری شے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ شکل و صورت کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ اصل و بنیاد کی رُو سے بھی بالکل جدید شے۔ اس قانون کو وحدت تضادات (UNITY OF OPPOSITES) سے تعبیر کیا جاتا ہے، جو مادّے تہنگ کے نزدیک عالمگیر اور بنیادی قانون کائنات ہے۔

اس مقام پر ایک ایسا ہے جس کی وضاحت، مادّے تہنگ کی تحریروں میں مجھے نہیں مل سکی۔ بعض مقامات پر اس نے کہا ہے کہ اس طریق میں غالب عنصر، مغلوب ہو جاتا ہے اور مغلوب، غالب آجاتا ہے۔ یعنی دونوں عناصر موجود تو رہتے ہیں، صرف ان کی پوزیشن بدل جاتی ہے۔ اس اعتبار سے بات یوں نظر آتی ہے کہ یہ تضاد عناصر شروع سے آخر تک اس شے میں موجود رہتے ہیں۔ اگر عنصر (الف) غالب ہوتا ہے تو وہ شے (الف) بن جاتی ہے اور جب عنصر (ب) غالب آجاتا ہے تو وہ شے (ب) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ گردشِ دولابی (CYCLIC PROCESS) اسی طرح جاری رہتا ہے اور اس طرح وہ شے (الف) یا (ب) بنتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں بن سکتی۔

لیکن بعض مقامات پر اس نے کہا ہے کہ غالب عنصر آہستہ آہستہ کمزور ہو کر مغلوب عنصر میں تبدیل یا دغم ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اس نے کئی جگہ اسے اس کی موت سے تعبیر کیا ہے۔ اس طرح اس شے میں ایک نیا عنصر وجود میں آجاتا ہے جس کی حیثیت عنصر غالب کی ہوتی ہے اور اس کے متقابل ایک نیا مغلوب عنصر وجود میں آجاتا ہے۔ یوں وہ شے (الف) اور (ب) میں ہی تبدیل نہیں ہوتی رہتی بلکہ وہ ارتقائی طور پر کچھ اور بن جاتی ہے جو پہلی شے سے ارفع ہوتی ہے اسے تضادات میں توافق کہا جاتا ہے۔

(د) اس عملِ تیز کی رُو سے ایک شے، ایک ہی وقت میں، وہ شے بھی ہوتی ہے اور کچھ اور شے بن بھی رہی ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، اشیائے کائنات، ہمیشہ وجود کوشی (BECOMING) کے مرحلے میں رہتی ہیں، انبیت (BEING) کے مقام تک کبھی نہیں پہنچتیں۔

(س) ایک شے کے اندر دونوں متضاد عناصر ایک دوسرے کی ضد (OPPOSITE) ہونے کے باوجود، ایک دوسرے کے وجود کا سبب (COMPLEMENTARY) بھی ہوتے ہیں۔ یعنی اگر ان میں

ایک کا وجود نہ ہو، تو دوسرا بھی موجود نہیں ہو سکتا۔ جیسے تاریکی نہ ہو تو روشنی بھی نہیں ہو سکتی۔ موت نہ ہو تو زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ نیز یہ ایک دوسرے کی تکمیل موجب بھی ہوتے ہیں۔ یعنی عنصر غالب آہستہ آہستہ منسوب میں تبدیل ہو کر اسے غالب بنا دیتا ہے۔

(ش) یہ طریق تضادم و تخلیق — یا یوں کہئے کہ اشیاء میں استبدال و استخلاف کا عمل متواتر۔

شرع سے ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ یہ سلسلہ لامتناہی ہے، کبھی ختم نہیں ہوگا۔

(ص) یہ طریق عمل صرف اشیاء (THINGS) کے اندر کارسزما نہیں بلکہ انسانی منکر اور معاشرتی

و معاشرتی نظام زندگی بھی اسی قانون اضداد کے تابع ہیں۔ ان میں بھی اسی طرح باہمی تضادم اور سلسلہ تغیرات جاری و ساری رہتا ہے۔

ماؤزے تنگ نے انسانی فکر کے متعلق تو یہ کہلے لیکن خود انسان کے متعلق اس نے بصراحت

کچھ نہیں کہا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ چونکہ اس کے نزدیک بلکہ مادی تصور حیات کی رُو سے، کائنات میں مادہ کے علاوہ کسی اور شے کا وجود ہی نہیں، اس لئے انسان کا شمار بھی اشیاء (THINGS) میں ہوتا ہے اسی لئے شاید اس کے متعلق کسی جداگانہ بحث کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ لہذا یوں سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ دیگر اشیاء کے ساتھ ہوتا ہے، وہی کچھ انسان کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ یہ نکتہ بڑا اہم ہے، اسے خاص طور پر ذہن میں رکھئے۔

یہاں تک آپ نے دیکھ لیا کہ جد لیاقی فلسفہ کی رُو سے اشیاء کائنات **ایک اہم استثناء** ہوں یا انسانی فکر و تصورات ان میں سے کوئی بھی غیر متبدل نہیں۔ ہر ایک تغیر پذیر

ہے۔ لیکن خودیوتانون (LAW OF CONTRADICTION) جس کی رُو سے یہ تمام تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں، غیر متغیر اور غیر متبدل ہے۔ ماؤزے تنگ کے اپنے الفاظ میں۔

یہ ایک عالمگیر صداقت ہے جو زمان اور مکان کی حدود سے ماورا ہے۔ اس میں کوئی استثناء نہیں ہو سکتی۔ یہ کائنات کا عمومی، ابدی اور غیر متبدل قانون ہے۔

دوسرے مقام پر ماؤزے تنگ نے اسے معروضی قانون (OBJECTIVE LAW) کہلے۔

یعنی ایسا قانون جو نہ اشیاء کے کائنات کا پیدا کردہ ہے نہ ذہن انسانی کی تخلیق ہے۔ بلکہ موجود فی الخارج ہے۔ چونکہ یہ قانون، تمام کائنات میں جاری و ساری ہے، اس لئے جب اسے موجود فی الخارج کہا جائے گا تو اس کا ہر شے لامحالہ کائنات (UNIVERSE) سے ماورا مقرر دیا جائے گا۔ اس نکتہ کا

ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے۔

علم کسے کہتے ہیں؟ (۱) ماوزے تنگ نے علم (KNOWLEDGE) کے متعلق کہا ہے کہ: علم وہی علم ہے جسے حواس کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ اسے

(PERCEPTUAL KNOWLEDGE) کہا جاتا ہے۔

(۲) انسانی فکر چونکہ معاشرہ کے خارجی عناصر سے بھی متاثر ہوتی ہے، اس لئے کسی ایک زمانے میں انسان صداقت (TRUTH) کا امرت اضافی اور جزوی علم حاصل کر سکتا ہے۔ اس شرح انسان کا جزوی علم بڑھتے بڑھتے ایک دن حقیقی اور کلی علم بن جاتا ہے۔ یعنی وہ صداقت مطلقہ (ABSOLUTE TRUTH) تک پہنچ جاتا ہے۔

صداقت مطلقہ سے مراد قوانینِ فطرت ہیں۔

(۳) یہ دیکھنے کے لئے، کہ انسان نے جو علم حاصل کیا ہے وہ صداقت ہے یا نہیں، اس علم کو عمل میں لانا ضروری ہے۔ اگر مثلاً اس کا نتیجہ وہی ہو جو اس کا دعوے سے تو وہ علم سچا ہے، ورنہ جھوٹا اور غلط۔ یعنی علم کی صداقت کی پرکھ (PRAGMATIC TEST) کی رُو سے ہو سکتی ہے۔ (۴) انسان کا جو عمل، قوانینِ فطرت کے مطابق ہوگا، وہی صحیح نتیجہ پیدا کرے گا۔

(۵) ظاہر ہے کہ اس طریق کی رُو سے انسان کوئی صداقت (TRUTH) یا قانون (LAW) بناتا نہیں۔ جو صداقتیں یا قوانین کائنات میں موجود ہیں، انہیں صرف دریافت (DISCOVER) کرتا ہے۔

(۶) مختصر الفاظ میں 'صداقت کے انکشاف کا طریقہ یہ ہے کہ ایک نظریہ (THEORY) کو عمل میں لایا جائے۔ اس سے جو نتیجہ مرتب ہو اسے پھر نظریہ (یا CONCEPT) تصور کر کے اس پر عمل کیا جائے۔ اس طرح ہر عمل کے بعد علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی۔ اس طریق کار کو مسلسل جاری رکھا جائے۔ اور اس طرح انسان کی داخلی اور خارجی دنیا میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ جو عناصر اس انقلاب کی راہ میں روک بن کر کھڑے ہوں گے، شروع شروع میں بہ جبر انہیں راستے سے ہٹایا جائے گا۔ لیکن رفتہ رفتہ ایسا مرحلہ آجائے گا جہاں دنیا کیونز مہ کے نظام کو لطیب خاطر قبول کرے گی۔ داخلی انقلاب کے بغیر خارج میں کوئی انقلاب نہیں آسکتا۔ خارجی

عناصر اس پر اثر انداز ضرور ہوتے ہیں لیکن انقلاب کی اساس داخلی تبدیلی ہی ہوتی ہے۔
یہ ہے اس فلسفہ کی رو سے علم کا تصور اور علم و عمل کا باہمی تعلق۔

اس فلسفہ کا جائزہ

ہم نے دیکھا یہ ہے کہ فلسفہ جدلیت کا بنیادی دعوے یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے (THING) کے اندر دو متضاد عناصر ہر وقت مصروف جدل و پیکار رہتے ہیں اور اسی تصادم کے نتیجہ میں وہ شے کچھ عرصہ کے بعد بالکل نئی شے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک "شے" ایک جامع اصطلاح ہے جس میں غیر جاندار اشیاء، جاندار مخلوق، خود انسان، انسانی فکر اور انسانی تمدنی اور معاشی نظام سب شامل ہیں۔ جہاں تک غیر جاندار اشیاء یا انسان کے علاوہ دیگر جاندار مخلوق کا تعلق ہے، ان میں عمل نشوونما کا سوال ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم اس پر بحث نہیں کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ مادی اشیاء کی نشوونما کے اصول و طریق کے سوال کا تعلق طبیعی علوم (PHYSICAL SCIENCES) سے ہے اسے فلسفہ کے دائرے میں آنا ہی نہیں چاہیے (اگرچہ آجکل یہ رجحان بھی فروغ پا رہا ہے کہ طبیعیات کی بنیاد بھی فلسفہ ہی پر رکھی جائے) بہر حال، یہ سوال ہمارے موضوع سے متعلق نہیں، اس لئے ہم اس پر تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارا تعلق خود انسان سے ہے اور اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے سوال کو سامنے لانا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، انسان کے طریق نشوونما کے متعلق، ماؤزے تنگ نے بہراحت الگ بحث نہیں کی۔ اس کے نزدیک جس اصول یا طریق عمل کا اطلاق اشیائے کائنات پر ہوتا ہے، اسی کے مطابق انسان کی نشوونما بھی عمل میں آتی ہے۔ یا یوں کہیے، کہ وہی قانون اصدا خود انسان پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

اس فلسفہ کی رو سے کہا یہ گیا ہے کہ

(۱) متضاد عناصر کے باہمی تصادم کا سلسلہ لامتناہی ہے۔

(۲) اس تصادم کے سلسلہ میں، ہر نئی شے جو وجود میں آتی ہے، پہلی شے سے بہتر اور ارفع ہوتی

ہے۔

(۳) اس قانون ارتقاء میں رجعت رو پس لوٹنا نہیں آگے بڑھنا ہی ہے۔

یہاں سے ایک اہم سوال سامنے آتا ہے۔ جامد مادہ، اس طریق جدلیت کی رو سے، رفتہ رفتہ پیکر انسانی میں تبدیل ہو گیا۔ اس میں نئی چیز اس کی فکر اور شعور۔ بلکہ شعور خویش (SELF-CONSCIOUSNESS) ہے۔ اس لحاظ سے، یہ سابقہ کڑیوں سے بلند اور اعلیٰ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جدلیت کے لامتناہی سلسلہ کی رو سے، اس کے بعد کیا ہو گا؟۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ موت کے بعد نہایت جسم، بے جان مادہ رہ جاتا ہے۔ جو کچھ عرصہ کے بعد منتشر (DE-COMPOSE) ہو کر مختلف کیمیائی اجزاء میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لوہا، چونا، ناسفوری وغیرہ۔ اگر انسان اسی جسم کا نام تھا تو اس کی یہ تبدیلی، اسے آگے لے جانے کے بجائے، جامد مادہ کی اسی پہلی کڑی میں لے گئی جہاں سے سلسلہ ارتقاء کی ابتدا ہوتی تھی۔ یہ ارتقاء نہیں، رجعت ہے اور رجعت بھی ایسی کہ جدلیت کی کشمکش نے جو منازل نہر یا سال میں طے کئے تھے، موت کی ایک ضرب کاری نے ان سب کو خاک میں ملا کر رکھ دیا اور بات جہاں سے پہلی تھی پھر وہیں پہنچ گئی۔ ویران کی مثال میں، بڑھیلے جو سوت دن بھر کی محنت سے کاٹا تھا، شام کو اُسے خود اپنے ہی ہاتھوں سے تار تار کر کے رکھ دیا۔ اور دوسرے دن پھر وہ چرخہ لے کر بیٹھ گئی۔

اگر یہ کہا جائے کہ موت سے ایک فرد کا تو خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن نوع انسانی (HUMAN SPECIES) باقی رہتی ہے۔ مرنے والا، اپنے جیسا انسان پیدا کر دیتا ہے۔ تو اس سے بھی اس فلسفہ کی تغلیط ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے وہ شے (یعنی انسان) کسی دوسری شے میں تبدیل نہیں ہوتی۔ ویسے کی ویسی ہی رہتی ہے۔ لہذا، یہ ترقی (PROGRESS) نہیں، اعادہ (REPETITION) ہے۔ یہ خط مستقیم پر آگے بڑھنا نہیں، ایک دائرہ کے چکر میں گھومنا ہے۔

دوسرے یہ کہ ایک فرد، بجائے خویش ایک شے ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس فرد میں کیا تبدیلی آتی ہے؟۔ فلسفہ اصدا کی رو سے، اسے اپنی موجودہ ہیئت سے مختلف اور ارفع صورت میں تبدیل ہونا چاہئے۔ انسان کی بقا سے وہ فرد تو باقی نہیں رہتا، نہ ہی کسی اعلیٰ پیکر میں تبدیل ہوتا ہے۔ اس کا جسم مادی اجزاء میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کا یہ حیثیت فردانہ، خاتمہ ہو جاتا ہے۔

دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ وہ کون سے دو متضاد عناصر ہیں جو ایک فرد میں باہم گرمصر و متپیکار

رہتے ہیں؟ — یہ ٹھیک ہے کہ جسم انسانی کے اندر ہر آن تعمیر و تخریب (ANABOLISM & KATABOLISM) کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس کے پُرانے جراثیم (CELLS) ہر وقت فنا اور ان کی جگہ نئے جراثیم وجود پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے اس کا جسم ہر آن ایک نئے جسم میں تبدیل ہوتا رہتا ہے، حتیٰ کہ کچھ عرصے کے بعد وہ ایک بالکل نیا جسم بن جاتا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ تصادم تو موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے آگے نہیں چلتا۔ اور فلسفہ جدلیت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ سلسلہ تصادم لامتناہی ہے۔ لہذا ان اگر عبارت ہے اس کے طبعی جسم سے تو اس سے اس فلسفہ کی ساری غارت نیچے آگرتی ہے۔ اگر ان کے اندر یہ تصادم اس کے جراثیموں کا نہیں، تو پھر یہ سوال سلنے آتا ہے کہ وہ کون سے دو متضاد عناصر ہیں جن میں ہر آن کشمکش جاری رہتی ہے۔ ان میں سے ایک عنصر اس کا جسم ہے جو ہمارے سامنے ہے، دوسرے عنصر کو جسم کی ضد (OPPOSITE) ہونا چاہیے۔ وہ کیا ہے؟ پھر ان دونوں میں سے اس وقت کونسا عنصر غالب یا بنیادی (PRINCIPAL) ہے اور کون مغلوب یا ثانوی (SECONDARY)۔ اور جب کچھ عرصہ کے بعد ان عناصر میں باہمی تبادلہ ہو جائے گا یا ایک عنصر ختم ہو جائے گا تو انسان کیا بن جائے گا۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ وہ اس وقت بنے گا اس کی نوبت موت کے بعد ہی آئے گی۔ اس سے واضح ہے کہ (فلسفہ جدلیت کی رُو سے بھی) موت سے انسان کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اس کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔

یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب فلسفہ جدلیت یا ماؤزے تنگ کی فکر سے نہیں ملتا۔

فلسفہ جدلیت کی رُو سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ کائنات میں ایک **دوسرا اہم نکتہ** ایسی شے بھی ہے جو —

- (۱) خود اشیا کے اندر موجود نہیں۔
- (۲) عمل تضاد و تصادم کی پیدا کردہ نہیں۔
- (۳) ازلی وابدی اور غیر متبدل ہے۔
- (۴) ذہن انسانی کی پیدا کردہ نہیں۔
- (۵) موجود فی الحاضر ہے۔
- (۶) عالمگیر حقیقت اور صداقت مطلقہ ہے۔

(۶) ذہن انسانی صرف اس کا انکشاف کر سکتا ہے، اس کی تخلیق نہیں کر سکتا۔

اور یہ شے ہے خود قانونِ تضاد (LAW OF CONTRADICTION) مادری فلسفہ حیات کی رُو سے اس قسم کی شے کا وجود ناممکنات میں سے تھا۔ لیکن جب اس کے وجود کا امکان تسلیم کر لیا گیا ہے، تو پھر اگر کوئی یہ کہے کہ اس قسم کا صرف ایک قانون (قانونِ تضاد ہی نہیں، اور کئی کئی قوانین ایسے ہیں، تو اس فلسفہ کے حامیوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایسے قوانین سے انکار کریں۔ یا اس تصور کے خلاف اعتراض کریں۔ اگر کوئی شخص خود اس معیار کے مطابق جو فلسفہ جدلیت کے حامی کسی دعوے کی صداقت کو پرکھنے کے لئے تجویز کرتے ہیں۔ یعنی (PRAGMATIC TEST) کی رُو سے کسی اور قانون کو بھی صحیح ثابت کر دے، تو ان حضرات پر لازم آئے گا کہ اس قانون کو بھی مطلق حقیقت (ABSOLUTE TRUTH) تسلیم کریں۔ یہ ان کے اپنے دعوے کا منطقی نتیجہ ہے۔

ماؤزے تنگ نے اپنے "اقوال" میں ایک جگہ کہا ہے کہ

تیسرا نکتہ | کیونکہ تاریخ انسانیت میں، مکمل ترین، ترقی پذیر، انقلابی اور معقول نظام ہے۔

یہ تصور فلسفہ تضاد کے خلاف ہے۔ اس فلسفہ کی رُو سے کوئی شے، کوئی تصور، کوئی نظام کسی وقت بھی مکمل نہیں ہوتا۔ وہ تغیر پذیر ہوتا ہے اور ہر آن بدلتا رہتا ہے اور تغیرات کا یہ عمل لامتناہی ہوتا ہے۔

ماؤزے تنگ نے یہ بھی لکھا ہے کہ

چوتھا نکتہ | ملوکیت یا استعماریت کا نظام اب، زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ یہ شرانگیز کام (EVIL THINGS) کرتا ہے۔

یہ خیال بھی فلسفہ تضاد کے خلاف ہے۔ اس فلسفہ کی رُو سے، کسی نظام کے باقی رہنے یا مٹنے کا یہ اصول نہیں، کہ جو نظام، تعمیری کام کرے گا وہ باقی رہے گا اور جو تخریبی کام کرے گا، مٹ جائے گا۔ اس فلسفہ کی رُو سے، تضاد کا قانون از خود کار فریب ہے۔ اس کے مطابق، ایک نظام وجود میں آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ضد، دوسرا نظام موجود ہوتا ہے۔ ان دونوں میں باہمی تضاد ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد مغلوب نظام غالب آجاتا ہے۔ اس کے بعد، پھر یہ چکر جاری ہو جاتا ہے۔ نہ ہی کوئی نظام اس لئے وجود میں آتا ہے

کہ اُس نے اچھے کام کئے تھے، نہ ہی وہ اس لئے مٹتا ہے کہ اس سے خراب کام سرزد ہوئے تھے۔ وہ نظام کیسا ہو اور خواہ کسی قسم کے کام کیسے، اسے اپنی باری پر بہر حال، مٹنا ہے۔ تاریخی دجوب یا قانون اصدا کی اندھی توتیں، نہ اچھے کو دیکھتی ہیں نہ بُرے کو۔ انہوں نے تو ایک کو مٹانا ہے اور اس کی جگہ اس کی صد دوسرے کو لانا۔۔۔ انسان ہزار چاہے اور اس کے لئے لاکھ کوشش کرے کہ اچھا نظام مٹے نہیں قائم رہے وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ تغیرات لانے والی یہ توتیں انسان کے نفع یا نقصان کی پرواہ ہی نہیں کرتیں۔ انسان ان کی گردش دو لابی کی مشین میں ایک بے بس پیرزے کی طرح ہے کہ جس قسم کا نظام وہ لائے، یہ اس کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں ماؤزے تنگ کا پیش کردہ قانون اصدا۔ اس قانون کا جو تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اس سے مقصود نکتہ چینی نہیں۔ یہ ترائی فلسفہ حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ کے لئے ناگزیر تھا۔

باب دوم

قرآنی فلسفہ حیات

کائنات کے متعلق جو فلسفہ (یا تصور) قرآن کریم پیش کرتا ہے وہ ایک حد تک فلسفہ جدلیت کے دوش بدوش چلتا ہے۔ لیکن جو اس مقام فلسفہ جدلیت میں ہیں، قرآنی تصور ان سے ممتاز ہے۔ اور جس مقام پر وہ فلسفہ رک جاتا ہے، قرآنی تصور ان کو اس سے آگے لے جاتا ہے۔ آئندہ صفحات میں قرآنی تصور کو مختصر الفاظ میں پیش کیا جائے گا۔ یہ بحث حسب ذیل گوشوں میں منقسم ہوگی۔

۱۔ قرآن کا انداز انہام و تفہیم۔

۲۔ تخلیق کائنات۔

۳۔ انسان کی تخلیق۔

۴۔ انسانی زندگی کی کشمکش۔

۵۔ قانونِ اصداد

۶۔ کائنات میں غیر متبادل کیا ہے۔

۷۔ مستقل امتداد۔

۸۔ کشمکش حق و باطل۔

۹۔ اصداد میں توافقی۔

۱۰۔ علم کا تصور۔

۱۔ قرآن کا طریق افہام و تفہیم

قرآن کریم کا ایک انداز افہام و تفہیم یہ ہے کہ وہ ایک شے یا نظریہ کی ضد کو اس کے سامنے لاکر اس کی وضاحت کرتا ہے۔ مثلاً۔ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ۔ اذھا اور آنکھوں والا کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ۔ نہ ہی تاریکی اور روشنی ایک جیسی ہو سکتی ہے۔ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ۔ نہ ہی دھوپ اور سایہ یکساں ہو سکتے ہیں۔ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَالْأَمْوَاتُ۔ (۴۳-۴۹)۔ نہ ہی مردے اور زندہ برابر ہو سکتے ہیں۔ اسی نظریات اور تصورات کے سلسلہ میں وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر، ہدایت کے مقابلہ میں ضلالت، حق کے مقابلہ میں باطل، کلمہ طیبہ کے مقابلہ میں کلمہ خبیثہ لاکر اپنے مطالب و معانی کی وضاحت کرتا ہے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں)۔ ماڈرن تنگ اسی قسم کی مثالیں پیش کرنے کے بعد کہتا ہے کہ ان متضاد اشیاء میں سے ایک کے بغیر دوسرے کا وجود نہیں ہوتا، لیکن قرآن کریم ان اصداد کو معانی و مطالب کی دھما کے لئے پیش کرتا ہے۔ وہ یہ تصور پیش نہیں کرتا کہ یہ متضاد اشیاء از خود ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ یہ تصور درحقیقت مجوسیت (MAGISM) نے پیش کیا تھا۔ قرآن کریم نے اپنے آپ کو کِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَابِيًّا (۲۳۹) کہا ہے۔ یعنی وہ کتاب جس کی تعلیم شروع سے آخر تک، مربوط اور آپس میں ملتی جلتی ہے۔ اس میں کہیں مخالف نہیں، تضاد نہیں،

لیکن یہ اپنے مفہوم کی وضاحت، متضاد اشیاء کو ایک دوسرے کے بالمقابل لاکر کرتی ہے (تصادم اور ٹکراؤ کے متعلق ہم آگے چل کر بات کریں گے)۔

قرآن کریم اشیاء فطرت کے اختلاف کو مِنْ آيَاتِ اللَّهِ نَشَاتِ خَدَا وَذِي (میں شمار کرتا ہے مثلاً وہ کہتا ہے کہ۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اٰخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَ النَّهَارِ..... لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ)۔ (۲۴۷)۔ یعنی تخلیق ارض و سما اور اختلاف لیل و نہار میں ان لوگوں کے لئے نشاناتِ راہ ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے۔

وَ مِنْ آيَاتِهِ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اٰخْتِلَافِ السِّنِّ وَ اللَّوَانِ كُمْ۔ (۲۴۸)۔

ارض و سما کی تخلیق اور آسمانوں کے رنگ اور زبان کا اختلاف بھی آیاتِ خداوندی میں سے ہے۔

لیکن وہ تسلسل اور زبانوں کے اس اختلاف کے باوجود، تمام نوع انسانی کو، آئیڈیالوجی کے اشتراک کی بنا پر، ایک برادری (امت واحدہ) بنانا چاہتا ہے۔ یہ ہے اس کے نزدیک توافقِ اضداد - UNITY (OF OPPOSITES) - کا طریق۔

۲۔ تخلیق کا بت

عملِ تخلیق کے متعلق قرآن کریم کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ کائنات کو بیک جنبش، مکمل شکل میں پیدا نہیں کر دیا گیا۔ بلکہ یہ بتدریج، عملِ ارتقاء کی رُو سے، تکمیل تک پہنچ رہی ہے۔ واضح رہے کہ عربی زبان اور خود قرآن کریم کی رُو سے، ایک عمل ہے فطر کا اور دوسرا ہے خلق کا۔ فطر کے معنی ہیں کسی شے کو پہلی بار عدم سے وجود میں لانا۔ اور خلق کے معنی ہیں، مختلف عناصر میں توازن و ترتیب سے نئی نئی چیزیں پیدا کرنا۔ (یہ لفظ عام طور پر انہی معانی میں استعمال ہوتا ہے اگرچہ بعض اوقات اسے فطر کے مفہوم میں بھی استعمال کر لیا جاتا ہے) خدا کے عملِ فطرت کے متعلق تو قرآن کریم کوئی تشریح پیش نہیں کرتا کیونکہ "عدم سے وجود میں آنے کا سوال، انسان کے شعور کی موجودہ سطح پر، اس کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ لیکن عملِ تخلیق

کے متعلق وہ وضاحت سے بات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ۔ **يَذَرُ الْوَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ**۔ ایک شے کی تخلیق کی اسکیم، عالم امر کی بلندیوں میں طے پاتی ہے۔ پھر اس اسکیم کا عملی آغاز زمین کی پست ترین سطح سے ہوتا ہے۔ **ثُمَّ يُعْرَجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَامًا أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ** (۳۲)۔ اس نقطہ آغاز سے وہ، بتدریج بلندیوں کی طرف اٹھرتی ہے تاکہ اس اسکیم کے مطابق اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔ یہ تدریجی مراحل وہ، ایک ایک دن میں طے کرتی ہے جس کی مقدار تمہارے حساب و شمار سے، ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں پچاس پچاس ہزار سال کی۔ (۳۳)۔

ان تخلیقی مدارج کے متعلق وہ دوسری جگہ کہتا ہے کہ۔ **وَالَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ**۔ (۳۴)۔ خدا وہ ہے جو اشیائے کائنات کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے۔ ان میں سے حشو و زوائد کو الگ کر کے، انہیں ایک خاص اعتدال پر لاتا ہے۔ پھر ان کا ایک مقام تکمیل (DESTINY) مقرر کرتا ہے اور اس مقام تک پہنچنے کے لئے انہیں راستہ دکھا دیتا ہے۔ اسی عمل ارتقا کو اس نے دو لفظوں میں یوں بیان کیا ہے

إِنَّهُ يُبْدِئُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ (۳۵)

خدا وہ ہے جو ہر شے کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے۔ پھر اسے گردشیں دیتا ہوا مختلف مراحل میں سے گزارتا ہے۔

مثلاً اس نے زمین اور اجرام فلکی کے تخلیقی مراحل کے متعلق کہا ہے کہ

۱۔ یہ تمام اجرام، ابتداءً ایک ہیولی (NEBULAE) کی شکل میں ایک ہی تھے۔ پھر الگ الگ ہوئے۔ (۳۶)۔

لہ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کوئی سائنس کی کتاب نہیں کہ وہ طبعی امور کے متعلق تفصیلی گفتگو کرے۔ اس کا موضوع انسانی زندگی کے مسائل کو سلجھانے کے لئے راہ نمائی عطا کرنا ہے۔ وہ طبعی امور کے متعلق بعض ضمنتات کرتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ اس خدا کی طرف سے ہے جو خالق کائنات ہے اس لئے ہو نہیں سکتا کہ وہ نعمتاً بھی کسی بات کے متعلق کچھ کہے تو وہ حقیقت کے خلاف ہو۔

- ۲- یہ ہیولے گیس کی شکل میں تھا۔ (۲۱۱-۱)
 - ۳- زمین اس ہیولی سے یوں الگ ہوئی جیسے گوپتے سے پتھر پھینکا جاتا ہے۔ (۲۱۲-۱)
 - ۴- ان اجرام کو چھ مختلف مراحل میں سے گزارا۔ (۲۱۳-۱)
 - ۵- زمین بھی اس ہیولی سے الگ ہونے کے بعد، دو مراحل میں سے گزر کر اس قابل ہوئی کہ اس پر زندگی کی نمود ہو سکے۔ (۲۱۴-۱)
 - ۶- زندگی کی نمود پانی سے ہوئی۔ (۲۱۵-۱) اور اس طرح بتدریج، جانداروں کی تخلیق ہوئی۔
یعنی رنگینے والے، دو پاؤں پر چلنے والے، چار پاؤں پر چلنے والے۔ (۲۱۶-۱)
- اس تمام عمل (PROCESS) میں خدا کی ربوبیت کا نزہا ہوتی ہے۔ ربوبیت کے معنی ہیں ایک شے کو اس کے نقطہ آغاز سے بتدریج مقام تکمیل تک پہنچنے کے لئے سامان نشوونما عطا کرنا۔ ان مراحل میں سے گذرتی ہوئی ایک شے، کچھ وقت کے لئے ایک مقام میں کھڑتی ہے۔ اس کے بعد وہ اگلی منزل کی طرف چل دیتی ہے۔ قرآن کریم نے اسے، ان اشیاء کا مستقر و مستودع "کہہ کر پکارا ہے (۲۱۷-۱) یعنی کسی شے کی عارضی قرار گاہ اور اس کے بعد وہ اگلی منزل "جس کے سپرد اس امانت کو کر دیا جائے" اس نئی منزل میں پہنچ کر وہ شے، کچھ اور ہی بن جاتی ہے۔ اسے وہ، اس شے کی نشاۃ الآخرۃ سے تعبیر کرنا ہے۔ یعنی اس کی دوسری پیدائش۔ سورہ عنکبوت میں ہے۔

كُلُّ شَيْءٍ مَّا فِي الْاَرْضِ فَاَنْظُرُوْا كَيْفَ بَدَا الْخَلْقَ ثُمَّ اِنَّ اِلٰهَ يُنْشِئُ
النَّشَاةَ الْاٰخِرَةَ ۗ اِنَّ اِلٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۲۱۸-۱)

ان سے کہو کہ دنیا میں چلو پھرو۔ اور دیکھو کہ خدا کس طرح ایک شے کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے۔ اور پھر اسے کس طرح ایک نئی دوسری پیدائش عطا کرتا ہے۔ یہ سب کچھ ان بیابانوں کے مطابق ہوتا ہے۔ جو اس نے اشیاء کائنات کے لئے مقرر کر رکھے ہیں اور جن پر اسے پورا پورا کنٹرول حاصل ہے۔

یہ تغیر کائنات کی ہر شے میں ہر آن رونما ہوتا رہتا ہے۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَاِنِ - (۲۱۹-۱) کائنات کی ہر شے، ہر آن تغیر پذیر ہوتی رہتی ہے۔ اور ہر نئے مرحلے میں اس کی نشوونما کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں اور خدا کی صفت ربوبیت اس کے تقاضوں کے مطابق سامان نشوونما عطا کئے جاتی ہے یَسْئَلُهُ مَنْ

فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ. (۵۵)۔ کائنات کی ہر شے ہر آن ایک نئی ہیئت میں ہوتی ہے اور اپنی نشوونما کے لئے خدا کی شانِ ربوبیت کی محتاج۔ یوں وہ شے نشوونما پا کر ایک نئی شے بن جاتی ہے۔ اس طرح کائنات میں نئے نئے تخلیقی اضافے ہوتے رہتے ہیں۔

يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ (۳۴)۔

وہ اپنے تائونِ مشیت کے مطابق مخلوق میں نئے اضافے

کرتا رہتا ہے۔

غالب کے الفاظ میں۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز؛

رہتا ہے آسینہ ابھی دایم نقاب میں

ان تخلیقی تبدیلیوں کے سلسلہ میں وہ یہاں تک بھی کہتا ہے کہ اس طرح یہ تمام کارکنہ کائنات رفتہ رفتہ، ایک اور قالب میں ڈھل جائے گا۔

يَوْمَ تَبْدِلُ الْأَرْضَ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَوَاتِ. (۲۱۱)

جس مرحلہ میں یہ ارض کسی اور ارض میں تبدیل ہو جائے گی اور اسی طرح سماوات بھی۔

اس لئے کہ **هُوَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ**۔ (۱۶)۔ وہ اس پر بھی قادر ہے کہ

اس کائنات کی مثل دوسری کائنات بنا دے؛

لیکن جس طرح یہ سلسلہ کائنات ازلی نہیں یعنی ایسا نہیں کہ اس کی ابتدا کوئی نہ ہو، اسی طرح

یہ ابدی بھی نہیں کہ اس کی انتہا کوئی نہ ہو۔ **كُلُّ شَيْءٍ يَجْرِئُ بِرُوحٍ مُّسْتَقِيٍّ**۔ (۳۵)۔ یہ سلسلہ ایک

نشان کردہ مدت تک کے لئے رواں دواں چل رہا ہے۔

ان اشیاء میں سے جو سننے (خارجی اثرات کے تابع) آگے بڑھنے کی صلاحیت کھودیتی ہے۔

لہٰذا اس تبدیلی سے مراد وہ عالمگیر انقلابِ عظیم بھی ہو سکتا ہے جس کے متعلق نثر قرآن کہتا ہے کہ وہ عالمِ انسانیت میں

ردنما ہوگا۔ اور کائنات کی طبیعی تبدیلی بھی۔

ترقی رُک جاتی ہے پھر وہ یا تو معدوم ہو جاتی ہے اور یا اُسی مقام پر گردش کرتی رہتی ہے۔ جس طرح آم کی گھٹلی سے اسی طرح آم کا درخت پیدا ہو جاتا ہے، بکری اپنے جیسا بچہ پیدا کرتی ہے۔ یہ گردش دو لاپی (REPETITION) یا تولید (REPRODUCTION) ہے۔ ارتقاء (آگے بڑھنا) نہیں۔

۳۔ انسان کی تخلیق

انسان بھی کائنات ہی کا ایک جزو ہے۔ اس لئے ایک خاص منزل تک یہ بھی اپنی تخلیقی مراحل میں سے گزرتا ہے جن سے دیگر اشیائے کائنات اور جاندار مخلوق گذرتی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں

بَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ۔ (پیس)۔ انسانی تخلیق کی ابتداء بے جان مادہ (INORGANIC MATTER) سے ہوئی۔ جامد مادہ میں، زندگی کی نمود نہیں ہوتی۔ لیکن جب اس میں پانی کی آمیزش ہوتی ہے، تو حیاتِ خوابیدہ، آنکھیں ملتی ہوئی اکٹھ بیٹھتی ہے۔ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ صَلْتًا مَّشْيًا۔ (پیس) ہرنے کو زندگی پانی سے عطا ہوئی ہے۔ مٹی اور پانی کے امتزاج سے جسے قرآن نے ظن لازم کہلے یعنی چھپی مٹی، زندگی کا اولین جرثومہ (LIFE-CELL) وجود میں آیا جس میں نروماڈ کا امتیاز نہیں تھا۔ یعنی زندگی کا آغاز (UNI-CELLULAR) طریق سے ہوا۔ اسے قرآن نے،

نَفْسٍ وَاحِدَةٍ سَخَقْتُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ۔ (پس)۔ "خدا نے تمہیں نفس واحد سے پیدا کیا۔" یہ جرثومہ حیات، جوش نمو سے پھٹ کر دو ٹکڑوں (SISTER CELLS) میں تقسیم ہو گیا اور یوں نرومادہ کی تفریق و تمیز وجود میں آگئی۔ وَ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا۔ (پس)۔ اور اس طرح اس جرثومہ واحدہ سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔

قرآن کریم نے "جوڑے" کے لئے لفظ "زوج" استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی ایسے جوڑے کے ہیں جس کے ایک جزو کے بغیر دوسرے جزو کی تکمیل نہ ہو سکے۔ یعنی وہ دونوں اجزاء ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود، ایک دوسرے کی تکمیل کا موجب (COMPLEMENTARY TO EACH OTHER) ہوتے ہیں۔ یہ توڑے صرف جانداروں میں نہیں، ہر شے میں ہوتے ہیں۔ وَالَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا۔ (پس)۔ اُس نے ہر شے کے جوڑے پیدا کئے جو ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی

تکمیل کا باعث ہیں۔

فعلت اشیائے کائنات میں، ازواج کا اختلاط کس طرح ہوتا ہے؟ یہ سوال ہمارے زیر نظر موضوع سے خارج ہے۔ جہاں تک انسانی تخلیق کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ (دیگر حیوانات کی طرح) نر اور مادہ (عورت اور مرد) کے جنسی اختلاط سے، رحم مادر میں انسانی بچے کی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ بچہ جنین)۔ دیگر حیوانات ہی کی طرح۔ رحم میں مختلف منازل سے گزرتا ہے۔ وقرآن کے الفاظ میں

ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ۔ استقرارِ محل کے بعد۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً۔ یہ جڑوہ آہستہ آہستہ کچھ ٹکٹکے والی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جَعَلْنَا الْعَلَقَةَ مَضْغَةً۔ پھر وہ گوشت کا لوتھر سا بن جاتا ہے۔ خَلَقْنَا الْمَضْغَةَ عِظَامًا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ سا ابھر آتا ہے۔ فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا۔ پھر اس ڈھانچے پر گوشت کی تہ سی پڑھ جاتی ہے۔ (۲۳/۱۱)

یہاں تک انسان اور دیگر حیوانات کے بچے یکساں مراحل سے گزرتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ایک مقام امتیاز آجاتا ہے جو درحقیقت مادی تصور حیات اور قرآنی نظریہ زندگی کا نقطہ تفریق ہے۔ اس سے ان کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر قرآن نے کہا ہے کہ

ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ (۲۳/۱۲)

پھر ہم اسے ایک نئی مخلوق بنا دیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سی تبدیلی ہے جس سے انسان، دیگر حیوانات سے مختص اور متمیز ہو کر ایک نئی مخلوق بن جاتا ہے؟ اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ

وَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رَبِّهِ وَجْهًا (۲۳/۱۳)

اس میں خدا اپنی روح (توانائی) کا ایک شہ ڈال دیتا ہے۔

یہ الوہیاتی توانائی (DIVINE ENERGY) ہے جس کے انشا سے انسان، دیگر مخلوق سے بالکل الگ اور ممتاز مخلوق بن جاتا ہے۔ یہ "نفخ روح خداوندی" انسان کے علاوہ کسی اور مخلوق کے حصے میں نہیں آیا۔ اسی کو انسانی ذات (HUMAN - PERSONALITY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی ہے، جسے "میں" کہا جاتا ہے۔ یہ انا (I - AM - NESS) ہے جو اس حیوان کو انسان میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اسی کے احساس کو شعورِ خویش (SELF - CONSCIOUSNESS) کہا جاتا ہے۔ اسی سے

انسان اپنے ہزاروں فیصلہ اور عمل کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ اسی سے یہ اس قابل ہوتا ہے کہ اسے "تو" کہہ کر پکارا جائے۔ اس تبدیلی کو قرآن کریم نے جرے، بلوغ، لطیف اور حسین انداز سے بیان کیا ہے، وہ انسانی تخلیق کے مختلف مراحل کا ذکر کرتے ہوئے، اسے صیغہ واحد غائب (THIRD PERSON) سے پکارتا چلا جاتا ہے۔ (خَلَقْنَا نَسْلَهُ سَوَاءً)۔ لیکن اس کے بعد جب اس میں "نَفخ روح" ہو جاتا ہے تو اس صیغہ غائب کو یک لخت صیغہ مخاطب (SECOND PERSON) میں تبدیل کر کے کہتا ہے۔

وَجَعَلْ لَكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ۔ (۳۴)

پھر خدا نے تمہیں سماعت و بصارت اور قلب عطا کر دیئے۔

یعنی اس طرح وہ مخلوق (انسان) اس قابل ہو جاتی ہے کہ اسے "تو" کہہ کر پکارا جائے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں مادی تصویر جیات اور ترآنی نظریہ تخلیق انسانی میں وہ فرق نمودار ہوتا ہے جس کے بعد ان کے راستے بالکل الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ مادی تصویر جیات کی رُو سے، انسان محض اس کے طبیعی جسم سے عبارت ہے۔ طبیعی قوانین کے مطابق دیگر حیوانات کی طرح اس کی پیدائش ہوتی ہے۔ طبیعی قوانین کے ماتحت اس کی نشوونما ہوتی ہے اور جب طبیعی قوانین کے ماتحت اس کے جسم کی مشینری حرکت کرنے سے رُک جاتی ہے تو اسے موت آجاتی ہے اور یوں اس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ "نَفخ روح خداوندی" کے بعد جب انسان، ایک خلق جدید زئی مخلوق میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں ایک ایسی شے کی نمود ہو جاتی ہے جو نہ طبیعی قوانین کی پیدائش سے ہے نہ طبیعی قوانین کے مطابق اس کی نشوونما ہوتی ہے اور نہ ہی جسم کی موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ وہ انسان کی موت کے بعد زندہ رہتی اور زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے لئے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

وَمَنْ خَلَقْتُمْ أَطْوَأَمًا (۳۵)

خدا نے تمہیں مختلف مدارج میں سے گزارتے ہوئے پیدا کیا۔

ان مدارج و مراحل میں، ہر نیا درجہ اور مرحلہ، سابقہ درجہ اور مرحلہ سے بلند تھا۔ یہ سلسلہ یہیں

ختم نہیں ہو سکتا۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَلَىٰ طَبَقٍ۔ (۳۶)

تم اسی طرح طبقاً طبقاً، درجہ بدرجہ بلند ہوتے چلے جاؤ گے۔

موت سے تمہارے جسم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ تمہارا نہیں۔ تم ایک نئی زندگی (نئی خَلْقِ جَدِيدًا) میں داخل ہو جاتے ہو۔ موت تو اس بات کا ٹیسٹ (TEST) کرنے کے لئے ہے کہ تم میں آگے بڑھنے کی کس قدر صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَنۡ تَكُوۡنُوۡا اَحْسَنَ عَمَلًا (۲۴)

موت اور حیات اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ اس کا ٹیسٹ ہو جائے کہ تم نے اپنے اعمال سے اپنے اندر کس قدر حسن و توازن پیدا کر لیا ہے۔

تم سمجھتے ہو کہ جب جسم انسانی کے اجزاء منتشر ہو کر پھر سے لوہا اور پتھر بن گئے تو انہیں حیات نو کس طرح مل سکتی ہے؟ یہ تمہاری بھول ہے۔ ان اجزاء سے تمہارا جسم مرکب تھا۔ "تم" ان کے مجموعہ یا امتزاج کا نام نہیں تھے۔ اس لئے جسم کے پھر سے بے جان مادہ بن جانے سے "تم" فنا نہیں ہو جاتے۔

قُلۡ كُوۡنُوۡا حِجَارًاۙ اَوْ حَدِیۡدًاۙ اَوْ خَلۡقًا مِّمَّا يَكۡسِبُ فِیۡ صُدُوۡرِكُمْ

(۵۱-۵۰)

ان سے کہو کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا، یا کوئی اور شے جس کے متعلق تمہارے ذہن میں ہو کہ اس کا زندہ ہونا ناممکن ہے۔

اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ تم ایک ایسی "نئی مخلوق" بن چکے ہو جو طبعی قوانین کی زد میں نہیں آتی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مادی جدلیت کا پیش کردہ نظریہ یہ ہے کہ بے جان مادہ عمل ارتقاء سے بڑھتا بڑھتا پیکر آدمیت تک آ گیا۔ اب اس کے بعد ارتقاء کی بجائے رجعت ہوگی۔ انسان مرنے کے بعد پھر انہی اجزاء میں تبدیل ہو جائے گا۔ جن کے ارتقاء سے وہ اس مقام تک پہنچا تھا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ارتقاء میں رجعت ہو ہی نہیں سکتی۔ زندگی کی ندی کا جو پانی آگے بڑھ گیا وہ لوٹ کر پیچھے نہیں آ سکتا۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ اس زندگی میں جن لوگوں کی انسانی صلاحیتوں کی صحیح نشوونما نہیں ہوئی ہوگی وہ مرنے کے وقت کہیں گے کہ رَبِّ ارۡجِعُوۡنِیۡ لَعَلِّیۡ اَعۡمَلۡ صَالِحًا فِیۡمَا تَرۡکٰتُ۔ لے میرے نشوونما دینے والے! زندگی کے دھارے کا رخ ایک بار پیچھے کی طرف موڑ دے، کہ جو مواقع میں نے پہلے کھو دیئے تھے وہ پھر حاصل ہو جائیں، تو میں ایسے کام کروں جن سے میری صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا۔ کَلَّا۔ (۹۹-۱۰۰) نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔

زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں لوٹا کرتا۔ عمل ارتقا میں رجعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں با آگے بڑھنا ہے یا ایک مقام پر رُک جانا۔ پیچھے مڑنا نہیں۔ آگے بڑھنے کا نام، قرآن کی اصطلاح میں جنت کی زندگی ہے۔ رُک جانے کا نام جہنم۔ اور یہ سلسلہ ارتقا جنت کی زندگی میں بھی بدستور جاری رہتا ہے۔ ان نکات کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔ اس لئے اس وقت انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ آپ نے غور کیا کہ جس مقام پر آکر فلسفہ اصدا و رُک ہی نہیں جانا بلکہ اس کی تمام عمارت نیچے گر جاتی ہے۔ قرآن کریم اس مقام سے انسان کو کس طرح آگے لے جاتا ہے۔



۴۔ انسانی زندگی کی کشمکش

جس طرح انسانی بچہ کو اس کا جسم اور جسمانی صلاحیتیں، نشوونما یافتہ (DEVELOPED) شکل میں نہیں ملتے۔ ان کی نشوونما ہوتی ہے۔ اسی طرح اسے انسانی ذات بھی نشوونما یافتہ شکل میں نہیں ملتی۔ اس کی بھی نشوونما ہوتی ہوتی ہے۔ انسانی جسم کی پرورش ہو یا اس کی ذات کی نشوونما، یہ اعداد کے تصادف (CONTRADICTIONS) کی رو سے ہوتی ہے۔ جسم انسانی میں یہ تصادم، زندگی کے جڑوں کے ہر آن فنا ہونے اور نئے جڑوں کے وجود پذیر ہونے رہنے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ زندگی، صحت، بیماری، موت، ہی کشمکش کے مظاہر ہیں۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما کن متضاد عناصر کے تصادم سے ہوتی ہے۔ یہ سوال غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔

جس طرح انسانی جسم کی پرورش کے لئے کچھ قوانین ہیں اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی کچھ قوانین و ضوابط ہیں۔ انسانی جسم کی پرورش سے متعلق قوانین کو قوانین فطرت (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے۔ اور انسانی ذات کی نشوونما سے متعلق قوانین کو مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہتے ہیں۔ یہ اقدار کبھی قوانین فطرت کی طرح، غیر مستبد اور مالمگیر ہیں۔ ان اقدار کا تفصیلی ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ اس وقت صرف ایک بنیادی قدر کو مثلاً پیش کیا جاتا ہے۔

جسم انسانی کی پرورش ہر اُس شے سے ہوتی ہے جسے انسان خود استعمال کرتا ہے۔ (مثلاً کھانا، پینا وغیرہ) اس کے لئے ہر فرد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سامانِ رزق اپنے لئے سمیٹتا چلا جائے۔ عقل انسانی، اس کے اس جذبہ کی تسکین کے لئے اسے مختلف راہیں سجاتی اور متنوع حربے سکھاتی ہے۔ نیز اس کی اس روش کے لئے جواز کی دلیلیں (JUSTIFICATORY REASONS) تراشتی رہتی ہیں۔ اس کے برعکس، انسانی ذات کی نشوونما کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اپنے جسم کی ضروریات سے زائد جو کچھ ہو، اسے دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے۔ اس طرح انسانی جسم کے تقاضے اور اس کی ذات کے تقاضے میں کشمکش ہوتی رہتی ہے۔ قرآن کریم نے اس کشمکش اور تضاد کو تقصد آدم کے تمثیلی انداز میں 'ابلیس و آدم کی آویزش' سے تعبیر کیا ہے۔ ابلیس (یا شیطان) انسان کے ان جذبات کا ترجمان ہے جو اس کے طبعی تقاضوں کے بروئے کار لانے کا ذریعہ ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں ابلیس و آدم کی نمود ایک ہی وقت میں ہوئی ہے۔ اور ابلیس کو آخر تک، آدم کے مد مقابل رہنے کی مہلت بھی دیدی گئی ہے۔ (قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِيْنَ) (پہلے)۔ خدا نے ابلیس سے کہا کہ ہاں! تمہیں مہلت دیکجاتی ہے، لہذا، انسان کے اندر، تضاد کی کشمکش، شروع سے ہے اور آخر تک رہے گی۔ ایک فرد کی زندگی میں بھی اور نوع انسان کی حیات اجتماعی میں بھی۔ رحیاتِ جنائت میں ان دو گروہوں کی شکل میں جن میں سے ایک اپنے ذاتی مفاد کے حصول کو مقصد زندگی قرار دے اور دوسرا گروہ ان کا جو نوع انسانی کے مفاد عامہ کو پیش نظر رکھیں، اس ٹکراؤ سے انسانی ذات کی صلاحیتوں کی نمود اور نشوونما ہوتی ہے۔ اس سے اس کی قوت بڑھتی ہے اور جوں جوں اس کی قوت بڑھتی جاتی ہے، ابلیسی تقاضے اس سے مغلوب ہوتے جاتے ہیں۔ اسی لئے ابلیس سے کہہ دیا گیا تھا کہ تو جس قدر چاہے زور لگالے۔ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ۔ (پہلے)۔ جو لوگ میرے قوانین کا اتباع کریں گے، ان پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکے گا۔

دماغ رہے کہ نہ آتی تصور کی رُو سے، ابلیس کا کبھی خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ یہ، انسانی ذات کی نشوونما یافتہ قوتوں کے سامنے ٹھک جاتا ہے، ان سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے سلسلہ ارتقا میں آگے بڑھنے اور رُک جانے کے لئے اصول یہ بتایا ہے کہ

مَنْ ثَلَّتْ مَوَازِيْنَهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِسُونَ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ

فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ - (۴)۔

جس کا تیزی قوتوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ کامیاب و کامران ہوگا۔ جس کا وہ پلڑا ہلکا ہوگا وہ نقصان اٹھائے گا۔

یعنی، یہ نہیں کہ آگے وہ بڑھ سکے گا جس کا تختہ سی پلڑا یا لکل خالی ہوگا۔ آگے وہ بڑھے گا جس کی ذات کی صلاحیتوں کا پلڑا بھاری ہوگا۔ جو تختہ سی قوت پر غالب آچکا ہوگا۔ یہاں زندگی اور ارتقاء کا معیار ثقل موازنہ ریلڑے کا بھاری ہونا ہے۔

• نفس کشی — یعنی ایسی قوتوں کو فنا کر دینے — کا تصور، خانقاہیت کا پیدا کردہ فریب ہے۔ حقیقت نہیں ہے۔ حقیقت وہی ہے جس کی تائید قرآن کریم ہے۔ اگر تصادم کا امکان باقی نہ رہے تو زندگی کی جوئے رواں، جو ہرن کر رہ جائے۔ اس میں حرکت و حرارت، اسی تصادم کی بدولت ہے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

مزی اندر جہان کور ذوقے

کہ یزداں وارد و شیطان ندارد

یہ ہے وہ دو گوتہ عمل تضاد، جو انسان کے اندر کار فرما رہتا ہے۔ ایک تضاد اس کے جسم کے اندر اور دوسرا تضاد اس کے طبیعی تقاضوں اور ذات کے تقاضوں کے اندر — واضح رہے کہ قرآن کی تعلیم یہ نہیں کہ انسانی جسم کے طبیعی تقاضوں کو فنا کر دیا جائے۔ قطعاً نہیں۔ وہ جسم کی پرورش کو بھی ضروری قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ ہے کہ جب جسم کے کسی تقاضے اور انسانی ذات کے تقاضے میں ٹکراؤ ہو تو ذات کے تقاضے کو ترجیح دینی چاہیے، کیونکہ یہ حیات کی ارفع اور آگے چلنے والی شکل کا نام ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس مقام پر بھی قرآنی فلسفہ حیات کس طرح مادی جدلیت کے فلسفے آگے لے جاتا ہے۔



۵۔ قانون تضاد

قانون تضاد و تصادم، خود خالق کائنات کا پیدا کردہ، اور اس کی حکیم کا لاینفک حصہ ہے۔

وہ چاہتا تو انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کر دیتا کہ تعمیری اور تخریبی قوتوں کے تصادم کا امکان نہ ہوتا۔ سب انسان مجبوراً ایک ہی راستے پر چلے جاتے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا اس لئے انسان کو ایسا نہیں پیدا کیا۔ وَ لَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ مِنَ الرِّجْزِ جَمِيعًا۔ (پہلے) اگر خدا چاہتا تو وہ انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کر دیتا کہ سب کے سب مومن ہوتے۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام ایسا نہیں تھا۔ اس نے انسان کو حصہ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ کہ وہ اپنے فیصلہ سے جو راستہ چاہے اختیار کرے۔

وَأَقْبَلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ۔ (پہلے)

ان سے کہو کہ حق تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے آ گیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے تسلیم کر لے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

اختیار و ارادہ، انسانی ذات کی خصوصیت ہے۔ اسی سے یہ حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور اسی سے اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ اسی سے اس کے اندر وہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے جس سے اس کی خارجی دنیا کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ یہی صورت افراد کی ہوتی ہے اور یہی کیفیت اقوام کی۔ اس کا واضح فیصلہ ہے کہ

إِنَّ اللَّهَ لَذُوُ عَيْبٍ لِّمَا يَتَوَدَّ حَسْبِي يُغَيِّرُ مَا يَشَاءُ بِإِذْنِهِ۔ (پہلے)

یاد رکھو! خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا، جب تک وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرے۔

جس قسم کی تبدیلی قوم کے اندر دینی اس کی نفسیات میں پیدا ہوگی، اسی قسم کی تبدیلی اس کی خارجی دنیا میں رونما ہوگی۔ (ایمان) اسی قسم کی صحیح نشیاتی تبدیلی کو کہتے ہیں، یہی وہ تبدیلیاں ہیں جن سے مردہ اقوام کے اندر زندگی کی نمود ہو جاتی ہے اور زندہ اقوام پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ فُجِّرِجُ الْمُجْرِمِينَ مِنَ الْمَيْمَتِ وَ فُجِّرِجُ الْمُؤْمِنِينَ مِنَ الْمَيْمَتِ۔ (پہلے)۔ اسی سے ایک قوم اپنی عظمت و شوکت کھو کر تعزیرت میں گر جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ سورہ توبہ میں خود جماعت مومنین کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ اگر تم تخریبی قوتوں کا پوری استعداد سے مقابلہ نہیں کرو گے تو یسٹبدیل قومًا غَيْرَكُمْ وَ لَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا۔ (پہلے)۔ خدا کائنات میں خود ثبات تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا۔

اور تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے۔ یہ نہیں کہ ایک قوم کی جگہ دوسری قوم آتی ہے تو وہ پہلی قوم جیسی ہی ہوتی ہے اس قسم کا استبدال بے معنی ہے۔ یہ آنے والی قوم، چلنے والی قوم کی مثل نہیں ہوتی۔ اس سے بہتر ہوتی ہے، جیسی تو اس کی جانشین بنتی ہے۔ اسی لئے کہا کہ وہ قوم جو تمہاری جگہ لے گی، لَا يَكُونُ ذُوًا اَمْتًا لَّكُمْ (۲۶)۔ وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ مٹی وہی قوم ہے جس کی تعمیری صلاحیتوں کا پلڑا ہلکا ہو گیا ہو، اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جس کا یہ پلڑا بھاری ہو۔ یہی قوموں کے استبدال و اختلاف کا ابدی قانون ہے۔ اور یہ نتیجہ ہوتا ہے قوم کی داخلی (نفسیاتی) تبدیلی کا۔

ایک قوم تو ایک طرنت رہی۔ قرآن تو یہاں تک بھی کہتا ہے کہ اگر پوری کی پوری نوع انسانی ایسی ہو جائے کہ اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہ رہے، تو یہ بھی صفحہ ارض سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے۔ اور اسکی جگہ کوئی اور مخلوق لے لے۔

اِنْ يَشَاءُ يَذْهَبْكُمْ وَايَاتٍ بِمَنْ لَقِيَ حَبِطًا (۲۷)

خدا کے قانون مشیت کی زد سے یہ بھی ممکن ہے کہ اگر تم میں باقی رہنے کی صلاحیت نہ رہے تو وہ تمہیں مٹا دے اور تمہاری جگہ ایک جدید مخلوق لے آئے۔

جب کسی قوم کے زندہ رہنے کی صلاحیتوں کا پلڑا ہلکا ہو جائے اور وہ اس طرح مصائب زندگی سے ہلکا بجائے تو اسے اس قوم کی "اجل" کہا جاتا ہے اور اس میں پھر ایک ثانیہ کی بھی تاخیر و تقدیم نہیں ہو سکتی۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِرُوْنَ ۝ (۲۸)

ہر قوم اس وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو جب وہ صلاحیت ختم ہو جاتی ہے تو اس کی مدت حیات بھی ختم ہو جاتی۔ اس کے بعد، اس میں ایک ثانیہ کی بھی تاخیر و تقدیم نہیں ہوتی۔

اور یہ کچھ یونہی علی الحساب نہیں ہو جاتا، خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ وَلِكُلِّ اَجَلٌ كِتَابٌ (۲۹)۔ ہر قوم کی اجل کا فیصلہ قانون خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کی انڈھی قوت یا قانون تضاد (LAW OF CONTRADICTION) کی جابرانہ گردش نہیں جس سے ایک قوم

غلبہ و تسلط کی مالک بن جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک اور قوم اس کی جگہ لے لیتی ہے اور اس میں، نہ مٹنے والی قوم کا کوئی جرم اور قصور ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی جگہ لینے والی قوم کی کوئی کاریگری۔ یہ محض گردشِ دولاب کی رُو سے بندھی ہوئی یاریاں ہیں جو خود بخود آتی جاتی ہیں۔ قرآن کریم کے فلسفہ کی رُو سے، قومیں اپنے جوہر ذاتی کی بنا پر غلبہ و اقتدار کی وارث ہوتی ہے۔ جب تک ان میں وہ جوہر باقی رہتا ہے، ان کا اقتدار بھی قائم رہتا ہے۔ جب اس جوہر میں کمی واقع ہو جائے تو وہ باقی رہنے کی صلاحیت کھودیتی ہے اور اس کی جگہ ایسی قوم لے لیتی ہے جو اس سے بہتر صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ تانوں اصدا اور قرآنی فلسفہ میں کس قدر نمایاں فرق ہے اور قرآنی فلسفہ کس طرح علم و بصیرت کو اپیل کرتا ہے۔



۶۔ کائنات میں غیر متبدل کیا ہے؟

فلسفہِ جدلیت کی رُو سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ

۱۔ کائنات میں مادہ رائے مادہ کسی شے کا وجود نہیں۔

۲۔ ہر حادثی شے میں عمل اصدا جاری دساری ہے جس کی وجہ سے ہر شے ہر آن تغیر پذیر ہوتی

ہے۔ کائنات میں ثبات و قرار کسی شے کو نہیں۔

لیکن، جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، اس کے ساتھ ہی، انہیں یہ بھی تسلیم ہے کہ خود یہ قانون اصدا

ایک حقیقتِ مطلقہ (ABSOLUTE TRUTH) ہے۔ غیر متبدل (IMMUTABLE) ہے۔ ابدی

(ETERNAL) ہے۔ اور نہ کسی شے کا پیدا کر وہ ہے، نہ ذہن انسانی کی تخلیق ہے۔ بلکہ موجود فی الخارج

(OBJECTIVE) ہے۔

قرآن کریم کا فلسفہ یہ ہے کہ اس قسم کا غیر متبدل، موجود فی الخارج قانون ایک ہی نہیں۔ ایک سے زیادہ

ہیں۔ ان قوانین کو دو شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک شق تو انہیں فطرت پر مشتمل ہے جن کے مطابق

سلسلہ کائنات سرگرم عمل ہے۔ دوسری شق کا تعلق ان قوانین سے ہے جن کے مطابق انسان کو اپنی زندگی

بسر کرنی چاہیے تاکہ اس کے طبعی جسم کے ساتھ ساتھ اس کی ذات کی نشوونما بھی ہوتی جائے، قانونِ فطرت

ہر شے کے اندر از خود موجود ہوتا ہے اور وہ اس کی اطاعت پر مجبور ہوتی ہے۔ "مجبور سے مطلب یہ ہے کہ ہشیلے کائنات کو اس کا اختیار و ارادہ ہی نہیں دیا گیا کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کر سکیں۔ انسانی زندگی سے متعلق قوانین، ستر آئن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ یہ قوانین جب نظری حیثیت سے سامنے آئیں تو انہیں کلمات اللہ کہا جاتا ہے۔ اور جب ان کا ظہور عملی شکل میں ہو تو یہ سنت اللہ کہلاتے ہیں۔ کلمات اللہ ہوں یا سنت اللہ۔ سب غیر متبدل ہیں۔ ایسے غیر متبدل کہ کائنات کی کسی شے کو انسان سمیت، اس کی قدرت حاصل نہیں کہ ان میں کسی قسم کا رد و بدل کر سکے اور خود خدا جس نے ان قوانین کو اس قسم کا بنایا ہے، قدرت رکھنے کے باوجود، ان میں تغیر و تبدل نہیں کرتا۔ خود اس کا ارشاد ہے کہ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ اَعْلٰہِ رَہْبٰہِہٖا
قوانین خداوندی کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ دوسری جگہ ہے۔

و تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ (۲۱۲)

تیرے رب کے قوانین صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ انہیں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

اسی طرح "سنت اللہ" کے متعلق فرمایا

سُنَّةَ اٰلِهٖ فِی الدِّیْنِ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَاَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اٰلِهٖ
تَبْدِیْلًا (۲۱۳)

خدا کا یہ دستور اہم سابقہ میں بھی رہا۔ یہی اب کا فرمان ہے۔ تم دستور خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

جن لوگوں کے سامنے ان ستر آئی حقائق کو پہلی مرتبہ پیش کیا گیا، وہ کہتے تھے کہ یہ محض شاعری ہے فَتَرٰ بَصُ بِہٖ رَبِّہٖ الْمُنُوْنِ (۲۱۴)۔ تمہوڑا سا انتظار کرو۔ زمین کی گردشیں اسے خود مشاویں گی یونہی حالات بدلے اور زمانے کے تقاضوں میں تبدیلی آئی؛ یہ باتیں 'داستان پارینہ ہو جائیں گی۔ ان سے کہا گیا کہ یہ شاعری نہیں۔ شاعری ایک داعی انقلاب کے شایان شان ہی نہیں ہوتی۔ (۲۱۵)۔ یہ اہل قوانین ہیں۔ اہل۔ تَرٰ بَصُوْنَا فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَرِبِیْنَ ہ (۲۱۶)۔ تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ یہ ابدی حقائق ہیں یا کسی شاعر کے تخیلات۔ انہی میں وہ قانون عموماً شامل ہے جس کے مطابق چیزیں مٹی اور باقی رہتی ہیں یَسْحُوْا اَعْلٰہِ مَا یَشَاءُ وَّ یُثَبِّتُ (۲۱۷)۔ اور ان کا سرچشمہ کائنات سے ماوراء علم خداوندی ہے وَ عِنْدَکَ اُمُّ الْکِتٰبِ (۲۱۸)۔ یہ قوانین

دیئے اس لئے گئے ہیں۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنِ بَيْتِنَا وَ يُخَيَّرَ مَنْ حَيَّ عَنِ بَيْتِنَا. (۲۶)۔
جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے زندہ رہے اور جسے تباہ ہونا اور مٹنا ہے، وہ بھی دلیل و
برہان کی رُو سے مٹے۔ یہاں نہ دھاندلی ہے اور نہ ہی محض اتفاقی طور پر جو حادثہ سرزد ہو جاتا ہے۔ یہاں
ہر بات قاعدے اور قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے۔



۷۔ مستقل اقدار

ان میں سے جن قوانین کا تعلق انسانی زندگی سے ہے، انہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ اگر
انسانی معاشرہ ان اقدار کے مطابق مشکل ہو جائے تو اس میں تمام افراد معاشرہ کی طبعی ضروریات زندگی بھی
بلا مشقت و پریشانی پوری ہوتی جاتی ہیں اور ان کی ذات کی صلاحیتوں کی بھی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ یہ
دوہرا مقصد ان اقدار کے سوا اور کسی صورت میں حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان اقدار و قوانین کی نہرست تو
طول طویل ہے لیکن ہم یہاں ان میں سے چند ایک بنیادی اقدار کا ذکر کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ مثلاً:-

۱۔ ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب الاحترام ہے۔ (۲۷)۔
۲۔ معاشرہ میں تعین مدارج کا معیار افراد کے ذاتی جوہر اور حسن سیرت و کردار ہے۔ نہ کہ نہانی
نسبتیں۔ (۲۸)۔

۳۔ معاشرہ میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ اپنے فرائض منصبی
کا پابند ہے۔ (۲۹)۔

۴۔ معاشرہ کے بنیادی ستون عدل اور احسان ہیں۔ عدل کے معنی ہیں ہر ایک کے حقوق اور
واجبات کی کما حقہ ادائیگی۔ اور احسان کے معنی یہ ہیں کہ جس میں کسی وجہ سے کوئی کمی آجائے
اس کمی کا پورا کر دینا۔ (۳۰)۔ اور اس کے لئے مزد و معاوضہ تو ایک طرف شکر یہ تک کے
بھی مستثنیٰ نہ ہونا۔ (۳۱)۔

۵۔ اپنی جائز ضروریات سے زائد سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیدینا (۳۲)۔
بلکہ اگر دیکھا جائے کہ دوسروں کی ضرورت میری ضرورت سے زیادہ شدید ہے تو ان کی ضرورت کو

اپنے اوپر ترجیح دینا۔ (۵۹)۔

۶۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ (۵۳)۔

۷۔ جس میں محنت کرنے کی استعداد ہے، اسے محنت کئے بغیر کچھ نہیں مل سکے گا۔ (۵۳)۔

۸۔ ذرائع رزق ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔ ان پر کسی کی ذاتی ملکیت کا

سوال پیدا نہیں ہوگا۔ (۲۱، ۵۵)۔

۹۔ ہر فرد کی بنیادی ضروریات زندگی کا پورا کرنا معاشرہ کا فریضہ ہوگا۔ (۱۱، ۱۵۱)۔

۱۰۔ کسی شخص کو دوسروں پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ (۳)۔ فرمانروائی صرف قوانین

کی ہوگی۔ (۱۱)۔

۱۱۔ انسان کا کوئی کام۔ حتیٰ کہ اس کے دل میں گذرنے والا خیال تک بھی اپنا نتیجہ مرتب کئے

بغیر نہیں رہ سکتا۔ (۱۱)۔ ان میں سے ہر ایک کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے اور انہی اثرات

کے ثبوت کے مطابق اس کی ذات کا مستقبل متعین ہوتا ہے۔ اگر اس کے تعمیری نتائج کا

پلڑا اچھا ہوتا ہے تو اس کا مستقبل خوشگوار ہے۔ اگر وہ پلڑا ہلکا ہے تو اس کے لئے تباہی ہے۔

اس قانون مکافات میں کسی کے لئے استثناء نہیں۔

ان قوانین یا مستقل اقدار کو حق (THE TRUTH) کہا جاتا ہے۔ یہی حقیقت (REALITY)

ہے۔ ان کے خلاف جو نظریہ، تصور یا مسلک ہے، وہ باطل ہے۔ حق تعمیری نتائج پیدا کرتا ہے اور انسانیت کے

ارتقاء میں مدد و معاون ہوتا ہے۔ باطل تخریبی نتائج پیدا کرتا ہے اور کاروان انسانیت کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا

ہے۔ ملوکیت مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری اس کے تین بڑے ستون ہیں۔ حق و باطل میں شروع سے کشمکش

چلی آ رہی ہے اور چلی جائے گی۔ انسانی تاریخ اسی کشمکش کی محسوس تفسیر ہے۔



۸۔ کشمکش حق و باطل

اب ہم پھر ایک ایسے مرحلہ میں داخل ہو رہے ہیں جہاں مادی جدلیت کے فلسفہ اور قرآنی فقہ

میں بنیادی فرق ہے۔ فلسفہ جدلیت کی رو سے، کوئی نظریہ، کوئی تصور، کوئی مسلک، مذہبیاری طور پر حق ہے

نہ باطل۔ ہر نظریہ (IDEA) اور ہر شے کے اندر دو متضاد عناصر باہم دیگر سرسپیکار رہتے ہیں۔ ان میں سے کبھی ایک غالب آجاتا ہے کبھی دوسرا۔ جو غالب آجاتا ہے اس کی ضد پھر نمودار ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح وہی کشمکش پھر جاری رہتی ہے اور یہ سب کچھ ہمارے کس کے الفاظ میں (تاریخی وجوب) - HISTORICAL NECESSITY) اور مادہ زے تنگ کی اصطلاح میں تناؤن اضداد کی اندھی قوت کی رُو سے، از خود ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس کے برعکس قرآنی تصور یہ ہے کہ

۱۔ یہ کشمکش، حق (تعمیری قوتوں) اور باطل (تخریبی قوتوں) کے درمیان ہوتی ہے۔

۲۔ اس کشمکش میں آخر الامر حق غالب آتا ہے، اور سلسلہ کائنات ایک ارتقائی منزل اور آگے

بڑھ جاتا ہے۔ اس نئی منزل میں باطل پھر سیکریدیل کر سکتا ہے اور حق و باطل کا یہ تصادم پھر جاری رہتا ہے

جس میں حق پھر غالب آجاتا ہے۔ یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے اور ہر منزل کے بعد کائنات اور کھرتی او

سنورتی چلی جا رہی ہے۔

۳۔ کشمکش اور حق کا غلبہ، اس اسکیم کے مطابق جاری و ساری ہے جس کی رُو سے خدا نے کائنات

کو پیدا کیا ہے۔ اس کشمکش میں اگر انسان حق کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑا ہو تو یہ مرحلہ تیز رفتاری سے طے ہو جاتا ہے

اگر ایسا نہ ہو تو یہ مسافت اس رفتار کے مطابق طے پاتی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ "خدا کا ایک ایک دن

تمہارے حساب و شمار سے لیکر ایک ہزار بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے"۔ اس کی مزید تشریح ذرا آ

چل کر آئے گی۔

۴۔ جو انسان، حق کی حمایت کے لئے اٹھتے ہیں، ان کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ اور ان

کی اس دنیا کی اور اس کے بعد کی زندگی، خوشگوار یوں کے جھولے جھولتی ہے۔ یوں خود انسان اپنے ارتقائی

سنازل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

دیکھئے قرآن کریم ان حقائق کو کن الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

۱۔ نظام کائنات یونہی کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا گیا۔ اسے بالحق — تعمیری مقاصد کے

لئے پیدا کیا گیا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَفَا بَيْنَهُمَا لِعِبَادٍ ۝ وَمَا

خَلَقْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۳۴-۳۳)

اور ہم نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو اور جو کچھ ان میں ہے، یونہی کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ یہ بالحق پیدا کی گئی ہے۔ لیکن اکثر لوگ علم و بصیرت سے کام نہ لیتے ہوئے اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔

۲۔ کائنات میں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے۔ اس تصادم میں آخر الامر باطل شکست کھاتا ہے۔

بَلْ نَقَدَرْتُ عَلَى الْبَاطِلِ - قَيْدٌ مَعْنَهُ - فَإِذَا هُوَ رَاحِقٌ ۝ وَ لَكُمُ الْوَيْلُ
مِمَّا تَصِفُونَ ۝ (۱۱۱)

ہم حق کی ضرر میں باطل پر لگاتے رہتے ہیں۔ تا آنکہ حق، باطل کا بھیجہ نکال دیتا ہے اور یوں وہ میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھتا ہے۔ جو لوگ اپنے تصورات کے مطابق اس کے خلاف کچھ سمجھتے ہیں، تو ان کے حتمے میں تباہی کے سوا کچھ نہیں آسکتا۔ کیونکہ وہ حق کے غلبہ کا تصور نہیں رکھتے۔

۳۔ مفاد پرست گرد وہ باطل کو غالب رکھنے کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔

وَ يُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ (۱۱۲)
جو لوگ حق سے انکار کرتے ہیں وہ باطل کے حیلوں سے حق کے خلاف نبرد آزما ہوتے رہتے ہیں۔ تاکہ اس طرح حق کو مغلوب کر دیا جائے۔

۴۔ لیکن حق پرست جماعتیں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں اتر آتی ہیں۔

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلُ الْبَاطِلَ ۝ وَ كَرَّكَ الْمُجْرِمُونَ ۝ (۱۱۳)
تاکہ حق کا اثبات ہو جائے اور باطل کا ابطال۔ خواہ ایسا ہونا ان لوگوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گذرے جو قوانین شکنی ہی میں اپنا مفاد منفر سمجھتے ہیں۔

۵۔ لیکن اگر حق کی حمایت کے لئے انسانوں کی جماعت نہ بھی اٹھے، تو بھی آخر الامر حق غالب آکر رہتا ہے۔ اگرچہ اس میں وقت بہت لگ جاتا ہے۔

وَ يَنْصُرُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتٍ - (۱۱۴)

خدا، اپنے قوانین کے زور سے، باطل کو محو اور حق کو محکم اور استوار کئے جاتا ہے۔

بینک، مزید وضاحت چاہتا ہے۔ انسانی عمل کا ایک طریق تو یہ ہے کہ وہ کسی قانون کی صداقت پر یقین رکھ کر اس کے مطابق کام کرنا شروع کر دے۔ اس سے اثبات حق کی مسافت بہت جلد طے ہو جائے گی۔ اور اس عمل کے نتائج اس قانون کی صداقت کی محسوس دلیل بن جائیں گے۔

دوسرا طریق یہ ہے کہ وہ کسی قانون یا فارمولے کو نہ ماننے بلکہ اپنے قیاس کی راہ نمائی میں سفر شروع کر دے۔ قیاس عقلی کا طریق تجرباتی (TRIAL AND ERROR) کام ہوتا ہے۔ اس میں عقل ایک مسلک اختیار کرتی ہے۔ صدیوں کے تجربے کے بعد جا کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ راہ غلط تھی۔ پھر وہ اسے چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرتی ہے۔ اس طرح متعدد تجارب، اور سینکڑوں برس کی جانکاہ مشقتوں کے بعد وہ حقیقت تک پہنچ پاتی ہے۔ اسے عرب عام میں زلمنے کے تقاضے کہا جاتا ہے۔ حقیقت تک پہنچنے کی یہ وہ رفتار ہے جس میں ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ اب یہ انسان کے اپنے فیصلہ پر منحصر ہے کہ وہ اپنے سفر کا آغاز ہی حقیقت (صداقت) کی راہ نمائی میں کرے اور اس طرح راستے کی خطرناک گھائیوں سے بھی محفوظ رہے، اور مسافت بھی برق رفتاری سے طے کر لے۔ یا عقل کے تجرباتی طریق کے مطابق چھوڑ کر کھاتا ہوا، صدیوں کے بعد وہاں جا کر پہنچے۔ اول الذکر طریق سے حق، ایک ہی جہت میں باطل پر غالب آجاتا ہے۔ ثانی الذکر طریق سے وہ صدیوں میں جا کر غالب آتا ہے۔ غالب یہ طور حق ہی کو آنا ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ آخر الامر غالب، حق ہی نے آنا ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ حق جو نہیں خلا میں غالب آجائے گا۔ حق سے مراد ہے حق پر مبنی نظام۔ یہ نظام انسانوں کی دنیا میں رائج ہوگا اور انسانی ہاتھ ہی اسے متشکل کریں گے۔ ایک جماعت اسے متشکل کرے گی اور دوسری جماعت اس کی مخالفت کرے گی۔ اسکی حمایت کرنے والی جماعت اگر مادی توند کے اعتبار سے خرقہ مخالف کے مقابلہ میں، کمزور بھی ہوگی تو بھی آگے کامیابی ہوگی۔ قرآن کریم اس کمزوری کو ابتداءً ایک اور دو کی نسبت سے تعبیر کرتا ہے اور آخر الامر ایک اور دو کی نسبت سے۔

۶۔ یہ پرکھنے کے لئے کہ حق کس طرف ہے، بنیادی کسوٹی یہ ہے کہ

وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَنِيْلُكُمْ حِينَ الْآخِرِ مِنْ

وہی نظریہ زندگی، وہی مسلک حیات، وہی نظام انسانی باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوع

انسان کے لئے منفعت کا موجب ہو۔

مفاد پرست انسانوں کی گروہ مندانہ منفعت کوششیاں، اس اصول کو ناکام بنانے کے لئے مصروف جدوجہد رہتی ہیں لیکن خدا کی اسکیم اسے کامیاب و کامران بنا کر رہتی ہے۔

يُرِيدُونَ اَنْ يُطْفِئُوْا نُوْرًا اَدْنٰى بِاَنْوٰٓءِ اِهْرٰمٍ وَّ يٰٓاَيُّهَا اللّٰهُ اِنَّا اَنْتَ
تَسْتَعْمَرُ نُوْرًا وَّ لَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ ۝ (۲۱۸)

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اس نورِ خداوندی کو پھونکیں یا مار کر بجھادیں۔ لیکن خدا کی مشیت ان کی ان کوششوں کو بار آور نہیں ہونے دے گی۔ یہ نور اپنی تکمیل تک پہنچ کر رہے گا۔ خواہ مفاد پرست گردہوں پر یہ چیز کتنی ہی شاق کیوں نہ گذرے۔

یہی وہ نظامِ زندگی ہے جو باطل پرستی ہر نظام پر آخر الامر غالب آئے گا۔

هُوَ الَّذِي اَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَّ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَ عَلٰى الدِّيْنِ
كَلِمَةً وَّ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۲۱۹)

خدا نے اپنے رسول کو صحیح منزل کی طرف راہ نمائی دے کر بھیجا ہے۔ یعنی ایک ایسا نظامِ زندگی دے کر جو حق پرستی ہے۔ یہ نظام، دنیا کے ہر نظام پر غالب آکر رہے گا۔ خواہ یہ بات ان لوگوں پر کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے جو فالحق تو انہیں خداوندی کی اطاعت نہیں کرنا چاہتے۔

حق و باطل کی اس کشمکش کے نقطہ نگاہ سے دنیا میں انسانوں کی دو ہی جماعتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک حق کا غلبہ چاہنے والی۔ اسے جماعتِ مومنین کہا جاتا ہے۔ دوسری باطل کے غلبہ کی متمنی۔ اسے کفار کا گروہ کہتے ہیں۔ کشمکش انہی دو جماعتوں میں ہوتی ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو حق پرست ہونے کا دعوے کرتے ہیں لیکن درحقیقت چاہتے ہیں باطل کے ساتھ لپٹے رہنا۔ انہیں منافق کہا جاتا ہے۔ یہ گروہ، قرآنِ کریم کی رو سے بدترین خلائق ہوتا ہے۔ یعنی کفار سے بھی بدتر۔

”شُرک“ حق اور باطل کے نظام میں مفاہمت (COMPROMISE) کو کہتے ہیں جس کی نظامِ حق میں وظیفہ گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اس نظام کے داعیِ اول (حضرتِ نبی اکرم سے واضح الفاظ میں کہدیا گیا کہ

وَلَا تَزِرُكُوْنًا اِلٰى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسُّكُمُ النَّارُ ۝ (۱۱۳)

یہ لوگ جو عدل کے بجائے ظلم پرستی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، تو تم ان کی طرف

ذرا سا بھی نہ جھکنا۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو جس جہنم میں یہ گرفتار ہیں اس کی آگ کے شعلے تمہیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔

حق و باطل کے اضداد میں مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر حق کے ساتھ باطل کی ذرا سی بھی آئینرش ہو جائے، تو حق 'حق نہیں رہتا۔

قرآنی تصور کی رو سے حق اور باطل کے تضاد کی کیفیت یہ ہے۔ دوسری طرف فلسفہ جدلیت ہے جو تصور پیش کرتا ہے کہ دو باہم متضاد صحتوں میں کچھ وقت کے بعد ایک دوسرے میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ یعنی کچھ عرصہ کے بعد حق — باطل ہو جاتا ہے اور باطل 'حق ہو جاتا ہے۔

اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کے اس فلسفہ کو (کہ حق ہمیشہ حق رہتا ہے اور باطل باطل رہتا ہے) وہ ماوراء الطبیعیاتی (METAPHYSICS) سے تعبیر کرتے ہیں جس کی ضد فلسفہ جدلیت ہے۔ اس لئے اس بنا پر ہمیں ان کے فلسفہ پر تنقید کرنے کا حق نہیں۔ ہم اس دلیل کو تسلیم کر لیتے لیکن انہی کا یہ بھی تو دعوے ہے کہ قانون تضاد (LAW OF CONTRADICTION) حق ہے جو باطل میں تبدیل نہیں ہوتا۔ وہ شروع سے وہی ہے اور ابد تک وہی رہے گا۔ یہ خود (METAPHYSICS) ہے، لہذا بات صرف اتنی ہوئی کہ فلسفہ جدلیت، ایک قانون کو غیر متبدل تسلیم کرتا ہے، قرآن ایک سے زیادہ قوانین کو ایسا کہتا ہے۔ اس کے اس دعوے کی دلیل بھی وہی ہے جو دلیل وہ پیش کرتے ہیں۔ یعنی مستجابی دلیل (PRAGMATIC TEST)۔ اس کے متعلق ہم ذرا آگے چل کر گفتگو کریں گے۔ جب 'علم' سے متعلق گوشہ سامنے آئے گا۔

بہر حال یہ ہے وہ نظام جسے قرآن پیش کرتا ہے۔ یعنی وہ نظام زندگی جس میں مستقل اقتدار حیات یا غیر متبدل قوانین محسوس عملی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ یہ نظام زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہوتا ہے۔ مکان کی حدود سے اس طرح کہ یہ عالمگیر نظام ہے جو کسی خاص خطہ زمین میں محدود نہیں رہ سکتا، نہ ہی کسی خاص قوم پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ تمام نوری انسان کے لئے یکساں نظام ہے۔ یہاں تک زمان کا تعلق ہے۔ اس نظام کے محسوس پیکر میں تو زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں ہو سکتی ہیں لیکن اس کی اصل و بنیاد ہمیشہ وہی رہتی ہے۔ یعنی غیر متبدل قوانین جن پر ان کی عمارت استوار ہوتی ہے، اسے دین کہا جاتا ہے۔

۹۔ اضراد میں توافق

حق و باطل کی کشمکش دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو ان جماعتوں کے درمیان جو حق و باطل کی حامی ہوتی ہیں۔ اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ دوسرے افراد کے سینے کے اندر (داخلی) کشمکش جس میں ایک طرف انسان کے بیباک جذبات، طبعی مفاد کے حصول کے لئے ہیجان خیز رہتے ہیں اور دوسری طرف اس کی ذات کی نشوونما کے تقاضے حق کی حمایت کے داعی ہوتے ہیں۔ انسانی جذبات کو فنا کر دینے کا تصور انتہائی غلط نہی اور خودکشی ہے۔ جذبات ہی تو وہ قوت محرکہ ہے جو انسان کو آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ قرآن کا انداز تزیینت یہ ہے کہ وہ جذبات کو مستقل اقدار کے تابع سرگرم عمل رہنا سکھاتا ہے۔ نبی اکرمؐ کے الفاظ میں۔ "ہن طرح ابلیس مسلمان ہو جاتا ہے" اس سے ان افراد کے سینے کا داخلی اضطراب تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ نظام انہی افراد کے باطنوں سے تشکل ہوتا ہے۔ اس کیفیت کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ۔ لَقَدْ دَاوُرُ السَّلَامَةِ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ (۱۳۸) خدا کی صفت ربوبیت کے زیر سایہ انہیں ایسا مقام حاصل ہو گا جس میں ہر سمت سے سلامتی کی آوازیں دجہ نشا ط روح ہوں گی۔ (و تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ رَّبِّهِ)۔ اس وقت انسان کے ارضی معاملات اور سماوی اقدار (غیر متبدل قوانین) ایک ہی مرکز میں مرکوز ہوں گے۔ (۳۹) اور انسانی معاشرہ کی حالت یہ ہوگی کہ۔ لَا تَسْلِفُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا۔ کسی انسان کا دوسرے انسان پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ہوگا۔ وَالْأَمْرُ يُؤْمَرُ بِلَاہِ۔ (۴۰)۔ حکومت انسانوں کی نہیں بلکہ قوانین خداوندی کی ہوگی۔

وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا۔ (۴۱)

اور زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔



۱۰۔ علم کے متعلق تصور

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، فلسفہ جدیدیت کی رُو سے علم وہی علم کہلانے کا مستحق ہے جو حواس کے ذریعے سے حاصل کیا جائے۔ اور نظریہ وہی درست تسلیم کیا جاسکتا ہے جس کی تائید اس کے نتائج کریں ہیں۔ عملی طریق سے انسان بتدریج قوانینِ نظرت کا علم حاصل کر لے گا حقائق انہی قوانین کو کہا جاتا ہے۔

قرآن کریم بھی انسانی علم ہی کو قرار دیتا ہے جسے حواس (SENSE PERCEPTION) کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ
كُلٌّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْدَهُ مُسْتَوْذَوٰهُ (۱۶۱)۔

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو! تمہاری سماعت، بصارت اور قلب ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ انہوں نے اس بات کے علم ہونے کی شہادت دی تھی یا نہیں۔

یعنی حصول علم کے لئے ضروری ہے کہ انسانی حواس معلومات حاصل کر کے، قلب (MIND) تک پہنچائیں اور وہ ان سے کوئی نتیجہ مستنبط کرے۔ چنانچہ قرآن کریم قدم قدم پر مظاہر فطرت پر غور و متکر کی تاکید کرتا ہے۔ وہ علماء، کہتا ہی نہیں ہے جو کارگہ فطرت کے مشاہدہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچیں کہ اس میں قوانین خداوندی کس کس خوبی سے کارسزما ہیں۔ (۲۶-۳۵)۔ نظام فطرت کے ساتھ ہی وہ انسانی تاریخ کے مطالعہ پر بھی بڑا زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم اقوام سابقہ کی سرگزشتوں پر غور کرو اور دیکھو کہ جس قوم نے زندگی کے صحیح قوانین کے مطابق نظام متشکل کیا اس کا نتیجہ کیا نکلا اور جس نے غلط راہ اختیار کی اس کا انجام کیا ہوا۔

نظام فطرت کے مشاہدہ اور تاریخ انسانی کے مطالعہ کے بعد جس نتیجہ پر انسان پہنچے، قرآن اسے ایک نظریہ قرار دیتا ہے۔ وہ نظریہ صحیح ہے یا غلط اسے پرکھنے کے لئے وہ کہتا ہے کہ اس نظریہ پر عمل کیے دیکھو۔ اگر اس کے نتائج اس کے دعویٰ کی تائید کرتے ہیں تو وہ نظریہ صحیح ہے۔ اگر نتیجہ اس کے مطابق نہیں نکلتا تو وہ نظریہ درست نہیں۔ یہی وہ طریق تھا جسے خود نبی اکرم نے اپنے دعاوی کی صداقت کے ثبوت کے لئے پیش کیا۔ آپ نے اپنی قوم مخالف سے کہا کہ میں نے تو ان خداوندی تمہارے سامنے پیش کر دیئے۔ اب ان کی صداقت کے پرکھنے کا طریق یہ ہے کہ

قُلْ يٰٓعٰمِلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْۤ اَعْمَلُ ۗ فَسُوْٓفَ تَعْلَمُوْنَ ۗ
مَنْ تَكُوْنُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِۙ اِنَّهٗ لَیُفْلِحُ الْعٰلِمُوْنَ ۝ (۱۶۲)

ان سے کہو، کہ اے میری قوم! تم اپنے طریق پر عمل کرو، میں اپنے طریق پر عمل کرتا ہوں نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ منزل تک کون پہنچتا ہے۔ یہی وہ طریق ہے جس سے یہ حقیقت ابھر کر

سننے آجائے گی کہ جو لوگ دوسروں کی محنت کو غصب کر کے ظلم کرتے ہیں، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

جس دعویٰ کا اثبات اس کے عملی نتائج نہیں کرتے وہ دعویٰ صداقت پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس طریق سے حقیقت تک پہنچنے کے لئے بڑی لمبی مدت درکار ہوتی ہے جہاں تک مستقل اقدار کا تعلق ہے اس طویل مدت کو مختصر کرنے کے لئے خالق کائنات کی طرف سے ایک اور طریق تجویز کیا گیا۔ اسے وحی کہا جاتا ہے یعنی ان تو انہیں کو کسی انسان پر براہ راست منکشف کر دیا جاتا اور وہ انہیں دوسرے انسانوں تک پہنچا کر ان کہتا کہ تم ان پر عمل کر کے خود ان کی صداقت کے متعلق اطمینان کر لو۔

وحی کا یہ سلسلہ چودہ سو سال ہوئے ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ لہذا اب انسانی علم کا ذریعہ مطالعہ مشاہد اور فکر و شعور کے علاوہ کوئی نہیں۔ وحی کے ذریعہ جو علم آخری مرتبہ دیا گیا تھا وہ اپنی اہلی شکل میں قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ تم ان قوانین پر غور و فکر کرو اور ان پر عمل کر کے دیکھو اگر اس طرح تمہیں ان کی صداقت کے متعلق اطمینان ہو جائے تو انہیں صحیح تسلیم کرو۔ غور و فکر سے انسانی ذہن ایک نظریہ کے متعلق اتنا اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ سنی برحقیقت ہے یا نہیں۔ اگر وہ اسے اس طرح سنی برصد آ خیال کرے تو یہ بات اسے اس پر آمادہ کر دیتی ہے کہ وہ اس پر عمل کر کے دیکھے۔ اس وقت اس نظریہ کے نتائج ہونے کے سامنے نہیں ہوتے۔ اس طرح ان دیکھے نتائج پر اعتماد کر کے آمادہ عمل ہو جانے کو ایمان بالغیب کہتے ہیں یعنی ان نتائج پر یقین جو مہنوز مشہور طور پر سامنے نہیں آتے۔ یہ یقین اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے بغیر انسان اس کے مطابق عملی قدم اٹھانے کے لئے بطیب خاطر تیار نہیں ہو سکتا۔ جب نتائج اس دعوے کی تائید کر دیں تو وہی ایمان بالغیب "حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں پہلے درجہ کے یقین کو علم الیقین کہا جاتا ہے اور دوسرے درجہ کے یقین کو عین الیقین (دستار) یعنی نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین کرنا۔

یہ ہے قرآن کی رُود سے علم کی تعریف (DEFINITION) اور علم و عمل کا باہمی تعلق۔ وہ کہتا ہے کہ جو تو انہیں یا مستقل اقدار تمہارے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، تم ان پر عقل و فکر اور دلیل و بیان کی رُود سے غور کرو۔ اگر وہ نہیں قابل قبول نظر آئیں تو ان کے مطابق اپنا معاشرہ تشکیل کرو۔ اس سے جو نتائج مرتب ہوں گے وہ ان تو انہیں کی صداقت کی زندہ شہادت بن جائیں گے۔ (۲۲/۵)۔ یوں

وہ انسان کو اس محنت شاقہ سے بچا لیتا ہے جو عقل کے تجرباتی طریق سے منزل تک پہنچنے کے لئے لاینفک ہوتی ہے۔

فلسفہ کا اثر معاشی نظام پر

اب ہم اپنے سفر کی آخری منزل میں پہنچ رہے ہیں۔ ہم نے یہ ساری فلسفیانہ بحث اس لئے کی ہے کہ کمیونزم کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کے معاشی نظام کی بنیاد فلسفہ جدلیت پر ہے۔ اس کے برعکس قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ بنیاد اس قدر کمزور ہے کہ یہ اتنے عظیم معاشی نظام کی عمارت کا بوجھ اٹھا نہیں سکتی۔ اس نظام کے لئے قرآن کا فلسفہ حیات ہی اس میں محکم عطا کر سکتا ہے۔ اس لئے انسانیت کی نجات کی راہ یہ ہے کہ ستر آتی فلسفہ کی بنیادوں پر اس معاشی نظام کی عمارت استوار کی جائے۔ دونوں فلسفے ہمارے سامنے آگئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مادی جدلیت کا فلسفہ اس عمارت کے بوجھ کا تحمل کیوں نہیں ہو سکتا۔

مادی فلسفہ: خواہ وہ جدلیت کا ہو یا مادہ راہ الطبیعیاتی، اس کا نظری نتیجہ نظام سرمایہ داری کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا۔ مادی فلسفہ حیات کی رُو سے انسان کی زندگی صرف حیوانی ہوتی ہے اور قوانین فطرت کے تابع و متبعی ہے۔ یہ وہ قوانین ہیں، جن کا اطلاق دیگر حیوانات پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح انسان پر۔ اس طرح اس فلسفہ کی رُو سے انسانی زندگی کے تقاضے محض طبعی تقاضے ہوتے ہیں۔

طبعی زندگی کے تین تقاضے ایسے ہیں جنہیں بنیادی یا جبلی (INSTINCTIVE) قرار دیا جاتا

ہے۔

(۱) تحفظِ خویش کا تقاضا (SELF - PRESERVATION)

(۲) تغلبِ خویش کا تقاضا (SELF - AGGRESSION) — یہ درحقیقت تقاضا ہی

ہی کی تکمیل کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اور

(۳) افزائشِ نسل کا تقاضا (SELF - REPRODUCTION)

تقاضا کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہر فرد، زیادہ سے زیادہ سامانِ زینت سمیٹنے کی فکر کرے تاکہ اس سے اس کا زیادہ سے زیادہ تحفظ ہو سکے۔ اگر اس مقصد کے حصول میں اس کے راستے میں کوئی حائل

ہو جائے تو یہ اس کا مقابلہ کر کے اس پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ تقاضا ہے، ہوا۔ اور جب اپنے تحفظ کی طرف سے اطمینان ہو جائے تو پھر اپنی اولاد کے تحفظ کی فکر کرے۔ یہ تقاضا ہے۔ اس تصور زندگی کے ماتحت، کسی فرد کے لئے، کسی دوسرے فرد کے تحفظ یا مفاد کا سوال پیدا ہو نہیں سکتا۔ کوئی حیوان، کسی دوسرے حیوان کے مفاد کا تصور نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک حصول مفادِ خویش کے علاوہ کوئی مقصد ہوتا ہی نہیں، ہو سکتا ہی نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس فلسفہ کا ملنے والا اس سوال کا اطمینان بخش جواب کبھی نہیں دے سکتا۔

میں دوسروں کی مدد کیوں کروں؟

آپ زیادہ سے زیادہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی تمدنی زندگی کا تقاضا باہمی تعاون ہے۔ یعنی میرے لئے کسی محتاج کی مدد کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اگر کل کو میں محتاج ہو جاؤں تو دوسرے میری مدد کریں۔ لیکن ایسا کہتے وقت یہ نہیں سوچا جاتا کہ یہی جذبہ تو وہ ہے جس کے تابع ہر شخص زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی فکر کرتا ہے یعنی وہ ایسا انتظام کرنا چاہتا ہے کہ وہ کسی وقت بھی دوسروں کا محتاج نہ ہو۔ یہی وہ مناسبت (RACE) ہے جو ایک فرد کی حالیہ ضروریات پوری ہونے کے بعد بھی اسے اطمینان سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ وہ ہر وقت سمیٹنے کی فکر میں غلطان دیکھا رہتا ہے اور اسی سے معاشرے میں ناہمواریاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ زیادہ عقل و ہنر (WITS) کے مالک زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیتے ہیں اور دوسرے جیسے محتاج سے محتاج تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جو زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیتا ہے وہ دوسروں کے تعاون کا محتاج نہیں رہتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اس تعاون کو روپے سے خرید سکتا ہوں۔ اس لئے تعاون کی ضرورت اسے اس پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ وہ دوسروں کی امداد کرے۔ اسی کا نام سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے۔ یہ مادی فلسفہ زندگی کا لازمی نتیجہ ہے۔

فلسفہ جدلیت، انسانی زندگی اور اس کے تقاضوں کا تصور تو یہ پیش کرتا ہے لیکن اس بنیاد پر معاشی نظام وہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں زیادہ سے زیادہ ایشیا کرنا پڑتا ہے۔ کمیونزم کے معاشی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ۔

ہر شخص سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے اور اس میں سے اسے بقدر اس کی ضرورت کے دے کر باقی سب دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے لیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ (مادی تصویر جیات کی رُو سے) وہ کونسا جذبہ محرک ہے جس کے ماتحت ایک فرد زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اس میں کم از کم خود لے کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دیدے۔ اس قسم کا مطالبہ زندگی کے طبعی تقاضے کے خلاف ہے۔ تحفظِ خویش کی جیات (INSTINCT) اس کی کبھی اجازت نہیں دے سکتی۔ یہ س مطالبہ کارِ راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ آپ ہنگامی طور پر عوام کے جذبات کو مشتعل کیے جو نشہ پلا کر مدہوش کرنے ہی کی دوسری شکل ہوتی ہے، اس پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ مفادِ خویش کو نظر انداز کر دیں۔ لیکن اسے ان کا مستقل پہنچ زندگی نہیں بنا سکتے۔ روس کا تجربہ اس کا شاہد ہے۔ انہوں نے عوام (محتاجوں اور غریبوں کو) یہ کہہ کر کہ ”اٹھو اور امیروں کو لوٹ لو۔ ان کی دولت و حشمت کے مالک تم بن جاؤ گے۔ انہیں بے پناہ قربانیوں کے لئے آمادہ کر دیا۔ انہوں نے اس نشہ سے مدہوش ہو کر ہنگامی طور پر وہ کچھ کر دیا جسے دیکھ کر دنیا انگشت بدندان رہ گئی۔ لیکن جب ان کا نشہ اتر گیا تو ایشیا اور قریبانی کا وہ جذبہ بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد جب ان محنت کشوں سے کہا گیا کہ تم..... زیادہ سے زیادہ محنت کرو اور اس میں سے صرف بقدر اپنی ضرورت کے لو۔ تو انہوں نے کہا کہ سرکار! پھر اس میں اور قدیم نظام سرمایہ داری میں کیا فرق ہے؟ اس میں کارخانہ دار ہم سے زیادہ سے زیادہ محنت کراتا تھا اور ہمیں بقدر ہماری ضروریات کے دیتا تھا۔ یہی کچھ اب آپ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ایسا کیوں کریں؟ اس کا کوئی اطمینان پیش جواب ان کے پاس نہیں تھا۔ انہوں نے اپنا نظام قائم رکھنے کے لئے دُندھے سے کام لینا چاہا۔ یہ کچھ وقت کے لئے تو چلا لیکن پھر ناکام رہ گیا۔ کوئی نظام قوت کے بل بوتے پر سلسل نہیں چل سکتا۔ اس سے مجبور ہو کر روس والوں کو اپنے نظام میں تبدیلی کرنا پڑی۔ یہ جو وہاں اپنے موقف سے رجعت ہوئی ہے۔ جسے چین تحریف (REVISIONISM) قرار دے رہا ہے۔ یہ کسی سیاسی دباؤ یا مصلحت کا پیدا کردہ نہیں۔ یہ اس فلسفہ کی بنیاد کی کمزوری کا فطری نتیجہ ہے۔ چین ابھی اس منزل میں نیا نیا داخل ہوا ہے۔ اس لئے اس کا مقام یوں سمجھئے کہ وہی ہے جو لیسن کے زمانے میں ’روس کا تھا۔ اس لئے اسے ابھی اس تحریف کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جب یہ بحران ختم ہو جائے گا تو وہاں (چین میں) کبھی وہی صورت پیدا ہو جائے گی جو روس میں پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کی بنیاد یہاں بھی وہی ہے جو روس میں تھی۔ یہ کسی خارجی اثرات کا نتیجہ نہیں۔ یہ اس فلسفہ کی بنیاد کی کمزوری کا لازمی ثمر ہے۔ چنانچہ ماؤزے سنگ کو ابھی سے اس احساس نے ستانا شروع کر دیا ہے کہ چین کی نئی نسل کمیونزم کے سلک سے بٹی جا رہی ہے۔ اسے سچا لانا چاہیے۔

اس کے لئے وہاں نوجوانوں پر مشتمل حفاظتی عسکر (RED GUARDS) کے ہاتھوں از سر نو اس انقلابی جدوجہد کو شروع کرایا جا رہا ہے جس میں سے ماؤنٹے تنگ اور اس کی پارٹی کے دیگر رفقاء گزر سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ اس تحرک (IMPETUS) سے یہ نظام چند قدم اور آگے نکل جائے لیکن اس سے اسے استحکام اور بھرتا نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہ اس کی بنیادی کمزوری ہے جو خارجی محرکات سے رفع نہیں کی جاسکتی۔

اس کے برعکس، قرآن کا فلسفہ حیات یہ ہے کہ

(۱) انسان کی زندگی محض طبعی زندگی نہیں۔ انسان جسم کے علاوہ ایک اور شے سے بھی عبارت ہے، جسے اس کی ذات کہا جاتا ہے۔

(۲) مقصد زندگی جسم کے تقاضوں کا پورا کرنا بھی ہے اور ذات کے تقاضوں کا پورا کرنا بھی۔ اگر ان دونوں تقاضوں میں ٹکراؤ نہ ہو تو ہو المراد۔ لیکن اگر ان میں کسی وقت ٹکراؤ ہو جائے تو پھر ذات کے تقاضوں کو جسم کے تقاضوں پر ترجیح دیکھائی گی۔

(۳) ذات کے تقاضوں کو پورا کرنے سے اس کی منہمک صلاحیتوں کی نشوونما ہو جاتی ہے اور اس طرح جسم کی موت کے بعد زندہ رہ کر آگے بڑھتی اور مزید ارتقائی منازل طے کئے چلے جاتی ہے۔ اسے حیاتِ آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۴) جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے آپ خود اپنے استعمال میں لائیں۔ مثلاً آپ کے جسم کی پرورش صرف اس شے سے ہوگی جسے آپ خود کھائیں گے۔ اس کے برعکس انسانی ذات کی نشوونما ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے آپ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر جسم کی نشوونما "لینے" سے ہوتی ہے اور ذات کی نشوونما "دینے" سے۔ قرآن کے الفاظ میں — **الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ**۔ (۹۲)۔ یعنی اس شخص کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے جو اپنی چیزوں کو دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دیتا ہے۔

یہ ہے وہ فلسفہ حیات جس کی بنیادوں پر قرآن اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرتا ہے۔ اس کے معاشی نظام کے اصولی خط و خال یہ ہیں:

(۱) خدانے سامانِ زیست تلم نوع انسان کی پرورش کے لئے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ اس لئے

ذرائع پیداوار کسی کی انفرادی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ایسا کرنا خدا کے مقابلہ میں دوسرے خدا

کھڑے کر دینے کے مراد ہے۔

(۳) چونکہ اس مقصد حیات انسانی ذات کی نشوونما ہے اور وہ اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ نہاں دوسروں کی نشوونما کے لئے زیادہ سے زیادہ دے۔ اس لئے اس نظام میں ہر فرد کی خواہش اور کوشش یہ ہوگی کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت سے کمائے۔ اپنی کمائی کے حاصل میں سے اپنی بنیادی طبعی ضرورت پوری کرنے کے بعد باقی سب دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے **يَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ** مسئلہ العنق (۲۱۹)۔ یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم کس قدر دوسروں کے لئے دیدیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری بنیادی ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب (تاکہ اس سے اس کی ذات کی زیادہ سے زیادہ نشوونما ہو جائے۔ اس عمل (PROCESS) کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں، ہمارے ہاں اس وقت زکوٰۃ کا مفہوم صرف اس قدر رہ گیا ہے کہ سرمایہ دار جس قدر چاہے سمیٹے چلے جائیں لیکن اس میں سے اڑھائی فی صد خیرات کر دیں۔ لیکن قرآن کی رو سے اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔ زکوٰۃ کے معنی نشوونما ہیں۔ ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہیں۔ دوسروں کی نشوونما کا سلمان بہم پہنچانا۔ یہ اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ہے (۲۲) اس میں ہر فرد زیادہ سے زیادہ محنت کرتا اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتے جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایسا موقع آئے تو وہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتا ہے (۲۳)۔ وہ یہ کچھ کسی خارجی دباؤ یا سیاسی مصلحت کے ماتحت نہیں کرتا۔ یہ اس کی ذات کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس میں وہ زیادہ سے زیادہ اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ (یعنی زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتے جانے) کا جذبہ بھکر کہ، حیات آخرت پر ایمان کے علاوہ کچھ اور نہیں سکتا۔ (۲۴)۔ یہ صرف اسی تصور حیات کے ماتحت ممکن ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ کام کرے اور اپنی ضروریات سے زائد سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے۔ (دوسروں سے مراد اپنی جماعت کے افراد ہی نہیں، بلکہ پوری کی پوری نوع انسانی ہے)

اور جب اپنی ضروریات سے زائد، سب کچھ دوسروں کے لئے دیدیا جائے گا تو فائدہ دولت (SUR - PLUS - MONEY)۔ جو نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہے۔ کسی کے پاس رہے گی ہی نہیں نہ ہی جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوگا، نہ ہی روپیہ سمیٹنے کے لئے باہمی دوڑ (RACE) ہوگی۔ اس میں جو منافست (RACE) ہوگی، وہ زیادہ سے زیادہ کام کر کے زیادہ سے زیادہ دوسروں کو

دینے کے لئے ہوگی۔ (پیشہ)۔

یہ ہے وہ فلسفہ حیات جس کی بنیادوں پر تران اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ ان ہر دو فلسفہ میں سے کونسا فلسفہ ایسا ہے جس کی بنیادوں پر وہ نظام قائم رہ سکتا ہے جس کا تصور کمیونزم پیش کرتی ہے۔ وہ صرف تران کے فلسفہ حیات کی بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے۔

—————
—————
—————

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، فلسفہ عدلیت میں دوسرا نقص یہ ہے کہ اس میں تناقض (LAW OF CONTRADICTION) کے علاوہ کسی تناقض، کسی تصور کسی نظام کو غیر تبدیل تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس کا تصور یہ ہے کہ تناقض اصدا کی رُو سے ایک نظام ظہور میں آجاتا ہے۔ پھر اس میں اس کی ضد کھڑی ہو جاتی ہے اور دونوں میں تصادم شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ وقت کے بعد وہ پہلا نظام مغلوب ہو جاتا ہے اور دوسرا غالب آجاتا ہے۔ پہلے نظام کا دور دورہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرے نظام کا عہد شروع ہو جاتا ہے۔ یہ گردش دولا بی اسی طرح جاری چلی آرہی ہے۔ اسی طرح جاری رہے گی۔ اس وقت اس گردش کی رُو سے، سابقہ نظام سرمایہ داری پر اس کی ضد (نظام سوشلزم) غالب آ رہا ہے۔ اس کی اگلی منزل کمیونزم ہوگی) اب اسے محض اتفاق سمجھئے کہ ہم اس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جب اس نظام کے غلبہ کی باری ہے جو مزدوروں اور محنت کشوں کے لئے زیادہ نفع بخش ہے۔ اس میں نہ مارکس کی فکر کا کوئی دخل ہے، نہ لینن کی عملی کارروائی کا۔ نہ روس کا کوئی کمال ہے، نہ چین کا اعجاز۔ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کی رُو سے ایسا ہونا تھا۔ ایسا ہو رہا ہے اس کے بعد جب گردش کا دوسرا رخ آئے گا تو یہ نظام مٹ جائے گا اور اس کی جگہ اس کی ضد کوئی دوسرا نظام لے لیگا۔ اس وقت روس اور چین تو ایک طرف، ساری دنیا کے انسان مل کر بھی چاہیں کہ اس قسم کے علاوہ معاشی نظام کو برقرار رکھ لیں تو ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اس وقت اگر نظام سرمایہ داری مٹ رہا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ نظام عدل و انصاف پر مبنی نہیں تھا۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں تھی اور اس کی جگہ سوشلزم کا نظام برسرِ اقتدار آ رہا ہے تو یہ بھی اس لئے نہیں کہ یہ نظام نوبخ انسان کے لئے زیادہ متفعل بخش ہے۔ یہ تو صرف اپنی اپنی باری کا سوال ہے۔ اس کی باری ختم ہو رہی ہے اس لئے وہ جا رہا ہے۔ اس کی باری آ رہی ہے اس لئے یہ آ رہا ہے۔ کل کو جب اس کی باری ختم ہو جائے گی تو

یہ کبھی چلا جائے گا اور مزدوروں اور محنت کشوں کی ہزار آہ و فغاں اور ان کے حامیوں کی لاکھ سخی و کاوش بھی اسے برقرار نہیں رکھ سکے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر وقت کمیونزم کی طرف سے دنیا کے سامنے اس کا معاشی نظام پیش کیا جا رہا ہے اس کا فلسفہ نہیں۔ اس نظام کے متعلق بدلائل و شواہد بتایا جا رہا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلہ میں انسانیت کے لئے آیر رحمت ہے اور یہ واقعہ بھی ہے، سوال یہ ہے کہ جب اس نظام کی باری ختم ہو جائے اور یہ اپنی مسند خالی کر رہا ہوگا اور اس کی جگہ دوسرا نظام لے رہا ہوگا جو اس کی ضد ہوگا تو اس وقت کمیونزم کے حامی دنیا کو کیا کہیں گے؟ اس وقت ان کے تمام دلائل و شواہد، جو یہ موجودہ نظام (کمیونزم) کے حق میں پیش کر رہے ہیں، سب باطل قرار پائیں گے۔ اس وقت انہیں بھی اس آئے والے نظام کی حمایت کرنی ہوگی۔ ورنہ جو درگت اس وقت نظام سرمایہ داری کے حامیوں کی بن رہی ہے وہی کچھ ان کے ساتھ بھی ہوگا۔ اس لئے کہ نظام سرمایہ داری کے حامیوں کا تصور اتنا ہی ہے تاکہ وہ جدید نظام کا ساتھ نہیں دیرے جانے والے نظام کے ساتھ لپٹے ہوئے ہیں۔ اگر اس وقت کمیونزم کے حامیوں نے اس جدید نظام کا ساتھ نہ دیا، تو وہ بھی اسی جرم کے مرتکب قرار پائیں گے جس جرم کی بنا پر اس وقت نظام سرمایہ داری کے حامیوں کو مورد الزام قرار دیا جا رہا ہے۔

پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اس وقت ماورے تنگ اپنی قوم کو کمیونزم کے معاشی نظام کی برکت کی بنا پر اس مقام تک لے آیا ہے۔ کل کو جب اس نظام کی باری ختم ہو جائے گی تو پھر اس قوم سے کیا کہا جائے گا اور ان کے لئے وجہ جامعیت کیا چیز ہوگی؟

ہاں یہ ہے کہ ماورے تنگ کا فلسفہ اصدا، فلسفہ جبریت (DETERMINISM) ہی کی ایک شاخ ہے جس کی رو سے انسان کی حیثیت کائنات کی عظیم مشینری میں ایک بے بس پُرزے سے زیادہ کچھ نہیں، جو مشین کی حرکت کے ساتھ چلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ فلسفہ یونان کی منکر گاہوں سے ابھرا اور آنتا کو تباہ کرتا ہوا مختلف بھیس بدل کر یہاں تک آپہنچا ہے۔ یہی وہ فلسفہ تھا جس سے متاثر ہو کر ہندوؤں نے تاسخ (آداگون) کا عقیدہ وضع کیا اور عیسائیت نے "اولین گناہ (ORIGINAL SIN) کے کلنگ کا ٹیکہ انسانیت کی پیشانی پر لگایا جو کسی کے دھوئے دھل نہیں سکتا۔ مغرب کے مفکرین اور سائنسدانوں نے عیسائیت کو تو خیر باد کہہ دیا لیکن وہ اس کے اس فلسفہ کے چکر سے نہ نکل سکے چنانچہ ان کی ہر تحقیق کا رخ ہی طرف جاتا ہے کہ انسان مجبور محض ہے۔ اسی سے ہیگیل متاثر تھا اور ہیگارکس

بیچارے کے اعصاب پر سوار رہا۔ اب وہی تصور تلسفہ امتداد کے روپ میں سامنے آیا ہے جس میں نظام خود بخود بدلتے رہتے ہیں اور انسان، ہر آنے والے نظام کا ساتھ دینے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ نہ اس کی برائیاں، کسی مرتبہ نظام کا کچھ بگاڑ سکتی ہیں، نہ اس کی اچھائیاں، اس کا کچھ سنوار سکتی ہیں۔ اس کے برعکس مشران یہ کہتا ہے کہ ایک نظام فی ذاتہ اچھا ہوتا ہے اور دوسرا نظام فی ذاتہ خراب ہوتا ہے۔ جو اچھا ہوتا ہے اس میں قائم رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے، جو خراب ہوتا ہے وہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اچھے نظام کا معیار یہ ہے کہ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُتُ فِي الْأَرْضِ (۱۳)

جو نظام تمام نوع انسان کے لئے نفع بخش ہوتا ہے وہی نظام اچھا ہوتا ہے اور اس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

اس کے برعکس، اِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ - (۱۴)۔ جو نظام سلب و نہب اور ظلم و جور پر مبنی ہوگا اسے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ چونکہ محو و ثبات کا یہ قانون غیر متبدل ہے۔ اس لئے اس کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ بات ساری وقت (TIME) کی ہے انسانوں کی کوئی جماعت اس کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔ تو یہ ظلم پر مبنی نظام جلد مٹ جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس میں وقت لگ جائیگا۔ قرآن کریم نے اس کی ایک مثال بھی دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ نظام جاگیر داری (FEUDAL SYSTEM) جس میں زمین کے مجید و نبایت رقبے افراد کی ملکیت میں چلے جاتے ہیں، ظلم پر مبنی نظام ہے یہ مٹ کر رہے گا۔ خدا کے کائناتی قانون کی رو سے ایسا بتدریج ہوگا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا وَأَلَّ اللَّهُ بِمَنْكُمُ
لَا مَعْقِبَ لِحُكْمِهِ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۱۵)

کیا یہ لوگ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم کس طرح زمین کے رقبوں کو جاگیر داروں کی ملکیت سے کم کرتے جا رہے ہیں۔ یہ خدا کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے جسے کوئی پلٹا نہیں سکتا۔ وہ بہت جلد حساب کر دیتا ہے لیکن اس کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار سے ایک ایک ہزار سال کا ہوتا ہے۔

لیکن جب عبد نبی اکرمؐ میں، جماعت مومنین اس قانون کو عملاً نافذ کرنے کے لئے اٹھ کھڑی

ہوئی، تو وہی انقلاب جسے اپنی رفتار سے ہزاروں سال میں جا کر مکمل ہونا تھا، چند سال کے عرصہ میں ظہور میں آ گیا۔ عہد نبی اکرمؐ میں، زمین کو بیٹائی، یا کرایہ پر دینے کی مانع کر دی گئی اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں تمام زمین، نظام معاشرہ کی تحویل میں آ گئی۔ اس کے بعد جب اس جماعت کے جانشینوں نے اس قانون خداوندی سے اعراض برتا، تو اس قانون نے پھر اپنی کائناتی رفتار سے آگے چلنا شروع کر دیا اور اب یہ صدیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد، پھر عملاً مشکل ہوتا نظر آ رہا ہے۔ یہی مثال دوسرے غلط نظامہائے حیات پر بھی صادق آتی ہے۔

یہ ہے قرآن کا پیش کردہ قانونِ محوشبات۔ یہ تاریخی وجوب کی اندھی قوت کی پیدا کردہ گردشِ دولابی نہیں۔ اس میں اصول یہ ہے کہ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَ يُحْيِيَ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ۔ (پہ)۔ جو متا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے متا ہے، جو زندہ رہتا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے زندہ رہتا ہے۔ اور وہ دلیل و برہان یہ ہے کہ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ نِيْفَكُ فِي الْاَرْضِ۔ (۱۳)

زندہ وہ رہتا ہے جو نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔

اس نقطہ خیال سے بھی آپ دیکھئے کہ جدلیت کے فلسفہ اور قرآنی فلسفہ میں سے کس میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ ایسے نظام کو قائم کر سکے اور باقی رکھ سکے جو انیت کے لئے نفع بخش ہو!

ختمِ آخر

نظام کائنات پر غور کرنے سے چند ایک اہم حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ صغیر ارض پر زندگی کی نمود سے پہلے ہی یہاں سامانِ زیست موجود تھا اور موجود چلا آ رہا ہے۔ زندگی خواہ اولین جرثومہ کی شکل میں ہو اور خواہ بلند ترین حیوانی پیکر میں، جن اشیاء پر ان کے قیام و بقا کا اہتمام ہے۔ پانی، روشنی، حرارت، ہوا، خوراک، وغیرہ۔ وہ سب کچھ ساتھ موجود رہتا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سلسلہ یونہی اتفاقاً وجود میں نہیں آ گیا، یہ کسی سوچی سمجھی حکیم کے ماتحت کارفرما ہے اور سر اسر حرکت پر مبنی۔

(۲) یہ سامانِ زینت ان اشیاء کا خود پیدا کردہ نہیں، کسی اور کا عطا کردہ ہے۔ یعنی جس نے انہیں زندگی دی ہے اس نے سامانِ زندگی بھی پیدا کر دیا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں:-

وَمَا مِنْ كَائِبَةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۶۱)

زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہیں۔

(۳) صفاً ارض پر کوئی شے (انسان کے علاوہ) ایسی نہیں جو سامانِ زینت کو انفرادی ملکیت

میں لے بیٹھے۔ وہ صرف اپنی ضرورت پوری کرتی ہے۔ — وَكَائِبَةٍ مِّنْ كَائِبَةٍ لَّا تَحْتَسِبُ

رِزْقَهَا۔ اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ۔ (۱۶۲) — ذرا سوچو تو سہی کہ کتنے ذی حیات ہیں جو

اپنا رزق اپنی پیٹھ پر لاوے لاوے پھرتے ہیں۔ سامانِ زینت، مادہ، ارض پر تمہارے لئے اور

ان کے لئے بکھرا پڑا ہے۔

ان میں سے جو ذی حیات رزق کا ذخیرہ بھی کرتے ہیں (مثلاً چیونٹیاں یا شہد کی مکھیاں وغیرہ)

تو وہ بھی ان سب کی اجتماعی ضرورت کے لئے ہوتا ہے۔ انفرادی ملکیت کا سوال وہاں بھی نہیں ہوتا۔

(۴) انسانوں کے لئے بھی اسی انداز کی زندگی بسر کرنا منشاء سے نطرت تھا۔ اسے قرآن (فقہ

آدم کے تمثیلی رنگ میں) اس زمین پر جنت کی زندگی سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ زندگی جس میں کیفیت

یہ ہو کہ:

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَ لَا تَعْرَىٰ وَ أَنْتَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا

وَ لَا تَضْحَىٰ۔ (۱۶۳)

ہں میں تجھے نہ بھوکے رہنے کا غم ستائے نہ پیاس پریشان کرے۔ نہ اس میں لباس

کے لئے متفکر ہونا پڑے، نہ مکان کے لئے سرگرداں۔

اس میں کیفیت یہ ہونی چاہیے کہ وَ كَلَّا مِنْهَا مَرْعَدًا حَبِطًا شِئْتُمْ۔ (۱۶۴)۔ جہاں

کسی کو ضرورت ہو، پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے۔ ذرائع رزق ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوں۔

سَوَاءٌ لِّلرَّسَّالِينَ۔ (۱۶۵)۔

(۵) لیکن انسان کی مفاد پرستیوں نے، سامانِ زینت پر انفرادی ملکیت کا تصور پیدا کر کے اس

جنت کو جہنم میں تبدیل کر دیا۔ اس لپٹی کو تہ آن نے بیوٹا آدم سے تعبیر کیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

ہر فرد دوسرے کا دشمن ہو گیا۔ رَوَقُلْنَا اَهْبَطْنَا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوًّا۔ (پہلی)۔

(۶) اب مقصودِ فطرت یہ ہے کہ انسانی دنیا میں پھر سے وہی جنینی زندگی کا نقشہ قائم ہو جائے اور اس طرح "جنت سے نکلنا ہوا آدم پھر سے جنت کو پالے؛ خدا کا کائناتی قانون، اسی نقشہ کو قائم کرنے کے لئے سرگرم عمل ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، اس کی رفتار (ہمارے حساب و شمار کے مطابق) بہت سُست ہے۔ اس کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہے۔

اس رفتار کو تیز کرنے کے لئے آسمانی دعوتِ انقلاب کے داعی، حضراتِ انبیاءِ کرامؑ وقتاً فوقتاً آتے رہے۔ وہ اپنے حلقہ اثر میں اس نقشہ کو قائم کرتے۔ یعنی سلمانِ زیت کو تمام افرادِ انسانیہ کی ضرورتاً کو پورا کرنے کے لئے عام کر دیتے۔ (اسے نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے)۔ لیکن ان کے بعد مفاد پرست گروہ پھر آگے بڑھ آتا۔ اور اس نقشہ کو الٹ کر پھر سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کر دیتا۔ یہ کچھ ایسے لوگوں کی مدد سے ہوتا، جو مقدس لبادوں میں ملبوس ہو کر عوام سے کہتے کہ مشاہدہِ خداوندی بھی یہی ہے۔ انہیں مذہبی پیشوا کہا جاتا ہے۔

آخری مرتبہ "وہ جنینی نقشہ" خدا کے آخری نبی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں متشکل ہوا اس کے کچھ عرصہ بعد مفاد پرست گروہ ملوکیت اور مذہبی پیشوا بیت کی شکل میں پھر آگے بڑھ آیا۔ انہوں نے ماضی کا نظامِ سرمایہ داری قائم کر دیا اور خدا کا کائناتی قانون پھر سے اپنی رفتار سے آگے بڑھنے لگا۔ اب نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اس لئے اب جنتِ ارضی کی تشکیل کی دو صورتیں تھیں۔

(۱) جس امت کو اس آخری نبی کے پیغامِ رقرآن کا وارث قرار دیا گیا تھا، وہ اس نظام کو اپنے دست و پاؤں سے قائم کرتی اور باقی رکھتی۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرتی۔ تو

(ب) زمانے کے تقاضے انسان کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیتے۔ اس شکل میں دشواری یہ ہوتی ہے کہ یہ نظام بیک جست اپنی منترہ صورت میں سامنے نہیں آسکتا۔ ابتداءً بڑی دھندلی سی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور پھر تجرباتی طریق سے بتدریج اپنی منترہ شکل تک پہنچتا ہے۔

ہم (دائیں کتاب اللہ) نے اپنا فریضہ ادا نہ کیا، تو اس انقلاب نے دوسری شکل اختیار کر لی۔ عصرِ حاضر میں اس کی پہلی نمودار کس کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مارکس کے سینے میں قلبِ حساس تھا، جو مظلوم و مقہور انسانوں کی حرام نصیبی پر۔ جن پر بالابست انسانوں کی چیرہ دستیوں

نے رزق کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ خون کے آنسو روتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ان کے دکھ دور ہو جائیں۔ وحی کی حقیقی روشنی (وہ قرآنی تعلیم) اس کے سامنے نہیں کھتی۔ اس کے سامنے عیسائیت کھتی تو لفظ انسانی کے دکھوں پر آنسو بہانے کی مدعی ہونے کے باوجود، عملاً اس نقشہ کو قائم رکھنے کا موجب کھتی جس سے یہ تمام دکھ وجود میں آتے ہیں۔ جب آپ خدا پرستی کے لئے دنیا کو تیاگ دینے یا اسے قابل نفرت سمجھنے کو اولین شرط قرار دیدیں اور مظلوموں کے دکھ دور کرنے کے لئے عدل کے بجائے رحم کی بھیک مانگیں، تو مستبد قوتیں و مذہباتی پھریں گی۔ انہیں ظلم و ستم سے روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ مارکس نے اس حقیقتِ حال پر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان چہرہ دستیوں کا بنیادی سبب مذہب کا تصور ہے۔ اس لئے اس نے مذہب کو انسانی عدل کا اولین دشمن قرار دیدیا۔ اگر اس کے سامنے "مذہب" کے بجائے "دین" (قرآن کریم) ہوتا تو وہ اس نتیجہ پر کبھی نہ پہنچتا۔

روس میں بھی، اسی عیسائیت کا دور دورہ تھا۔ اس لئے لینن بھی خدا کے متعلق، اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا تصور، مفاد پرستیوں کا پیدا کردہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب خدا پر ایمان نہ رہے تو انسانی ذات و وحی حیاتِ آخرت پر ایمان خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

چین میں مذہب کے سلسلے میں حالات اس سے بھی بدتر تھے۔ وہاں، ایک چھوڑ، تین تین دستیم مذاہب مروج تھے۔ اور تینوں کے تینوں توہم پرستی کے مظاہر، کنفیوشس ازم، کی تعلیم خالصتہً اسلات پرستی تھی جس میں جمود و تقلید سب سے بڑی نیکی اور تغیر و اصلاح کا تصور سب سے بڑا گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ (بعینہ اسی طرح جس طرح ہمارے ہاں مذہبی پیشوا میت تقلید کو عین دین پیش کر تی، اور ہر تغیر اور جدت کو جہنم کے عذاب کا موجب قرار دیتی ہے) طاؤ ازم، گیان دھیان میں مست رہ کر دنیا تیاگ دینے کی تعلیم دیتا تھا۔ بدھ مت اس سے بھی چار قدم آگے تھا۔ اس میں منتہلے زندگی نردانِ حال کرنا ہے جس سے مراد اپنے آپ کو تا طبتہ فنا کر دینا ہوتا ہے۔ ماؤزے تنگ کے سامنے یہ مذاہب تھے۔ اس لئے اس کا ردِ عمل ظاہر ہے۔ اس نے فکری طور پر ہیگل، بلکہ مارکس سے بھی اختلاف کیا۔ لیکن مذہب کے خلاف اس کی شدت ان سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ اتنا بڑا انقلابی ذہن جمود و تعطل کے اس جذام کو کیسے گوارا کر لیتا؟۔ لیکن چونکہ دین اس کے سامنے بھی نہیں تھا۔ اس لئے اس نے بھی اپنے فلسفہ کی بنیاد اپنے قیاسات ہی پر رکھی۔ وہ اس کے سوا کبھی کیا سکتا تھا۔

یہ ہے وہ فلسفہ جس کا اجمالی تعارف ہم نے شروع میں کرایا تھا اور جس کی بنیادوں پر وہ اتنے عظیم معاشی نظام کی عمارت استوار کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فلسفہ کی بنیادوں پر یہ عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ جب چین میں اتالیقوں (PIONEERS) کی موجودہ نسل ختم ہو جائے گی تو پھر آئندہ نسل کے لئے، اتنی بڑی قربانیوں کے لئے کوئی جذبہ محرکہ نہیں رہے گا۔ اور چینی انقلاب بھی اسی تخریبیت (REVISIONISM) پر مجبور ہو جائے گا جس کا صفحہ وہ اس وقت روس کو دیر رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے روس اور اس کے بعد چین کی ان انقلابی جماعتوں نے کائناتی قانون کی تائید کے لئے ہاتھ اٹھا کر اس کی رفتار میں تیزی پیدا کر دی ہے۔ لیکن چونکہ ان کے انقلاب کی اساس دنیاوی محکم نہیں، اس لئے یہ انقلاب ایک ہنگامی حادثہ بن کر رہ جائے گا۔ اور اس کے بعد، اگر کائناتی قانون نے اپنے حساب سے "ایک دن" کی بھی مزید "تاریخ ڈال دی" تو انسانیت کو صدیوں تک پھر سرمایہ داری کے آہنی شکنجہ میں جکڑے رہنا پڑے گا۔ لیکن اگر اس وقت، اس معاشی انقلاب کو قرآن کی اساس محکم مل جائے تو پھر نظام سرمایہ داری سر نہیں اٹھ سکے گا۔ اور جنت سے نکلا ہوا آدم، اپنے فردوں میں گم گشتہ کو پھر سے پالے گا۔ اقبال نے نیٹے کے فکر کی بلندی اور اس کی بنیاد کی پستی کو دیکھ کر کہا تھا کہ

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں

تو اقبال اس کو سمجھتا مہتمم کبریا کیلئے؟

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس مجذوبِ فرنگی سے کہیں زیادہ ضرورت آج اس "سالکِ چینی" کو مقام کبریا سے آگاہ کرنے کی ہے۔ یہ اس لئے کہ مقام کبریا کے راستے میں جو خاردار جھاڑیاں دامگیر ہوتی ہیں چین نے انہیں راستے سے الگ کر دیا ہے۔ وہاں پادشاہی، مذہبی پیشواہیت، اور سرمایہ داری کی قوتیں ختم ہو چکی ہیں۔ اور یہی وہ خاردار جھاڑیاں ہیں جو انسان کو "خدا" تک پہنچانے نہیں دیتیں۔ یہ وہ حصہ ہے جسے طے کئے بغیر انسان اللہ تک پہنچ نہیں سکتا۔ چین ان منفی منازل کو طے کر لینے کے بعد دنیا کی منزلِ الٰہی سرحد پر کھڑا ہے۔ اگر اس وقت اسے اس مقام کی نشاندہی کر دی جائے اور وہ اس راستے کو اختیار کرے، تو صرف چین ہی نہیں، عالمگیر انسانیت اس جہنم سے بچ سکتی ہے جس میں اسے بصورتِ دیگر معلوم کتنے عرصے تک اور مبتلائے مصائب رہنا پڑے اور اس سے نکلنے کے لئے خدا جانے اسے کتنی خون کی ندیاں پیرنی۔ اور آگ کے دریا عبور کرنے پڑیں۔ مسلم ممالک میں سے اس وقت کوئی بھی اس کے لئے

آئندہ نظر نہیں آتا، کہ وہ قرآن کے انقلابی پروگرام کو اپنے ہاں عملاً مشکل کر دے۔ یہ مالک ابھی حصہ لے رہی ہے نہیں نکلے، حصہ لے تک کیسے پہنچ سکیں گے۔ پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا تھا، کہ اس سے اسلام اس ٹھپتے کو سٹا سکے گا جسے عربی ملوکیت نے اس پر مثبت کر دیا تھا۔ لیکن یہاں جس تیزی سے مذہبی پیشوائیت اپنا تسلط جاری ہے اس کے پیش نظر یہاں دین کے نمک کے اسکانات، پیچھے جا پڑے ہیں۔ یاد رکھئے! مذہبی پیشوائیت کا اقتدار نظام سرمایہ داری کے ماتھے کا پیمانہ ہوتا ہے ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کے بڑھنے سے دوسری بڑھتی ہے اور ایک کے گھٹنے سے دوسری گھٹتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں دین کے انقلابی پروگرام کے راستے میں مزاحم ہوتی ہیں خواہ وہ وحی کی راہ نمائی میں وجود کوش ہو، اور خواہ زبلے کے تعاضوں سے۔ یہ وجہ ہے، جو میں سمجھتا ہوں کہ اگر قرآن کا پیغام کسی طرح ماؤزے تنگ تک پہنچ جائے اور وہ اسے سمجھنے پر آمادہ ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ اس سے نوع انسان کی تقدیر بدل جائے اور اقبال نے حکیم سنائی کے اس مصرعہ کے اندر چھپی ہوئی جس، قیامت پیش از قیامت کا خواب دیکھا تھا، جنت سے نکلا ہوا آدم، اس خواب کی تعبیر کو اپنی آنکھوں کے سامنے مشکل دیکھ لے۔ یہ خواب، اس نظم کے ایک بند میں مرقوم ہے جسے علامہ نے حکیم سنائی کے مزار کے سر پہلے کھڑے ہو کر کہا تھا۔ یعنی

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے منجھلے

یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں رہے باقی!

وہ بندے فقر کھتا جن کا ہلاک مقصد کسری!

یہی شیخ حرم ہے جو چیرا کر بیچ کھاتا ہے

حکیم بو ذرا و دلق اولیس و چا در زہری

صنوبر حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی

یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر دے پیدا

نہ آئی کہ آشوب قیامت سے یہ کیا کم ہے

”گرفتہ چینیوں احرام و سخی خفتہ در بطن!“ (یہ مصرع حکیم سنائی کا ہے)

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تاریخ نے ہمیں ایک عجیب مقام پر لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ ایک طرف مغربی جمہوریتیں ہیں جن کا نظام سرمایہ دارا ہے لیکن وہ عیسائی یا یہودی ہونے کی جہت سے، اپنے آپ کو خدا پرست کہتی ہیں۔ لیکن قرآن کریم اس قسم کی خدا پرستی کو خدا پر ایمان قرار ہی نہیں دیتا۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ نہیں کہ آپ اپنے ذہن کے تراشیدہ ریال اپنے مذہب کے پیش کردہ (خدا کے تصور کے مطابق خدا کو مانیں۔ خدا پر ایمان کے یہ معنی ہیں کہ آپ خدا کے اس تصور پر ایمان رکھیں جو تصور اس نے خود اپنے متعلق دیا ہے۔ اور وہ تصور قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن کریم نے اہل کتاب سے بھی یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ خدا پر ایمان لائیں۔ لہذا قرآنی نقطہ نگاہ سے، نہ اہل مغرب خدا پرست ہیں اور نہ ہی ان کا نظام، قرآنی نظام کے مماثل ہے۔ بلکہ وہ اس کی ضد ہے۔ تنگی طرف سے یہ لغو کہ

”دنیا کے خدا پرستو! آؤ اور اشتراکیت کے خدا فراموش نظام کے خلاف متحدہ محاذ

بنادو“

مغض ایک سیاسی لغو ہے جو مسلم اقوام کو اپنے نام تروریہ میں پھنسانے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ دوسری طرف کمیونزم ہے جس کا نظام تو قرآنی نظام کے مماثل ہے لیکن اس کا فلسفہ حیات قرآنی فلسفہ زندگی کی نفی ہے۔ اس لئے وہ بھی، قرآنی نقطہ نگاہ سے، مسلمان کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ واضح رہے کہ جس طرح قرآن اپنے نظام کو فلسفہ حیات سے الگ نہیں کرتا، اسی طرح کمیونزم بھی اپنے معاشی نظام کو اپنے فلسفہ زندگی سے جدا نہیں کرتی۔ کمیونسٹ کے لئے ضروری ہے کہ وہ کمیونزم کے فلسفہ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام کو ایک وحدت کی طرح تسلیم کرے۔ یہ وجہ ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ نہ ایک کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے اور نہ ایک مسلمان کمیونسٹ۔

تیسری طرف ہم مسلمان ہیں جن کے ہاں قرآن کریم کے الفاظ تو بے شک محفوظ ہیں لیکن عملانہ ہمارا نظام قرآنی ہے، نہ فلسفہ زندگی قرآنی۔ ہم بھی درحقیقت اسی مقام پر ہیں جس مقام پر مغرب کے اہل کتاب ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ ان کے پاس خدا کی راہ نمائی اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں اور ہمارے پاس وہ رخلاؤں میں لپیٹی ہوئی، محفوظ رکھی ہے۔

ان حالات کے پیش نظر علامہ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ ”اگر اشتراکیت کے ساتھ خدا کو شامل کر لیا جائے

تو وہ اسلام کے محال ہو جاتی ہے۔ تو یہ فارمولہ کاروان انسانیت کے لئے منزل مقصود کی صحیح نشاندہی کرتا ہے۔ لیکن (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس کے لئے مسلم ممالک ابھی آمادہ نہیں۔ وہ اس تصور حیات سے ہنوز بہت دور ہیں۔ لیکن دین خداوندی کسی قوم کی اجارہ داری نہیں کہ وہ اسے چلانا چاہے تو وہ چل سکے اور اگر وہ اسے تفریق پارینہ بنائیں تو دنیا بے بس و ٹیہور بیٹھا اس کا منہ نکرتا ہے۔ یہ تمام نوع انسان کی مشترک ورثت ہے۔ دنیا کی ہر قوم ہی اسے اپنانا چاہے۔ دین اسی کا ہو جاتا ہے۔ وہ ہر مخاطب قوم سے کہتا ہے کہ بن کا نقشہ تمہارے سامنے آچکا ہے۔ فَاِنِ قَوْمًا عَلِمَ اَنْ لَّهُمْ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ فَهُمْ لَا يَتَذَكَّرْنَ۔ لیکن اگر تم اس سے روگردانی چاہتے ہو تو خدا تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا، جو اسے اپنالے گی۔ وَلَا تَقْرُؤُوا كِتٰبَ الْاِنْجِلِ اِلَّا الَّذِي هُوَ اَمْرٌ مُّبْتَدِئٌ۔ اور تم اس کا کچھ لگاؤ نہ سکو گے۔ دین ایک خاص فلسفہ حیات کے مطابق نظام زندگی تشکیل کرنے کا نام ہے۔ جو قوم بھی ایسا کرنا چاہتا دین لپک کر اسے سینے سے لگا لیتا۔

اشعلے جو بیڑھا کر ہاتھ میں ساغرای کلبت

لہذا یہ حالات موجود و کشادگی راہ ایک ہی نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر اشرافیہ کی ذہن پر یہ عقیدت واضح ہو جائے کہ جس فلسفہ پر وہ اپنے سماجی نظام کی عمارت استوار کرنا چاہتا ہے اس کی بنیادیں اس عمارت کے بوجھ کی تحمل نہیں ہو سکتیں۔ یہ عمارت تہرانی فلسفہ حیات کی بنیادوں پر ہی استوار ہو سکتی ہے تو امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کر لے۔ اس وقت اشرافیہ کی ذہن کا سب سے بڑا نمائندہ ماؤز سے تنگ ہے۔ چین کے ستر کروڑ نفوس اس کی فکر کی پرستش کرتے ہیں اور چین سے باہر کس قدر اذ بان اس فکر سے باہر اسطرتا اثر میں اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ پوزیشن دنیا میں اس وقت کسی اور معرکہ کو حاصل نہیں اور نہ ہی عملی اعتبار سے اس وقت کوئی دوسرا انسان ایسا نظر آتا ہے جو اسلام جیسے عالمگیر انقلاب کو اپنے ہاں عملاً نافذ کرنے کی ہمت اور صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر اس ایک ذہن کی فکر میں تہرانی تبدیلی آجائے تو عالم انسانیت میں اس سے بڑا انقلاب اور کونسا ہو سکتا ہے اس سے فی الواقع دنیا میں قیامت سے پہلے وہ قیامت برپا ہو سکتی ہے جس کا تصور آسمان نے پیش کیا تھا اور اس نے "پاسباں مل گئے تعب کو صنم خانوں سے" کی جوتاد کی حقیقت بیان کی تھی، جو عجیب کہیں کی تائید میں ایک اور شہادت دنیا کے سامنے آجاتی ہے۔

مجھے اس کا احساس ہے کہ ہمارے ہاں رہ کر ضرور قوم کی طرح، یہ ذہنیت چلی آ رہی ہے کہ دنیا میں جو نہی کسی بڑے آدمی نے غلبہ و اقتدار حاصل کیا تو اس کے متعلق یا تو ہم نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ اندھ سے مسلمان ہی ہے اور یا اس کے مسلمان ہونے کی دعائیں مانگنے لگ گئے۔ لیکن میرے اس خیال کی شرک یہ ذہنیت نہیں۔ میں اس نتیجہ پر حین دلائل و وجوہات کی بنا پر پہنچا ہوں، انہیں میں نے تفصیل سے پیش کر دیے۔ اگر ارباب فکر و نظر کو اس تجزیہ حالات میں کوئی سقم نظر آئے تو اس کی نشاندہی کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں گا۔ میری قرآنی بصیرت نے بہر حال مجھے اسی نتیجہ پر پہنچا یا ہے اور وہی مجھے اس پر بھی مجبور کر رہی ہے کہ میں اسے ارباب علم و بصیرت کے سامنے کھلے الفاظ میں پیش کر دوں، کیونکہ کتمان حقیقت قرآن کی رُو سے، انسانیت کے خلاف جرم عظیم ہے۔



آخر میں، میں اتنا اور واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ سابقہ صفحات میں ماؤزے تنگ کی فکر پر جو تنقید کی گئی ہے تو اس سے اس کی تنقیص مقصود نہیں۔ قرآن کریم عقل انسانی کا مقام بہت بلند قرار دیتا ہے۔ اور اس سے کام لینے کی بڑی تاکید کرتا ہے۔ اس لئے جو شخص بھی عقل و فکر سے کام لے کر زندگی کے مسائل سلجھانے کی کوشش کرے گا، وہ ہمارے نزدیک مستحق تحسین و ستائش ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ جس طرح (مثلاً) انسانی نگاہ کی ایک حد ہے جس سے آگے کی چیز سے نظر نہیں آسکتی، اسی طرح عقل انسانی کی بھی ایک حد ہے جس سے آگے وہ جا نہیں سکتی۔ وحی کی راہنمائی ایک دور میں ہے جس سے عقل انسانی کی آنکھ اپنی عام حد سے بہت آگے کی چیزیں دیکھ سکتی ہے۔ ماؤزے تنگ (یا دیگر مفکرین) کی حدنگاہ یقیناً عام انسانوں سے زیادہ وسیع ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اسے وحی کی راہ نمائی کی دور میں مل جائے تاکہ وہ راستے کے ان مقامات کو یقین کی آنکھ سے دیکھ سکے جسے اس وقت وہ محض قیاس کی لکڑی سے ٹھوکتا ہے۔ اس لئے غلطی کھا جاتا ہے۔ ہم اگر اس وقت اس زیادہ دور کی چیزیں دیکھ سکتے ہیں تو اس میں ہماری آنکھ کا کوئی کمال نہیں۔ یہ اس دور میں کی خوبی ہے۔ یہ دور میں اگر اس مفکر کے ہاتھ میں دیدی جائے تو وہ ہم سے بہت زیادہ آگے دیکھ سیکے گا۔ اس لئے خود بھی راستے کے خطرات سے محفوظ رہے گا۔ اور کاروان انسانیت کو بھی بحفاظت اس کی منزل تک لے جاسکے گا۔ یہ ہے میری آرزو کا مقصود، اور میری سعی و کاوش کا مطلوب۔

ایک خط اس کا اس کا جواب

ذیل کا خط بغور ملاحظہ فرمائیے۔

بندہ ایک سال سے آپ کی تصنیفات کا مطالعہ کر رہا ہے اور طلوعِ اسلام بھی برابر زیرِ نظر ہے۔ آپ نے قرآنِ حکیم کی تفہیم جس بیخ پر دینار کی ہے اپنی نوعیت میں بالکل منفرد ہے۔ تاریک خیال ملا کا آپ سے سیخ پا ہونا ایک قدرتی اور فطری امر ہے۔ آپ نے ثابت کیا ہے کہ قرآنِ حکیم نظامِ ربوبیت کا داعی ہے۔ اور حضرت علامہ اقبالؒ مرحوم کا کلام بھی آپ کے مہنوں ہے۔ چونکہ نظامِ ربوبیت اپنے خواص میں انقلابی فطرت کا ہے اور مٹا ازم فطرتاً اس کی ضد ہے۔ بقول کسے۔

ہرگز مگو کہ شیخ شود اہل انقلاب

بادر ممکن کہ ہست در عالم غراب سُرخ

پروفیز صاحب: نظامِ ربوبیت سے جو آپ کی غایت ہے وہ بالکل درست ہے لیکن ذرائع حصول میں مجھے اختلاف ہے لہذا اپنے سوال کا جواب بہ توں طلوعِ اسلام چاہتا ہوں۔ اگر جواب مذہبی عقیدتمندی کے جذبات سے فراہم کر مدلل اور تاریخی جواب و حقائق کا حامل ہو تو میرے لئے زیادہ مؤثر و مسکت ہوگا۔

تدویم اشتر کی نظام سے لے کر آج تک تدریجی ادوار میں ارتقائی قوانین قدرت جاری و ساری ہیں۔ مادی تاریخ ان ادوار کا تعین کرتی چلی آرہی ہے۔ مذہب کی دخیل کاری مادی تاریخ کے عہد میں دست انداز نہیں ہوتی ہے۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے ابتدائی ایام میں تاریخ کے مادی تقاضوں سے نمٹ کر لی اور ایک مخصوص خطہ میں ایک ایسے معاشرہ کی تشکیں کی جو سراسر اپنی فطرت کے لحاظ سے اس وقت کے مادی دور سے جو اس زمانہ کا طبعی تاریخی دور تھا الگ تھلگ تھا۔ یہ پیغمبر اسلام کی بے پناہ روحانیت کا کرشمہ تھا اور تاریخی نجوم جو ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن شارع اسلام کے رخصت ہوتے ہی چند ماہ و سال کے اندر یہ اسلامی نظام جو تاریخی لحاظ سے قبل از وقت تھا ختم ہو گیا اور "مستثنیات" واقعات کی تربیت میں جگہ پا گیا۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنے رسول پاک سے نفسِ نفیس تربیت پائی تھی۔ اور قیصرِ کسریٰ کو اس واسطے ختم کیا تھا کہ یہ غیر صالح نظام کے نمائندہ ہیں۔ چند ہی روز کے بعد اسی غیر صالح نظام کے شہنشاہ بن کر جلوہ نما ہوئے اور تاریخ کا تیز رو دھارا اسی سمت ہی بہتا رہا جس سمت سے اس کو غیر طبعی طور پر موڑنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کیونکہ تاریخ کے ارتقائی مادی تعلق ہی تاریخ سے عبارت ہیں۔

یہ امر بالکل غیر طبعی اور غیر فطری ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی بڑھاپے کی عمر میں پہنچ جائے اور شیر خوارگی۔ بچپن، عقوفان، شباب، شباب اور کھولت کے دوروں سے گزرے ہی نہ۔ ایسا ہونا ناممکنات سے ہے کیونکہ انسان کو ان تمام ارتقائی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور بعینہ یہی ارتقائی قوانین انسانی معاشرہ میں بھی موجود ہیں۔ ہمیں منزل بہ منزل ایک دور سے دوسرے دور میں داخل ہونا پڑتا ہے جیسے بروت کو پانی اور پانی کو کھاپ میں تبدیل ہونے کے لئے انقلابی عملوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور ان تینوں یعنی بروت، پانی، اور کھاپ میں اصل ہستی پانی کی ہے جس نے مختلف مدارج میں پہنچ کر اپنی اصل ہستی کو فنا نہیں کیا ہے بلکہ اپنے خواہش اور صورت نوعیہ میں تبدیلی پیدا کر لی ہے۔ بعینہ اسی طرح یہ کاروان زندگی ابتدا میں پھسل پھسل کر اور رینگ رینگ کر چلتا ہے۔ آہستہ آہستہ تاریخی عوامل کے تصفیروں کو سمیٹنے کی اپنے اندر قابلیت پیدا کرتا ہے۔ یعنی تنازع للبقا کی قوتیں برصتی جاتی ہیں۔ اور اس کے اندر روانی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی طرح یہ کارواں اور تاریخی ارتقائی مراحل طے کرتا ہے اور اب یہ ایٹیم اور برقیات کے دور میں ہے۔ پانی کی طرح زندگی کے ان مختلف قائلوں کی اصل بھی مادی تاریخ ہی ہے

جو مختلف دوروں میں اپنی صورت نوعیہ اور خواص تبدیل کرتی جا رہی ہے۔ اگر کسی سوسائٹی یا مذہب کے خیالات کار حجان ترقی پسندانہ ہوتا ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ اپنے ان اعمال و افعال کی تجدید بھی کرتا جا تا ہے جو نئے مادی تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے ہیں تو ایسا نظام ترقی پسندانہ معاشرہ کہلاتا ہے۔ مادی تاریخ کے یہ سائنٹفک اصول ہیں جن کو نہ ماننا حقیقت کا منہ چڑاتا ہے۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا ہم جدید تاریخ کے سائنٹفک مطالعہ کے بغیر مادی تقاضوں اور عوامل کا درست تجزیہ کر سکتے ہیں۔ اور صرف مذہبی پیشوا اس قابل ہیں کہ اپنے مذہبی علوم کے سہارے سے تاریخ کا پیہ پیہ ہمیشہ آگے کو لے جائیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ ان کی تاریخ رجعت پسندانہ تاریخ ہے۔ ”آئین نو سے ڈرنا۔ رسم کہن پر اڑنا۔ منزل ہی کھن ہے قوموں کی زندگی میں۔ چونکہ قوموں کا ہر فعل خواہ وہ وقتی تقاضے کی مصلحت پر مبنی ہو وہ مذہب کی اصطلاح میں ”سنت“ کہلاتا ہے جس کو ترک کرنا مذہب کی اصطلاح میں ”کفر“ تصور کیا جاتا ہے خواہ پیغمبر کے اس فعل کی افادیت صرف وقتی طور پر ہو اور بعد کے حالات میں اس فعل پر عمل کرنا ملہر ناما قابل عمل ہو۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر کو ان کی خلافت کے عہد میں یہ مشورہ دیا گیا کہ آپ خزانہ عامرہ کو ہر شام خالی نہ کر دیا کریں۔ بلکہ خزانہ کو باقاعدہ جمع کریں۔ اور کارکنان حکومت کی باقاعدہ ماہانہ تنخواہ مقرر فرمائیں تو آپ نے جواب دیا کہ میں سنت رسول کے خلاف نہیں کر سکتا ہوں۔ یہ حال یہ ایک امر واقع ہے کہ پیغمبر اسلام جن خطوط پر معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے وہ نہ ہوا اور معاشرہ مادی تاریخ کے عوامل کی کاپیر و کار رہا۔ اور مذہبی پیشواؤں نے اس وقت کے صاحب اقتدار طبقہ کی خواہشات کے مطابق جواد نکالنے کا کام سنبھال لیا جو آج بھی جاری ہے۔

مخبر پر دیز صاحب! آپ اس بستی یعنی پاکستان میں واحد شخص ہیں جو فرماتے ہیں کہ **اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى** اور نظام ربوبیت قائم ہونا چاہیے دوسری طرف مشرق تا غرب تمام مولوی صاحبان یک زبان آپ کے خلاف تکفیر کے فتوے دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو اسلام کا ما حاصل صرف چار نکاحوں تک جانتے ہیں۔ لیکن جماعت اسلامی کے امیر اسلام کا نام لے کر جاگیر داری نظام کا جواز نکالتے ہیں۔ اور اپنی کتاب ”سود حصہ دوم“ میں فرماتے ہیں۔ ”ایک مربع گز سے لے کر اگر کسی شخص کے قبضہ میں اس قدر رقبہ ہو جس کی کوئی حد ہی مقرر نہ ہو اگر جائز طریقہ سے قابض ہے تو شریعت کی رو سے درست ہے۔“ لیکن آپ فرماتے ہیں کہ زمین اللہ کی ہے اس پر کسی کی ملکیت نہیں ہے۔

وہ خدایا یہ زمین تیسری نہیں تیسری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں تیسری نہیں

آپ بھی جواز اپنے دعوے کا قرآن ہی سے نکالتے ہیں اور مودودی صاحب بھی قرآن ہی سے۔
جن کے نزدیک یہ زمین پاکستان کھوڑوؤں، دولتوں اور ٹوانوں کی ہے۔

خداوندا! یہ تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری!

کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ حصولِ پاکستان سے پیشتر کیا وعدے کئے تھے کہ پاکستان بن جانے کے بعد آپ کے لفظوں میں نظامِ رپوبیت قائم کیا جائے گا۔ اور حضرت عمرؓ کا دور لوٹ آئے گا۔ عوام نے ہولناک اور بے مثال قربانیاں دیں۔ پاکستان بن گیا۔ سولہ سال گزر گئے اور ان سولہ سالوں میں ہر صدرِ مملکت اور ان گنت وزیروں نے اور مولوی صاحبان نے یہی کہا کہ ہمارا نظام اسلامی ہونا چاہیے۔ لیکن مادی تاریخ کہتی ہے کہ نہیں۔ نظامِ صرفِ میری سنت پر چلنا چاہیے۔ آپ غور فرمائیں کہ ہماری حکومت اور علمائے دین دونوں فریق یہی کہتے ہیں کہ اسلامی نظام ہونا چاہیے لیکن یہ دونوں فریق اسلامی نظام بنانے سے عاجز ہیں۔ اگر آپ نظامِ رپوبیت پیش کرتے ہیں تو علمائے دین کے نزدیک کانسر کھرتے ہیں اور صرخانہ کعبہ سے بھی اسلامی نظام کی آواز نہیں آتی ہے۔ بلکہ عربوں کا آج ایک ہی محبوب نعرہ ہے۔ (عرب نیشنلزم زندہ باد) لیکن آج زمین میر و سلطان سے بیزار ہو رہی ہے اور ہمارے ملک کا جاگیرداری نظام عالم نزع میں ہے۔ ہمیں آگے بڑھنے کے لئے تاریخ کے مادی اصولوں ہی سے راہنمائی یعنی چاہیے اور اپنے ارد گرد کے حالات اور تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ نظامِ رپوبیت تک پہنچنے کے لئے سیدھا راستہ یہی ہے۔



طلوعِ اسلام

ہم نے اس تفصیلی خط کو تمام اس لئے شائع کیا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اشتراکی فلسفہ صحیح کیا ہے؟ اور اس فلسفہ سے متاثر ذہن کس نہج پر سوچتا ہے۔ ہم اس حقیقت کو متعدد بار واضح کر چکے

ہیں کہ ایک چیز ہے اشتراکی نظام معاشی اور دوسری چیز ہے اشتراکی فلسفہ زندگی۔ لیکن چونکہ اشتراکی نظام معیشت کی عمارت اشتراکی فلسفہ کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے اس لئے اس نظام کو سمجھنے کے لئے اس فلسفہ کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ بعینہ جس طرح اسلامی ہیج زندگی کے کسی گوشے کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سہلائی فلسفہ حیات یا نظریہ زندگی کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ جو نظام یوں ہی ہنگامی طور پر اپنا لیا جائے اس کی صورت کچھ اور ہوتی ہے لیکن جو نظام کسی خاص فلسفہ حیات کی پیداوار ہو اسے اس فلسفہ حیات سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے اس فلسفہ کا سمجھنا لاینفک ہوتا ہے۔

۲۔ مشہور جرمنی مفکر، ہیگل کا پیش کردہ نظریہ یہ تھا کہ ایک تصور (IDEA) پیدا ہوتا ہے۔ وہ بڑھتا۔ پھولتا۔ پھلتا پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ اپنی تکمیل تک پہنچ جاتا ہے تو اس میں سے ایک اور تصور کی نمود ہوتی ہے جو پہلے تصور کی ضد ہوتا ہے۔ جو کچھ پہلے تصور کے ساتھ ہوا تھا وہی کچھ اس جدید تصور کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ گردش دو لابی شروع سے آج تک جاری ہے اور اسی طرح جاری رہیگی اس عمل کا نام جدلی عمل (DIALECTICAL PROCESS) ہے۔ جب ہیگل سے پوچھا گیا کہ وہ کون سی قوت ہے جو اس عمل کو ایسے نظم اور ضبط کے ساتھ جاری رکھتی ہے، تو اس نے کہا کہ اس مخفی قوت کا نام "روح عالم" (WORLD - SPIRIT) ہے وہ اس عمل سے خود اپنی ذات کی تکمیل چاہتی ہے۔

مارکس (MARKS) ہیگل کے فلسفہ کا تبع تھا۔ لیکن اس نے ذرا آگے جا کر، ہیگل سے ایسا اختلاف کیا کہ اس کا یہ اختلافی نظریہ خود ایک فلسفہ بن گیا۔ اس نے کہا کہ جنگ اصدا کا جو تصور ہیگل نے پیش کیا ہے وہ تو درست ہے لیکن یہ جنگ تصورات (IDEAS) میں نہیں ہوتی بلکہ نظام ہائے زندگی (SOCIAL ORDERS) میں ہوتی ہے۔ ایک نظام قائم ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے عروج تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے بعض مخالفت قوتیں وجود کو ش ہوتی ہیں۔ یہ قوتیں اس نظام کو تباہ کر کے اس کی جگہ ایک جدید نظام کو مسلط کر دیتی ہیں۔ جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ او یہ جنگ اسی طرح آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس سے پہلے نظام سرمایہ داری دنیا پر مسلط تھا۔ اب اس کی جگہ اشتراکی نظام لے رہا ہے جو اس سے پہلے نظام کی ضد ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ یہ جنگ اصدا کون سی قوت کی روح سے جاری رہتی ہے تو اس نے کہا کہ اسے تاریخی وجوب

(HISTORICAL NECESSITY) کہا جاتا ہے۔ یہ قوت اس قدر محکم اور ہیبت ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انسان اس کے سامنے یکسر بے بس اور عاجز ہے۔ جب یہ ایک نظام کو مستط کرتی ہے تو انسان اس نظام کو بدل ہی نہیں سکتا۔ اسے اس نظام کو مجبوراً تسلیم اور اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اختیار کرنا کیا معنی، اس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ اور جب وہ قوت اس نظام کو فنا کرنا چاہتی ہے تو انسانوں کی کوئی تدبیر اسے بچا نہیں سکتی۔ مارکس کے نزدیک انسان کی ساری تاریخ اس کی اس بے بسی اور یکسوی کی داستان ہے۔ خدا۔ وحی۔ مستقل اقدار۔ حق و باطل کا تصور اس کے نزدیک سب افسانے ہیں۔ اور ذہن انسانی کی تخلیق۔ حقیقت صرف تاریخی وجوہ کی ہے۔ مارکس کے اس نظریہ کی عملی تعبیر کا نام، "تاریخ کی مادی تعبیر" (MATERIALISTIC INTERPRETATION OF HISTORY) ہے وہ اس تعبیر کو اس قدر حتمی اور یقینی قرار دیتا ہے کہ اس کے نزدیک دنیا کی کوئی طاقت اس کے دھارے کا رخ بدل نہیں سکتی۔

۳۔ یہ ہے مختصر الفاظ میں اشتراکی فلسفہ زندگی۔ اس کی روشنی میں آپ مندرجہ بالا خط پڑھیں گے تو بات صاف ہو جائے گی کہ اس فلسفہ سے متاثر ذہن کس نہج پر سوچتا ہے۔

اسلام کا نظریہ حیات، اس فلسفہ کے بالکل برعکس اور اس کی ضد ہے۔ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ حق (TRUTH) ایک ابدی حقیقت ہے، جو ذہن انسانی کی پیداوار نہیں۔ یہ اپنے مقام پر اٹل اور غیر متبدل ہے، اور کسی شے سے اثر پذیر نہیں ہوتا۔ جو تصورات حق کے مطابق ہوں وہ سب ہی برصداقت ہوں گے۔ انہیں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار حق پر مبنی ہونے کی وجہ سے ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ یہ وحی خداوندی کی رُو سے رُبوساطت حضرات انبیائے کرامؑ انسانوں کو ملتی ہیں تاکہ وہ ان کے مطابق اپنا نظام زندگی قائم کریں۔ جو نظام ان اقدار کے مطابق قائم ہوتا ہے اسے حق کا نظام کہا جاتا ہے اس نظام کی عملی شکل، زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ لیکن جن بنیادوں پر یہ ہتوار ہوتا ہے ان میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔

جو تصورات، مستقل اقدار کے خلاف ہوں انہیں باطل کے تصورات کہا جاتا ہے جو حق کی نقیض ہے۔ ان دونوں تصورات کی باہمی کش مکش رہتی ہے اور اس کش مکش میں حق، باطل کو شکست دیتا چلا جاتا ہے اس طرح باطل آہستہ آہستہ کمزور ہوتا جاتا ہے۔ تا آنکہ آخر الامر یہ میدان چھوڑتا

اور حق کا غلبہ مکمل ہو جائے گا۔

حق اور باطل کی کیش مکش، خدا کے کائناتی قانون کی رو سے جاری ہے لیکن چونکہ اس قانون کی رفتار، ہمارے حساب و شمار کی پیمائش کے مطابق بہت سُست ہوتی ہے۔ (خدا کا ایک ایک دن قرآن کے الفاظ میں ہزار ہزار بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے)، اس لئے اس کشمکش کے نتائج بڑے غیر محسوس اور غیر مرئی ہوتے ہیں۔ لیکن تاریخی نوشتوں پر نگاہ ڈالی جائے تو ان سے اس حقیقت کی شہادت مل سکتی ہے کہ کیش مکش جاری ہے اور اس میں حق (تعمیری لفظ حیات) باطل (تخریبی نظریہ) پر تدریج غالب آ رہا ہے۔

اسلام کی رو سے انسان بے بس اور بے کس - مجبور و مقہور مخلوق نہیں - یہ صاحب اختیار و ارادہ ہستی ہے اسے اس انتخاب (CHOICE) کی قوت دی گئی ہے کہ وہ اپنا نظام، حق کے مطابق قائم کرے یا باطل کے مطابق۔ جب انسانوں کی کوئی جماعت حق کے مطابق نظام قائم کرتی ہے تو اس کے تعمیری نتائج مرتب ہونے کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے۔ اتنی تیز کہ کائناتی قانون کی رفتار سے جو نتائج صدیوں میں جا کر محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں، وہ اس رفتار کی رو سے دنوں میں سامنے آ جاتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں یہ ادوار رخاواہ ان کی مدت کتنی ہی مختصر کمیوں نہ ہوں نشان منزل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ حق و باطل کی کیش مکش "تاریخی وجوب" کی اندھی قوت کی رو سے جاری نہیں۔ یہ خدائے علیم و حکیم کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق جاری ہے جس کی رو سے کائنات بالحق اور بامقصد پیدا کی گئی ہے اور وہ ایک خاص منزل کی طرف رواں دواں جاری ہے۔ جب انسان حق کے مطابق نظام قائم کرنے کی کوشش چھوڑ دیتے ہیں تو وہ (حق) پھر کائناتی رفتار سے آگے بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ مستقل اقدار کی صحیح تعلیم و تربیت سے انسانوں کو ہر زمانے میں اس قابل بنایا جاسکتا ہے کہ وہ حق کا نظام قائم کر سکیں۔ تاریخ کے جن درخشاں ادوار کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، وہ ادوار تھے جن میں انسانی جماعتوں کو اس قابل بنایا گیا تھا۔ آخری مرتبہ یہ دوز محمد رسول اللہ والذین معہ کے زمانے میں آیا۔ جب تک اس صحیح تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رہا جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے وہ نظام قائم رہا۔ جب لوگوں نے اس سلسلہ کو منقطع کر دیا، تو وہ نظام بھی باقی نہ رہا۔ وہ مستقل اقدار جن کے مطابق یہ نظام قائم ہوا تھا، اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ ان میں یہ

صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہر زمانے میں عملی نظام کی شکل میں متشکل کی جاسکیں۔ جب اور جہاں بھی ان کی صحیح تعلیم کا سلسلہ جاری ہو گیا وہ نظام متشکل ہو جائے گا۔

۴۔ اس چودہ سو سال کے عرصے میں جبکہ حق کا وہ نظام جسے انسانی ہاتھوں نے قائم کیا تھا، باقی نہ رہا۔ حق پر مبنی تصورات، کائناتی رفتار سے باقاعدہ آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں اور انسانی معاشرہ پر غیر شعوری طور پر مسلط ہوتے جا رہے ہیں۔ ملکیت کا مفہوم جانا اور اس کی جگہ شورایت کے تصور کا عام ہو جانا۔ غلامی کا خاتمہ۔ ذات پات کی تیز کا دور ہو جانا۔ قومیت کی جگہ عالمگیر انسانی برادری اور وحدت نظام انسانی کے تصور کا اجاگر ہوتے چلے جانا۔ انسانوں کے بنیادی حقوق کے احساس کا بیدار ہوتے جانا۔ زمینداری۔ سرمایہ داری کے نظام کا مبنی بن جانا اور عالمگیر نظام ربوہیت کا مقبول ہوتے چلے جانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب قرآن و شواہد اس حقیقت کی دلیل ہیں کہ حق کے مطابق نظریات زندگی، کائناتی قانون خداوندی کے مطابق آہستہ آہستہ ممکن ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اب دنیا کی کوئی قوت ان باطل تصورات کو واپس نہیں لاسکتی۔ جنہیں حق کے تصورات نے شکست دے کر میدان سے بھگا دیا ہے۔ اس وقت اگر انسانوں کی تعلیم و تربیت قرآنی تصورات کے مطابق کر دی جائے تو صحیح نظام عدل و صداقت کے قائم ہونے میں جسے ہم خدا کے نظام ربوہیت کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں اچھویر نہیں لگے گی۔ اس کے لئے کائناتی قانون نے فضا کو بڑا سا سازگار بنایا ہے۔

۵۔ تصویحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ اسلام کا نظریہ حیات اور اشتراکیت کا فلسفہ زندگی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہی وجہ ہے جو ہم اکثر و بیشتر کہتے رہتے ہیں کہ نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے اور نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے۔ عام لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ جب اشتراکیت کے معاشی نظام کی بعض جزئیات اور قرآن کے معاشی نظام میں مماثلت دیکھتے ہیں تو جھٹ سے کہہ دیتے ہیں کہ اسلام اور اشتراکیت ایک ہی چیز ہے۔ اور یہ غلطی صرف اشتراکی نظام کے بارے میں ہی نہیں کی جاتی۔ ہر نظام کے بارے میں کی جاتی ہے۔ مثلاً جب لوگوں نے دیکھا کہ مغربی جمہوریت بھی لوگوں کے خلاف ہے اور اسلام بھی ملکیت کی جگہ نظام شورایت کا حامی ہے تو انہوں نے فوراً اعلان شروع کر دیا کہ اسلام اور جمہوریت ایک ہی شے ہے۔ حالانکہ مغرب کی جمہوریت جس مادی نظریہ حیات کی پیداوار ہے وہ اسلامی نظریہ زندگی کے یکسر خلاف اور اس کی نقیض ہے۔ اسی قبیل کا یہ نعرہ ہے جسے آجکل مغربی

سیاست خاص طور پر بلند کر رہی ہے، کہ چونکہ عیسائی دنیا بھی خدا کو مانتی ہے اور مسلمان بھی خدا پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے یہ دونوں ایک ہیں۔ حالانکہ عیسائی دنیا جس چیز کو خدا پر ایمان قرار دیتی ہے قرآن اسے کفر اور شرک سے تعبیر کرتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ جب تک یہ لوگ خدا کو ان تصورات کے مطابق نہ مانیں، جنہیں قرآن کریم پیش کرتا ہے، وہ کبھی خدا کے ماننے والے نہیں کہلا سکتے۔ بہر حال یہ جملہ معترضہ تھا۔ ہم کہہ رہے تھے کہ اسلام کا نظریہ زندگی اور اشتراکی فلسفہ حیات ایک دوسرے کی جڑیں ہیں۔

۶۔ گذشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے، محترم مستفسر کے استفسارات کا اصولی جواب اسی میں آگیا ہے۔ لیکن ان کی بعض جزئی باتوں کے متعلق مختصر اذیل میں عرض کیا جا رہا ہے۔

۱۔ انہوں نے کہا ہے کہ اسلام نے اپنے ابتدائی ایام میں تاریخ کے مادی تقاضوں سے ٹکری۔ اور ایک مخصوص خطہ میں ایسا نظام قائم کر دکھایا جو اس زمانے کے طبعی تاریخی دور سے الگ تھا اس متعلق وہ کہتے ہیں کہ پچھلے اسلام کی بے پناہ روحانیت کا کرشمہ تھا اور ایک معجزہ۔

محترم مستفسر یا تو پورے طور پر اشتراکی فلسفہ کے قائل نہیں۔ یا روحانیت بفرامیڈا انہیں پورے طور پر اس کا علم نہیں۔ اشتراکی فلسفہ کی رُو سے نہ "روحانیت" کوئی شے ہے اور نہ ہی اس پر مبنی معجزہ کا کوئی وجود۔ جب تاریخ کی تعبیر یکسر مادی ہے تو اس میں روحانیت کا ذکر ہی کیا۔ مارکس اس قسم کے تصورات کو انسانی ادہام کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ پھر یہ چیز بھی قابل غور ہے کہ جب تاریخی وجوہ کی نوبت ایسی بے پناہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے دھارے کو نہیں روک سکتی، تو دنیا کے کسی ایک خطہ ہی میں سہی اور تھوڑے سے وقت کے لئے ہی سہی۔ جب اس دھارے کا رخ موڑ دیا گیا اور اس کے علی الرغم ایک اور نظام قائم کر کے دکھا دیا گیا تو وہ بنیادی منہدم ہو گئی جس پر اشتراکی فلسفہ کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذرا فام روشن سے بہت کر سوجا جائے تو یہ بات ابھر کر سامنے آجاتی کہ جسے "تاریخی وجوہ" کہا جاتا ہے، اس کی اصل ہی کچھ نہیں۔ وہ تو قرآن کے الفاظ میں "ان ناموں میں سے ایک نام ہے، جنہیں تم نے یا تمہارے آباء و اجداد نے وضع کر لیا تھا۔" محض ایک نام۔ تاریخ انسانوں کے اختیار و ارادہ اور اعمال و کردار کی داستان کا نام ہے۔ اسے ایک ایسی مہیب قوت سمجھ لینا جس کے سامنے انسان بے دست و پا، اور محکوم و مقہور بن کر رہ جائے، پھر کوئی پوچھنا لینے والی

بات ہے۔ مارکس نے خدا سے انکار کیا۔ اور اس کا مذہب اُسے جس خدا کا پرستار بنانا چاہتا تھا وہ خدا تھا ہی اس قابل کہ اس سے انکار کر دیا جاتا۔ اس خدا سے اس نے انکار کیا اور حقیقی خدا کا تصور اس کے سامنے کسی نے پیش نہ کیا۔ نتیجہ یہ کہ اس کے ذہن میں غلا پیدا ہو گیا۔ لیکن چونکہ فلاکات قائم رہنا ناممکنات سے بہت اس لئے اسے اس خسلا کو پورا کرنے کے لئے ایک "خدا" وضع کرنا پڑا۔ یہ خدا ہے "تاریخی وجوب" جو محض ایک موہوم نام ہے۔ اس کی اصل و حقیقت کچھ بھی نہیں۔ کوئی کمیونسٹ آج تک یہ نہیں سمجھا سکا کہ "تاریخی وجوب" ہے کیا؟ نہ ہی خود مارکس کے ہاں اس کی تشریح ملتی ہے۔

باقی رہا یہ کہ جو نظام رسول اللہ نے قائم فرمایا تھا وہ محض عرصے کے بعد جاری کیوں نہ رہا، سو اس کے متعلق گذشتہ صفحات میں مختصراً بتایا جا چکا ہے۔ (تفصیلاً دیکھنا جو تو سلیم کے نام خطوط کی تیسری جلد میں وہ خط دیکھتے جس کا عنوان ہے "اسلام آگے کیوں نہ چلا")

اس مقام پر اتنا اور بتا دینا ضروری ہے کہ جو نظام نبی اکرم نے قائم فرمایا تھا وہ معجزہ تھا۔ نہ "روحانی" کا اثر تھا۔ وہ اس پر وگرام کا فطری نتیجہ تھا جسے قرآن کریم نے اس نظام کے قیام کے لئے تجویز کیا ہے یعنی صحیح تعلیم و تربیت سے مستقل انداز کی اہمیت کو اس قدر دلوں میں جاگزیں کر دینا کہ وہ انسانی زندگی کا نصب العین بن جائیں اور اس طرح انسان ان کے تحفظ کی خاطر ہر قسم کی مادی قربانی کے لئے بطریق خاطر تیار ہو جائے۔ اس پر وگرام پر جب بھی عمل کیا جائے گا اس کا نتیجہ وہی برآمد ہوگا جو نبی اکرم کے زمانے میں پیدا ہوا تھا۔ یہ سبھی واضح رہے کہ قرآن کریم نے اس نظام کے اصول دیئے ہیں جو غیر متبدل ہیں۔ اس کی جزئیات خود متعین نہیں ہیں۔ انہیں ہر زمانے کے انسانوں پر پھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ انہیں اپنے حالات کے مطابق خود متعین کریں۔ اس لئے محترم مفسر کا یہ سمجھنا کہ کسی ایک زمانے کی متعین کردہ جزئیات بھی ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی۔ قرآنی تصور نظام سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں (خلفائے راشدین) کے زمانے میں کئی ایک جزئیات میں جو پہلے متعین ہوئی تھیں، تبدیلی کی گئی۔ ان میں سے جو علیٰ حالہ رہنے دی گئیں تو اس لئے کہ ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

(ان محترم مفسر نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ بچے پیدا ہوتے ہی بڑھاپے کی عمر میں پہنچ جائے۔

تدریجی ارتقا فطرت کے اصولوں میں سے ہے۔

بہت سست ہے لیکن اس اصول کا اطلاق اپنی امور پر ہو سکتا ہے۔ جو انسانی ذہن کے پیدا کردہ ہوں۔ آج سوچہ ہزار سال پہلے کا انسانی ذہن وہ باتیں نہیں سوچ سکتا تھا جو آج کا ذہن سوچ سکتا ہے۔ لیکن وحی خداوندی انسانی ذہن کی تخلیق نہیں ہوتی۔ اس کا سرچشمہ علم خداوندی ہے۔ جو اصول کے اثرات سے بلند ہے۔ وحی انسان کو ابدی حقایق دیتی ہے جو مستقبل بالذات اور غیر متبدل ہیں۔ وحی نے سب سے پہلے نبی سے بھی یہی کہا تھا کہ لوگوں سے کہہ دو کہ ذرائع رزق انسانی نشوونما کے لئے ہیں۔ انہیں افزاؤ و مخصوص کردہ ہوں کی مفاد پرستیوں کے لئے محدود نہیں کیا جاسکتا۔ ذہن انسانی اور وحی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ذہن انسانی کا طریق، تجرباتی ہے۔ اس لئے وہ تدریجاً حقیقت تک پہنچتا ہے۔ لیکن وحی خداوندی پہلے ہی دن حقیقت کو سامنے لے آتی ہے۔ البتہ اس حقیقت کو عملی نظام میں تشکل کرنے کے لئے ہر دور کے تقاضوں کو سامنے رکھا جائے گا اور یہ سب کچھ انسانی جدوجہد کی رو سے ہوگا۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے وحی کی رو سے اس نظام کے اصول ملتے ہیں، جزئیات نہیں ملتیں۔ تدریجی ارتقاء کا عمل انسانی زندگی کی جزئیات میں ہوتا ہے۔ اصولوں میں نہیں، یہ ٹھیک ہے کہ سچے کی مختلف قوتوں کی نشوونما تدریجاً ہوتی ہے لیکن جن اصولوں پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے، وہ بچپن، جوانی، اور بڑھاپے میں یکساں رہتے ہیں۔ مثلاً زندگی کا دارومدار سانس پر ہے تو یہ چیز زندگی کے پہلے دن سے آخری دن تک یکساں طور پر کار فرما رہتی ہے۔ اسی طرح زندگی اور صحت سے متعلق دوسرے اصولوں کی کیفیت ہے یہ اصول تدریجاً مرتب نہیں ہوتے جس نے زندگی دی ہے، وہی انسان اصولوں کو مستقل طور پر مستحکم کر دیا ہے۔ جو ان اصولوں میں تغیر و تبدل کرتا ہے وہ نقصان اٹھاتا ہے۔

پھر طرح زندگی کے خالق نے طبعی زندگی کے اصول دیئے ہیں، اسی طرح اس نے انسان کی تمدنی زندگی کے لئے بھی اصول دیئے ہیں۔ یہ اصول بھی اسی طرح غیر متبدل ہیں جن طرح طبعی زندگی سے متعلق اصول۔ تدریجی ارتقاء کا سوال نہ ان میں ہے نہ ان میں۔ پھر جس طرح طبعی زندگی سے متعلق اصول انسانی ذہن کی پیداوار نہیں اسی طرح اس کی تمدنی زندگی سے متعلق اصول بھی ان کے ذہن کی پیداوار نہیں ہو سکتے۔ کائنات کی کسی چیز نے بھی اپنے لئے اصول آپ وضع نہیں کئے۔ سب وحی کی رو سے ملے ہیں۔

(۱۱۱) محترم مستفسر نے اشتراک فی فلسفہ کی ایک بنیادی گمراہی کو نظر انداز کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب (مثلاً) تاریخی وجوہ کی رو سے اب وقت آ گیا ہے کہ سابقہ نظام سرمایہ داری کی جگہ اشتراکی نظام

وینا پر مسلط ہو جائے تو اس کے لئے نہ کسی عہد و عہد کی ضرورت ہے نہ کدو کاوش کی حاجت۔ "تاریخی و تجربی" کی بے پناہ قیمت اس جدید نظام کو خود بخود مسلط کر دے گی۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کے دھارے کے سامنے روک بن کر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ یہ اسے شخص و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گی۔

جب صورت حال یہ ہے تو پھر اشتراکی ممالک، اشتراکیت کو پھیلائے اور مسلط کرانے کے لئے اس قدر نعل برآتش کیوں بستے ہیں۔۔۔ یہ اس قدر پراپیگنڈے کا طوفان، مختلف ممالک میں وراثت پسند جماعتیں، سرمایہ دارانہ نظام کی حامل سلطنتوں کے خلاف سرِ داہر گرم جنگ کا سلسلہ اس قدر سپاہ۔ اتنا عظیم سامان جنگ۔ ایٹمی بم وغیرہ وغیرہ کس مقصد کے لئے ہیں۔ کیا "تاریخی و تجربی" اس قدر کمزور ہو چکی ہے کہ اسے ان سہاروں کی ضرورت پڑ رہی ہے۔ اور ضرورت پڑ رہی ہے ان انسانوں کے مقابلہ کے لئے جو اشتراکی فلسفہ کے مطابق نہایت بے بس اور مجبور ہیں۔

اس فلسفہ کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ (مثلاً) سبکل جدلی جنگ کی رو سے اشتراکی نظام کے مسلط ہونے کی یاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد جیت ہی جنگ کے مطابق اشتراکی نظام کی ضد دوسرے نظام یعنی نظام سرمایہ داری کے مسلط ہونے کی باری آئے گی تو اس وقت اس فلسفہ کے متفقین کا طرز عمل کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اُس وقت انہیں نظام سرمایہ داری کا حامی ہونا پڑے گا۔ اور اشتراکی نظام کے خلاف وہی کچھ کرنا ہوگا جو کچھ وہ اس وقت نظام سرمایہ داری کے خلاف کر رہے ہیں۔ اس وقت وہ تلم لہر پھیر جس میں نظام سرمایہ داری کو نوع انسان کے لئے لعنت قرار دیا گیا ہے، مذہبِ آتش کر دینا پڑے گا۔ اور وہ تمام دلائل جو اس وقت نظام اشتراکی کے حق میں دی جاتی ہیں، خود ان کی تردید کرنی پڑے گی۔ اُس وقت سب سے بڑا سرمایہ دار سب سے زیادہ سختی سے تکیہ دہنیت قرار دیا جائے گا۔

پھر اسی نکتہ کو فدا پیچھے کی طرف لیتے۔ موجودہ دور سے پہلے نظام سرمایہ داری، "تاریخی و تجربی" کے نکتے کے عین مطابق تھا۔ سوال یہ ہے کہ آپ اُس دور کے سرمایہ پرستوں کو موجب لعنت و ملامت کیوں قرار دیتے ہیں؟ ان کی شان میں قصائد کیوں نہیں لکھتے۔ آپ اُس "مذہب" کو "افیون" کیوں قرار دیتے ہیں جو اُس وقت اُس نظام کی تائید کرتا تھا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کا طرز عمل کس طرح "تاریخی و تجربی" کے خلاف ہے؟ اگر آپ اس

تلفظ کو فی الواقعہ سچا سمجھتے ہیں تو آپ کو سابقہ دور کے سرمایہ پرستوں کی مدح میں قصیدے پڑھنے چاہئیں کہ انہوں نے تاریخی وجوب کا ساتھ دیا تھا۔ نیز اس زمانے کے مذہب کو سچا مذہب قرار دینا چاہیے جس نے تاریخی وجوب کی تائید کی تھی۔ اسی طرح آپ کو اس دور کے بعد بھی اسی مذہب کو حتی و صداقت کا مذہب سمجھنا چاہیے جو نظام سرمایہ داری کی تائید کرے۔ کیونکہ اس وقت تاریخی وجوب کا یہی تقاضا ہوگا۔

آپ مذہب پرست طبقہ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ عقل و فکری سے کام نہیں لیتے۔ آنکھیں بند کئے اپنے معتقدات پر جے رہتے ہیں اور جو شخص ان کے خلاف کچھ کہے اس کے پیچھے پڑ جلتے ہیں۔ اس کا نام آپ کے نزدیک مذہبی جنون (FANATICISM) ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ نظام اشتراکیت بہترین نظام ہے تو کیا آپ اس نتیجہ پر عقل و فکر کی رو سے پہنچے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ آپ اس دور میں پیدا ہوئے جب تاریخی وجوب کی رو سے اشتراکی نظام کی باری آئی۔ آپ نے اس نظام کی تائید شروع کر دی۔ اگر آپ چند صدیا پہلے پیدا ہوتے تو تاریخی وجوب کے معتقد کی حیثیت سے آپ نظام سرمایہ داری کو عین حق و صداقت کے مطابق نظام قرار دیتے۔ سوچئے کہ یہ مذہبی جنون نہیں تو اور کیا ہے؟ اور جنون بھی اس شدت کا کہ جو شخص آپ کے اس عقیدے سے متفق نہیں آپ اسے زندہ رہنے کا حق تک دینے کے لئے تیار نہیں۔

اس کے مقابلہ میں دینِ خداوندی کو دیکھئے کہ اس نے پہلے دن سے ایک نظامِ ربوبیت کو حق و صداقت کا نظام قرار دیا اور آج تک اسی کو حق و صداقت کا نظام قرار دیتے چلا جاتا ہے۔ اور ہمیشہ تک اسے ہی حق و صداقت پر سنی نظام قرار دے گا۔ آپ سوچئے کہ جو لوگ اس نظام کے مؤید ہیں ان کا موقف علم و بصیرت اور دلائل و براہین پر سنی سمجھا جائے گا یا تاریخی وجوب کے معتقدین کا جنہیں ہر دور میں اپنے سابقہ موقف کے خلاف کہنا اور کرنا پڑے گا۔ یہ فرق ہے وحیِ خداوندی اور انسانی ذہن کے وضع کردہ نظریاتِ حیات میں!

(iv) محترم مستفسر یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی قرآن سے پروردگار صاحبِ نظامِ ربوبیت ثابت کرتے ہیں اور اسی سے مودودی صاحبِ نظامِ سرمایہ داری کی تائید لاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ہیں کہ

خداوند ایسے سادہ دل بندے کدھر جائیں!

محترم مستفسر جس خدا سے پوچھتے ہیں کہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں، اسی خدا نے

ان سادہ دل بندوں کو پہلے ہی بتا رکھا ہے کہ وہ کدھر جائیں۔ اس نے کہا ہے کہ تم نہ یہ دیکھو کہ پرویز کیا کہتا ہے اور نہ یہ کہ مودودی کیا کہتا ہے؟ میری کتاب "گہت ودیا" نہیں کہ کسی کی سمجھ میں ہی نہ آئے۔ تم اس کتاب کو اپنی عقل و فکد کی رو سے دیکھو اور سمجھو، بات صاف ہو جائے گی۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ مسلمانوں کے ممالک میں اس وقت کیا ہو رہا ہے۔ اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری قرآن کی تعلیم پر ہے یا ان انوں کے خود ساختہ مذہب پر جسے بد قسمتی سے اسلام کا نام دے دیا گیا ہے۔

(۷) محترم مستفسر نے کہا ہے کہ ہمیں آگے بڑھنے کے لئے تاریخ کے مادی اصولوں ہی سے راہ نمائی یعنی چاہیے اور اپنے ارد گرد کے حالات سے اور تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے نظام ربوبیت تک پہنچنے کے لئے سیدھا راستہ ہی ہے۔

ہم سمجھ نہیں سکے کہ اس سے ان کا مطلب کیا ہے؟ یہ بات اگر وہ اس مذہب پرست طبقہ سے کہتے جو نظام سرمایہ داری کو مقدس سمجھتا ہے تو قابل فہم ہوتی۔ لیکن نظام ربوبیت کے داعیان سے یہ کہنا کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے مراد وہ چیز ہے جسے وہ اپنے خطے کے شروع میں بیان کر چکے ہیں یعنی یہ کہ نظام ربوبیت سے جو آپ کی غایت ہے وہ بالکل درست ہے لیکن ذرائع حصول میں مجھے اختلاف ہے: انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے نزدیک اس مقصد کے حصول کے ذرائع کیا ہیں۔ نہ ہی ہمیں ایسا فرض کر لینے کا حق حاصل ہے کہ یہ صاحب واقعی اشتراکی ہیں، اس لئے ان کے پیش نظر وہی ذرائع ہیں جنہیں اشتراکی لیڈر اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ممکن ہے ان کے پیش نظر کوئی اور ذریعہ ہو۔ لیکن جہاں تک اشتراکی نظام کا تعلق ہے، اس کے نزدیک اپنے مقصد کے حصول کے جو ذرائع ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن اس باب میں کہتا ہے کہ

ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں ہمارے خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ جماعت کے مفاد کی جنگ کے ماتحت ہونا چاہیے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظام معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں ضروری سمجھا جائے عین اخلاق ہے۔ چنانچہ جماعتی مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب، دروغ بانی، فریب دہی، عین حق و صداقت اور

اب رہا ظرقی کنار۔ سو اس کے متعلق لیٹن لکھتا ہے۔

سرمایہ داری نظام حکومت کی جگہ اشتراکی حکومت کا بسرا اقتدار آجانا تشدد آمیز انقلاب کے بغیر ناممکن ہے۔

ظاہر ہے کہ سلام کی رُو سے ان ذرائع کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اخلاقی حدود وہ مستقل اقدار میں جنہیں کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ سلام، ذریعہ اور مقصد میں فرق ہی نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک غلط راستہ کبھی صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام ربوبیت بھی اس کے نزدیک مقصود بالذات نہیں، بلکہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ مقصد ہے انسانی ذات کی نشوونما۔ اور انسانی ذات کی نشوونما کی صورت یہ ہے کہ جہاں کوئی مستقل قدر ہاتھ سے چھوٹی نشوونما رک گئی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ "زندگی کی بعض ضروریات کے لئے جھوٹ بولنا شرعاً جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے" تو یہ خالص میکیاؤلی سیاست ہے جسے شریعت خداوندی سے کوئی واسطہ نہیں۔

باقی رہا تشدد کے ذریعہ انقلاب لانا تو قرآن کی رُو سے، اس طرح فساد تو برپا کیا جاسکتا ہے۔ انقلاب نہیں لایا جاسکتا۔ اس کے نزدیک خارج میں انقلاب آ نہیں سکتا۔ جب تک انسان کے قلب میں انقلاب پیدا نہ ہو، اور قلب میں انقلاب صحیح تعلیم و تربیت کے ذریعہ پیدا ہو سکتا ہے۔ نبی اکرمؐ جو انقلاب لائے تھے تو اس کا ذریعہ "تعلیم کتاب و حکمت" ہی تھا۔ اس سے حضورؐ نے اپنی جماعت کے قلب و نگاہ میں ایسا انقلاب پیدا کر دیا جس سے ان کی نظروں میں زندگی کی اقدار بدل گئیں۔ تشدد کے ذریعے جس قسم کا انقلاب آتا ہے اس کا مزا خود روس نے چکھ لیا ہے۔ اسٹالن کا دور، تشدد کا سخت ترین دور تھا، اب روس میں اس دور کے ہیرو اسٹالن کی لاش تک کو اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہے اور اس دور کے تشدد کی ہولناک داستانوں کو بار بار دہرا کر لوگوں کے دل میں اس کے خلاف نفرت و انتقام کے جذبات بھڑکانے جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مادی نظریہ حیات کی رُو سے، انقلاب کے لئے تشدد کے علاوہ اور کوئی ذریعہ کارگر ہو نہیں سکتا۔ لیکن قرآنی نظریہ زندگی کی رُو سے احترام انسانیت، انسانی ذات پر ایمان

کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہ، ظلم و استبداد کی قوتوں کی دراز دستیتوں کو روکنے کے لئے قوتوں کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ نظریہ زندگی کی تبدیلی کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ قوت کے استعمال سے نظریہ میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔ یہ تبدیلی یقیناً (CONVICTION) سے آتی ہے اور (CONVICTION) کی بنیاد دلائل و براہین کی رو سے دل و دماغ کے اطمینان پر ہے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں۔ یہ ایمان وہ جذبہ محرکہ (INCENTIVE) عطا کرتا ہے جو انسان کو اس پر آمادہ کر دیتا ہے کہ وہ خونِ پسینہ ایک کر کے زیادہ سے زیادہ کلمے اور اس میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لئے کر باقی سب، بطیب خاطر، دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے اور وہی تاریخ، انسان کے اندر اس قسم کا جذبہ پیدا کر ہی نہیں سکتی۔ اور یہی وہ چٹان ہے جس پر اشتراکیت کی کشتی اس بُری طرح سے ٹوٹی ہے کہ نہیں اس کی شکست و ریخت کو دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کے لئے وہاں آہنی پردے لٹکانے پڑ گئے ہیں، اس کے برعکس، جب اسلامی نظام قائم ہوتا ہے تو وہ دنیا بھر کے انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کے مرکز (کعبہ) میں آئیں۔ (لَبِشْرُ قَدْ دَا مَنَافِعَ لِهَم) اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ وہ ان کی نفع بخشوں کے لئے کیا کچھ کرتا ہے۔

یہ ہے فرق اسلام کے طریق کار اور اشتراکیت کے طریق کار میں۔

(vi) محترم مستفسر نے لکھا ہے کہ اس وقت دنیا کے تمام مسلم ممالک، اسلامی نظام کی مخالفت سمیت کو جا رہے ہیں۔ اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامی نظام صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس نتیجے کے اخذ کرنے کے لئے یہ دلیل جس قدر کمزور ہے وہ ظاہر ہے۔ محترم مستفسر اس سے متفق ہوں گے کہ اس وقت دنیا کی اکثریت، اشتراکی نظام کی مخالفت ہے۔ کیا وہ اسے ماننے کے لئے تیار ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اشتراکی نظام صحیح نہیں کسی نظام کے صحیح یا غلط ہونے کی یہ دلیل نہیں کہ کتنے لوگ اس کے موافق ہیں اور کتنے مخالف۔ اس بات کے پرکھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس نظام پر علم و بصیرت کی رُو سے غور کیا جائے اور دلائل و براہین کی رُو سے کسی نتیجے پر پہنچا جائے۔ قرآن اپنے ہر دعوے کو عقلی و جب البصیرت پیش کرتا ہے اور دلائل کی رُو سے سناواتا ہے۔ وہ اپنے مخالفین سے بھی یہی کہتا ہے کہ تم اپنے دعوے کی تائید میں دلائل پیش کرو۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کریم کا پیش کردہ نظام ربوبیت، نوع انسان کی منفعت کا ضامن ہے اور اس کے سوا دنیا کا کوئی نظام یہ نتیجہ نہیں دے

کر سکتا۔ ہم اپنے اس دعوے کو علم و بصیرت کی رو سے پیش کرتے ہیں اور اگر کوئی اس سے انکار کرتا ہے تو اس کے بلحاظ مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے دعوے کو علم و بصیرت کی رو سے پیش کرے۔

آخر میں ہم محترم مستفسر کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ اسے حسن اتفاق سمجھے کہ اس وقت آپ کے خیال کے مطابق تاریخی و جوب کا تقاضا بھی وہی ہے جس کی طرف قرآن دعوت دیتا ہے۔ سوال اس فلسفہ زندگی کے اختلاف کا ہے جس پر یہ دونوں نظام متفرع ہیں۔ اگر آپ اس نظام کو قرآنی فلسفہ زندگی کی رو سے اختیار کریں گے تو اس سے کم از کم اتنا فائدہ تو ضرور ہو گا کہ کل کو جب تاریخی و جوب کی اہل گردش کے مطابق، پھر سے نظام سرمایہ داری کی باری آگئی تو اس وقت آپ کو یہ خفت نہ ہوگی کہ اس نے جس اشتراکی نظام کو آپ کل تک نوع انسان کی فلاح و بہبود کا ضامن قرار دیتے تھے۔ اسے نوع انسان کی تباہی و پر بادہی کا موجب ٹھہرانا پڑے۔ قرآن یہ کبھی نہیں کرے گا کہ جس بات کو وہ آج نوع انسان کی مفدت کا موجب بتا رہے اسے کل کو انسانیت کی تباہی کا باعث قرار دیدے۔ اس کے اصول ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ وہ تاریخی و جوب کی گردش و ولابی سے ہر زمانے میں بدلتے نہیں رہتے۔ اس نکتہ کو ذرا اشتراکی نظام کی تاریخ کی روشنی میں دیکھئے۔ مارکس نے اپنے تصور کو ایک عالمگیر نظام کی حیثیت سے پیش کیا اور لینن کے زمانے تک اسے ایسا ہی سمجھا جاتا رہا۔ لیکن اسٹالن نے اس کی عالمگیر حیثیت کو ختم کر کے قومی حیثیت دیدی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ نظام روس کا قومی نظام بن کر رہ گیا۔ اب اس نظام کی جنگ دوسرے نظاموں سے نہیں رہی۔ اب روس کی جنگ دیگر ممالک سے ہونی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس کو اپنی سرمایہ دارانہ نظام کے حامل ممالک سے دوستی کے معاہدات کرنے پڑ رہے ہیں جس نظام کے خلاف اشتراکی نظام صدائے احتجاج بن کر اٹھاتا تھا اور اس کے خلاف ان ممالک سے تعلقات منقطع کرنے پڑ رہے ہیں جو خود اشتراکی نظام کے داعی ہیں۔ یہ نتیجہ ہے مستقل اقتدار پر ایمان نہ ہونے کا۔ اس کے برعکس قرآن کریم زندگی کا جو نظام پیش کرتا ہے اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ (۱) ہر انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے واجب التکریم ہے۔ (۲) نظام وہی حق و صداقت پر مبنی سمجھا جاسکتا ہے جس کے پیش نظر کسی خاص ملک، خاص قوم، خاص گروہ اور خاص پارٹی کا مفاد نہ ہو، بلکہ پوری کی پوری انسانیت کا مفاد ہو۔ (۳) دنیا میں "اپنوں" اور "بیگانوں" کی تیز اور تفریق

کا معیار یہ ہے کہ جو لوگ قرآنی نظام کی صداقت پر ایمان رکھیں وہ اپنے ہیں جو اس کے مخالف ہوں وہ بیچلنے۔
 — خواہ وہ روس کے اشتراکی ہوں یا امریکہ کے جمہوریت نواز۔ (۴) اس نظام کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ زندگی
 ہی دنیا کی زندگی نہیں۔ موت کے بعد بھی آگے چلتی ہے اور انسان کا ہر مادہ اور عمل اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتا
 ہے۔ — خواہ وہ اس زندگی میں سامنے آئے، یا اس کے بعد۔ اسی تصور کو بالفاظ دیگر یوں بیان کیا جاتا ہے
 کہ انسان اپنے ہر عمل بلکہ ہر ارادہ تک کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

یہ اصول غیر متبدل ہیں اور کسی دور کے کسی اسٹالن کو اس کا اختیار نہیں کہ ان میں کسی قسم کی
 تبدیلی کر سکے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں جناب مستفیسر سے کہ کیا نوع انسان کے امن و صلاح کا ضامن
 اس قسم کا نظام ہو سکتا ہے یا اشتراکی نظام!

(طلوع اسلام۔ جنوری ۱۹۶۲ء)



اسلامی سوشلزم بیابان قرآن کا اشتراکی نظام؟

انسانی زندگی کا پہلا دور وہ تھا جسے قرآن کریم "آدم کی جنت" کہہ کر لکارتا ہے۔ اس جنت کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ۔ اِنَّ لَكَ اَلْوَجْوَاءَ فِيهَا وَ لَا تَعْرَىٰ - وَ اَنْتَ لَا تَكْفُرُ فِيهَا وَ لَا تَضْمُرُ۔ (۱۱۸-۱۱۹) اس میں نہ کسی کو بھوک کا خوف ستاتا تھا، نہ پیاس کا۔ نہ کسی کو لباس کے لئے پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا نہ مکان کے لئے۔ زمین، رزق کا بنیادی ذریعہ تھی (اور ہے) اور اس پر ہونہ کسی نے لکیریں کھینچ کر اپنی ملکیت میں جتائی تھی۔ اس دور کا انسانی لغت "ملکیت" کے لفظ سے آشنا نہ تھا۔ وہاں تصور "تمتع" (UTILITY) کا تھا۔ اسی لئے قرآن نے ارض کے متعلق کہا تھا کہ وہ متاع ہے، بلکہ نہیں۔ لہذا، اس دور میں ابھی "میری اور تیری" کے جھگڑے نہیں پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ۔ وَ كَلَّا مِنْهَا رَعْدًا حَيْثُ شِئْتُمْ۔ (۱۱۷) جسے بھوک لگتی تھی وہ جہاں سے جی چاہے پیٹ بھر کر کھا لیتا تھا۔ "حَيْثُ شِئْتُمْ" (جہاں سے جی چاہے) کی کیفیت سنا بتا رہا ہے کہ وہ زندگی انفرادی ملکیتوں کی نہیں تھی، اشتراکی تمتع کی تھی۔ اسے قرآن نے جنتی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔

اس کے بعد بعض لوگوں کے ذہن میں انفرادی مفاد پرستانہ تصور نے انگریزوں کی (قرآن نے اسے شیطانی دوسرے سے تعبیر کیا ہے) اور اس ذہنیت نے ابن آدم سے وہ جنت چھین لی۔ اس سے

اُس دور کا آغاز ہوا جس میں حالت یہ ہو گئی کہ۔ **بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ**۔ (پہلے) انسان اور انسان کے درمیان اپنے اپنے مفاد کی حد فاصل قائم ہو گئی۔ ان میں باہمی عداوت پیدا ہو گئی۔

رائلٹی اس لکڑی WEDGE کو کہتے ہیں جو دو لکڑیوں کے درمیان دیدی جاتی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے الگ الگ رہیں۔ باطنی تدبیر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ نظام سرمایہ داری میں انفرادی مفادات کے باہمی ٹکراؤ سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اسے محسوس طور پر سامنے لانے کے لئے **العدا** سے بہتر تشبیہ اور کون سی ہو سکتی تھی؟ یہ دو سرمایہ پرستی جوں جوں آگے بڑھتا گیا، انسان اور انسان میں حالت شدہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ اس خلیج کو پاٹ دینا ذہن انسانی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسے انفرادی مفاد پرستی کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ وہ کسی دوسرے نظام کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس مقصد کے لئے خدا کی طرف سے راہ نمائی ملنے کا سلسلہ جاری ہوا۔ حضرات انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ وہ آدم کو پھر سے وہ جنتک دلا دیں، جس سے شیطانی دسوا انگریزی نے اسے نکالا تھا۔ یہ حضرات آتے اور "میری اور تیری" کی تفریق مٹا کر اپنے دائرہ عمل کے اندر پھر سے اس برادری کی تشکیل کر جاتے جس میں انفرادی مفاد پرستی کی وجہ سے پیدا شدہ عداوتیں باقی نہ رہتیں۔ لیکن ان کے چلے جانے کے بعد مفاد پرستوں کا گروہ پھر برسرِ اقتدار آ جاتا اور پھر سے اسی نظام کو قائم کر دیتا۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تھی۔ آپ نے اپنی حدیث المنظر تسلیم اور فقید المثال عمل سے ایک ایسی برادری کی تشکیل فرمائی جس میں انفرادی ملکیتوں کا عداوت انگریز تصور، بھائی کو بھائی سے الگ کرنے کا موجب نہیں بنتا تھا۔ اس برادری کی تشکیل کن بنیادوں پر ہوئی تھی اس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

مسلمان کیسے ہوا جاتا ہے

آج ہماری کیفیت یہ ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوتے ہیں، انہیں "مسلمان ہونے" کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اور جو غیر مسلم، مسلمان ہونا چاہتا ہے، اس کے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہوتا ہے کہ وہ **اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ** کے الفاظ دہرا دے۔ لیکن اسلامی برادری کی تشکیل اس طرح نہیں ہوتی تھی۔ اسلامی برادری ایک سوسائٹی تھی جس میں شامل ہونے کیلئے ایک معاہدہ (CONTRACT)

پر دستخط کرنا ضروری تھا۔ وہ معاہدہ یہ تھا کہ

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِآقَاتٍ
لَهُمُ الْجَنَّةَ. (۹۱)

ہاں سوسائٹی کی ممبر شپ قبول کرنے والا اس امر کا اقرار و اعلان کرتا تھا کہ اب سے میں اپنی حیاں اور اپنے مال کا مالک نہیں رہا۔ میں نے اسے "اللہ" کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ اور "اللہ" اس کے جواب میں وعدہ کرتا تھا کہ اسے اس کے عوض وہ "جنت" مل جائے گی جس سے آدم نکلا تھا۔ اور جس کی تلاش میں کاروان انسانیت اس طرح مارا مارا پھر رہا ہے۔ یہ عہد و معاہدہ یونہی نظری اور اعتقادی نہیں تھا کہ ایک شخص نے یہ الفاظ دہرا دیئے اور سمجھ لیا کہ معاہدہ کی شرط پوری ہو گئی ہے۔ اسے اپنی جان اور مال سب کچھ فروخت کر دینا ہوتا تھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا، خود تو کسی انسان کے سامنے آتا نہیں، اس لئے یہ متاع کس کے پاس بھی جاتی تھی؟ اس کے لئے خود خدا نے بتا دیا کہ اسے تم اس رسول کے ہاتھوں فروخت کر دو جو ہمارا نظام قائم کرنے کے لئے یہ عہد تم سے لیتا ہے۔ اور اس کے بدلے میں جو ذمہ داری ہم نے لی ہے (یعنی تمہیں پھر سے جنت دیدینے کی ذمہ داری) اسے ہی نظام پورا کر دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ یہ سوچا کیا کرتے تھے، ان کے متعلق کہہ دیا کہ

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ (۹۲)

اے رسول! جو لوگ اپنی اس متاع کو تیرے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں وہ دراصل اسے خدا کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔ اس معاہدہ کی پختگی کے لئے تو جو ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتا ہے تو یہ ہاتھ دیکھنے میں تو تیرا ہاتھ ہوتا ہے لیکن درحقیقت یوں سمجھو کہ یہ خدا کا ہاتھ ہوتا ہے

خدا کی ذمہ داری

اس معاہدہ کے بعد یہ شخص اسلامی سوسائٹی کا ممبر بنتا تھا۔ اور یہ کتنی وہ سوسائٹی جو دنیا میں اس جنت کو مشکل کرتی تھی جس میں، نہ کسی کو بھوک کا خوف نہ تھانا تھا نہ پیاس کا۔ نہ اسے لباس کی منکر پریشانی تھی نہ مکان کی۔ جب اور جہاں کسی کو بھوک لگتی تھی اسے پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا تھا۔ یوں یہ سوسائٹی اسلامی نظام، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرتی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۱)

زمین میں کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے سر
نے رکھی ہو۔

اسی ذمہ داری کی ضمانت کے لئے وہ نظام اعلان کرتا تھا۔ کہ

خُفِّنْ سَرِّزُكُمْ وَ اِيَّاكُمْ (۱۵۲)

میں افراد انسانہ! تم رزق کی طرف سے پریشان مت ہو۔ ہم تمہارے رزق کے بھی
ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

ملکیت کا نام اس نظام کا نام تھا اسلامی نظام، اور اسے قائم کرنے والی جماعت کے نمبر و
کو کہتے تھے مسلمان۔ کچھ عرصہ کے بعد مفاد پرست گروہوں نے پھر سر نکالا
اور جو کچھ سابقہ انبیائے کرام کے پیش کردہ نظام کے ساتھ ہوا تھا وہی کچھ اسلامی نظام کے ساتھ ہو گیا۔
یعنی اسلام کے اشتراکی نظام کی جگہ انفرادی ملکیت کے نظام نے لے لی، اور بیع و شری کے خدائی عہد نامہ
پر دستخط کر کے اس سوسائٹی کا نمبر بننے کے بجائے، بعض اسلام کی طرف اپنی نسبت کرنے والے مسلمان
سمجھ لئے گئے۔ ملکیت کے نظام کی بدترین شکل ملوکیت ہوتی ہے۔ اس میں ساری ملک ایک فرد کے
قبضہ میں رہتی ہے۔ پھر جس جس کو وہ کچھ حصہ دیدے وہ اس حصہ کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ باقی دنیا
کی طرح یہی نظام مسلمانوں میں بھی متواتر چلا آ رہا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ باقی دنیا سے برتائی
مسلحت قبول و اختیار کے ہوئے۔ جب کسی کی مسلحت کا تقاضا ہو وہ اسے بدل سکتے ہیں لیکن
مسلمانوں نے گزشتہ انبیائے کرام کے نام یواؤں کی طرح، اسے خدائی نظام، قرار دے رکھا ہے جسے
بدلا ہی نہیں جاسکتا۔ حتیٰ کہ اب ان کی طرف سے یہاں تک بھی کہ دیا جاتا ہے کہ انفرادی مفاد کے حصول
کی خاطر جدوجہد کرنا، انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اس کے سوا، محنت کرنے کا کوئی اور جذبہ محرک
ہو نہیں سکتا۔ اور چونکہ اسلام، دین فطرت ہے اس لئے انفرادی مفاد پرستی عین مطابق اسلام
بلکہ تقاضاے دین ہے۔ (خدا فریبی کی اس سے بدتر مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے)۔

عصر حاضر میں جب انسانی ذہن نے ملوکیت کے خلاف احتجاج کیا تو مفاد پرست گروہوں
نے اس کے لئے ایک بہترین تیار کی جس کا نام ڈیموکریسی (جمہوریت) رکھا گیا۔ ملوکیت اور مغربی جمہوریت

میں فرق صرف اصطلاح کا ہے۔ روح دونوں کی ایک ہے۔ یعنی انفرادی ملکیت کا تصور دونوں جگہ موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے جو فیصلہ ایک فرد کیا کرتا تھا اور اسے "بادشاہ کا حکم" کہا جاتا تھا، اب وہ فیصلے مفاد پرستوں کا ایک گروہ کرتا ہے جو مختلف سیاسی حیلوں اور دولت کے زور سے یہ پولیشن حاصل کر لیتا ہے۔ اور ان کے فیصلوں کو مملکت کا قانون، اور ان کے مفاد کو مفاد عامہ (PUBLIC - INTEREST) - جیسی فریب آفریں اصطلاحات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اشتراکیت

لیکن زمانے کے تقاضے اس تغیر لفظی سے مطمئن نہیں ہو سکے۔ وہ "ملکیت" کے تصور سے آبا کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اشتراکیت (کمیونزم) کی صورت میں سامنے آیا۔ اس نقطہ خیال سے دیکھئے یعنی انفرادی ملکیت کے تصور کو ختم کر دینے کے نقطہ خیال سے، تو اشتراکیت نے وہی کچھ کرنے کا دعویٰ کیا ہے جو کچھ کرنے کے لئے اسلام آیا تھا۔ لیکن ان دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اشتراکیت انفرادی ملکیت کے تصور کو بزور مٹانا چاہتی ہے۔ لیکن اسلام اپنی ہمہ گیر تعلیم اور بلند فلسفہ حیات کی بنا پر انسانی قلوب میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کر دیتا ہے کہ ملکیت کے اس تصور کو مٹانا ان کے لئے اسی طرح تقاضا حیات بن جاتا ہے جس طرح طبیعی زندگی کے لئے سانس لینا تقاضا حیات ہوتا ہے۔ ہم کسی قانون کے ڈرت سانس نہیں لیتے۔ بہر حال، انفرادی مفاد پرستی (یعنی نظام سرمایہ داری) کے تصور کو مٹانا، اشتراکیت اور اسلام دونوں میں قدر مشترک ہے۔ اگر مسلمانوں کے سامنے دین اپنی حقیقی شکل میں ہوتا، تو وہ عصر حاضر کے اس تقاضے کو اپنے حق میں بڑی نیک قال سمجھتے۔ کیونکہ اس نے تقاضا نظام کو دوبارہ تشکیل کرنے کے لئے سازگار ہو گئی تھی جس کا قیام، اسلام کا مقصود تھا۔ لیکن ان کی راہ ان کے ساتھ عالم انسانیت کی، بد نفسی کہ انہوں نے، اس موقع کو غنیمت سمجھنے کے بجائے، اس تصور کو خلاف اسلام قرار دیا اور سب سے بڑھ کر اس کی مخالفت شروع کر دی۔ سرمایہ دار مملکتوں کے لئے ان کا یہ رد عمل بڑا مفید مطلب تھا۔ اس لئے انہوں نے بھی ان کی بیٹھ کھوئی۔ اس طرح انہوں نے مسلمانوں نے، اس محاذ میں، اس تصور کے سب سے بڑے مخالف کی حیثیت اختیار کر لی۔ چنانچہ اب صورت یہ ہے کہ ہمارا مذہب ہی پیشوائیت کا طبقہ اس مخالفت کو جہاد قرار

دے رہا ہے ان کی طرف سے، اس تصور کے خلاف جسے سوشلزم سے تعبیر کیا جاتا ہے (دلائل کس قسم کے دیئے جاتے ہیں، وہ سننے کے قابل ہیں۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب اپنی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" میں لکھتے ہیں۔

ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخمیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطہ نظر کی ضد ہے۔ لہذا اگر ہمیں اسلامی اصول پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو تو ایسی تمام تجویزوں کو پہلے قدم ہی پر لپیٹ کر رکھ دینا چاہیے جن کی بنیاد میں قومی ملکیت کا نظریہ اصول یا نسب العین کی حیثیت سے موجود ہو۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اسلام زبردستی مالکان زمین کی ملکیتیں چھین لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور بات صرف اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کی اجازت نہیں دیتا جن کے ذریعے سے کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ چھینے پر مجبور کیا جاسکے۔ بلکہ درحقیقت اسلامی نظریہ تمدن و اجتماع ہر سے اس تخمیل ہی کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں اور پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائے جو ان ذرائع پر مقرر ہو۔ جن ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہیں انہی ہاتھوں میں سوداگری اور کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کس نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا ہے۔ اس لئے یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اگر غاصبانہ طریقے سے زمینوں پر قبضہ نہ کیا جائے، بلکہ پورے پورے معاوضے دے کر حکومت تمام زمینوں کو ان کے مالکوں سے برضا و رغبت خرید لے تو اسلامی نقطہ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جزییات شرع کے لحاظ سے چاہے اس میں قباحت نہ ہو، مگر کلیات شرع کے لحاظ سے یہ تخمیل ہی غلط ہے کہ عدلی اجتماعی کی خاطر زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیتوں سے نکال کر قومی ملکیت بنا لیا جائے۔ یہ انصاف کا اشتراکی تصور ہے نہ کہ اسلامی تصور، اور اس تصور کی بنیاد پر ایک اشتراکی معاشرہ پیدا ہوتا ہے نہ کہ اسلامی معاشرہ۔ اسلامی معاشرہ کے لئے تو یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے اگر سب نہیں تو اکثر

افراد اپنی معیشت میں آزاد ہوں۔ اور اس غرض کے لئے ناگزیر ہے کہ ذرائع پیداوار
افراد ہی کے ہاتھوں میں رہیں۔

اس دلیل کا بودا بین

اس دلیل کا ذرا تجزیہ کیجئے۔ سوال یہ تھا کہ ”اسلامی نظام“ میں، ذرائع پیداوار، افراد کی
ملکیت میں رکھے جائیں گے یا امت کی مشترکہ تحویل میں ہوں گے۔ اس نکتہ کو ایک دفعہ بھر سمجھ لیجئے
کہ سوال یہ تھا کہ کیا اسلام کی رو سے یہ جائز ہوگا کہ ذرائع پیداوار امت کی مشترکہ تحویل میں رکھے
جائیں اس کے جواب میں سود و وہی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر اسلامی نظام حکومت میں ذرائع پیداوار
نظام کی تحویل میں دیدیئے جائیں تو اس سے پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائیگی
جو ان ذرائع پر متصرف ہوگا۔ جن کے ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں
ہوں گی، انہی کے ہاتھوں میں اگر سود آگری کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو
اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہو جائے گا جس سے بڑھ کر انسانیت گمشدہ نظام آج تک شیطان
ایجاد نہیں کر سکا۔

سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی نظام میں بھی کیفیت یہ ہوگی کہ

(۱) پورا اقتدار سمٹ کر ایک مختصر سے گروہ کے ہاتھوں میں آجائے گا۔ اور امت اس گروہ کی
غلام ہوگی۔

(۲) اس گروہ کے ہاتھ میں، فوج، پولیس، قانون سازی کا جو اقتدار ہوگا وہ اسے قوم کو اپنا

غلام بنانے کے لئے استعمال کرے گا۔ لہذا

(۳) اگر ذرائع پیداوار بھی اسی گروہ کے ہاتھ میں دیدیئے جائیں تو وہ اس شیطانی نظام کے
ہاتھوں انسانیت کا گلا گھٹ جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ اگر اسلامی نظام کے ارباب حل و عقد کی بھی یہی حالت ہوگی کہ وہ اپنے اقتدار و

اختیار کو انسانیت کو ذبح کرنے کے لئے استعمال کریں گے، تو پھر فرعونی نظام اور اسلامی نظام میں

فرق کیا ہوگا؟ اگر حالت یہی ہوتی ہے تو پھر اس اسلامی نظام کو کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔

کہ اس کی خاطر موجودہ نظاموں کو الٹ دینے کے لئے اس قدر قربانیاں کی جائیں! یہ حضرات ہمیں بتاتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اسلام کے نظام حکومت میں نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو نہایت متدین، متشرع، متقی، خدا ترس، صالح، اور بہ ہمہ وجود، خدا اور اس کے رسول کے رنگ میں رنگے ہوں گے، اور وہ خلاف رشادہ کے نظام کو پھر سے قائم کریں گے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس قسم کے لوگوں کی بھی حالت یہی ہوگی، کہ جس قدر ان کے اختیارات بڑھتے جائیں گے، اسی قدر ان لوگوں پر عرصہ حیات تنگ ہوتا جائے گا تو پھر ان لوگوں میں اور موجودہ ایسی نظاموں کے ارباب بست و کشاد میں فرق کیا ہوگا؟ اگر "صالحین" کے ہاتھوں بھی خلق خدا کا وہی حشر ہونا ہے جو "فاسقین اور فاجرین" کے ہاتھوں میں ہو رہا ہے تو "صالحین" کو برسرِ اقتدار لانے کے لئے اس قدر رک و کاوش کا ہے کہ پتہ ہے وہ دلیل جسے یہ حضرات اس طمطراق سے پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر زمین کو انفرادی ملکیت سے نکال کر امت کی مشترکہ تحویل میں دید جائے تو اس سے ایسا نظام وجود میں آجاتا ہے جس سے زیادہ انسانیت کش نظام شیطان وضع نہیں کر سکا۔ ہم ان سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے عراق کی زمینوں کے متعلق فیصلہ کیا تھا کہ انہیں انفرادی ملکیت میں دینے کے بجائے، حکومت کی تحویل میں رکھا جائے، تو کیا اس کے بعد وہ نظام واقعی "انسانیت کش شیطانی" نظام میں تبدیل ہو گیا تھا۔

دینی انتشار

اگلے دنوں روزنامہ نوائے وقت میں چوہدری محمد علی صاحب کا ایک مقالہ مسلسل قسطوں میں شائع ہوا تھا جس کا موضوع تھا "اہل پاکستان کے سیاسی اور معاشی مقاصد"۔ اس میں انہوں نے بھی ذرائع پیداوار کو قومی تحویل میں دیدینے کی مخالفت کی ہے۔ لیکن اس کے لئے ان کی دلیل کیا ہے، وہ بھی سننے کے لائق ہے۔ وہ اسلامی نظام حکومت کی خوبیاں گنواتے

ہوئے لکھتے ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اسلام میں ارباب حکومت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ حکومت کے اختیارات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے یا اپنے خویش واقارب کے لئے مال و دولت فراہم کریں۔ حکومت کے تمام اختیارات اور سارا خزانہ یا بیت المال عوام کی امانت ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

”میرا تعلق تمہارے مال کے ساتھ وہی ہے جو یتیم کے ولی کا تعلق یتیم کے مال کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر میں حاجتمند نہ ہوں تو اس میں سے کچھ نہ لوں گا۔ اور اگر حاجتمند ہوں تو معمولی گزارہ لے لوں گا۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق خلافت راشدہ میں خلیفہ اور گورنروں اور عاملوں کے لئے بیت المال سے فقط اتنا شاہر مقرر کیا گیا تھا جو ان کے گھر والوں کو ایک عام مسلمان گھرانے کی طرح زندگی بسر کرنے دے۔ حالانکہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں فتوحات اور مالی غنیمت کی کثرت کی وجہ سے عام لوگوں کی مالی حالت بدرجہا بہتر ہو گئی تھی۔ لیکن خلیفہ وقت کی خودیہ حالت کھتی کہ پورے میں کئی کئی پیوند لگے ہیں۔ مکان کے لئے ایک جھونپڑا ہے اور کھانا وہی ہے جو ایک آدمی کو میسر آتا ہے۔ خلافت راشدہ کے دور میں ہر خلیفہ وقت کی یہی کیفیت رہی۔ اور مختلف صوبوں کے گورنروں کو بھی ایسی ہی زندگی بسر کرنے کے احکام تھے۔ اس امر پر اجماع صحابہ ہے کہ جو حکمران ہے وہ سوداگری نہیں کر سکتا۔ یعنی حکومت کو مال دار بننے کا ذریعہ نہیں بنایا جاسکتا۔ خلافت راشدہ اور ہر دوسری طرز حکومت کے درمیان یہ حد فاصل ہے۔ کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ حکمرانوں نے بالعموم حکومت کو اپنے اور اپنے اعزہ واقارب کے لئے مال و آسائش کا ذریعہ بنایا اور بندگان خدا پر اپنی آفتابی کا سکہ جمایا۔

(نوٹس وقت۔ بابت ۲۰ جون ۱۹۶۶ء)

ظاہر ہے کہ جس نظام حکومت میں حکمران طبقہ کی یہ کیفیت ہو، اس میں اگر معاشی ذرائع، حکومت کی تحویل میں دیدیئے جائیں تو اس سے کیا خرابی لازم آسکتی ہے؟ لیکن اس کے باوجود وہ لکھتے ہیں کہ

اسلام ارتکاز مال و اقتدار پر ضرب کاری لگاتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ وہ دونوں کو ایک ہاتھ میں جمع ہونے دے، ان میں تفریق کرتا ہے۔

یعنی ارباب اقتدار، اوبیکرز و عمرز کی سیرت و کردار کے حامل بھی کیوں نہ ہوں، اسلام انہیں بھی قابل اعتماد نہیں سمجھتا اس لئے اقتدار اور مال کو ایک ہی ہاتھ میں جمع ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ یا اللعجب! جس نظام میں اتنی بھی صلاحیت نہیں کہ وہ ارباب اختیار کو صرف مال کے معاملہ میں حدود کے اندر رکھ سکے، اس کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ وہ انسانیت کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے خوش فہمی کے سوا اور کیا کہلا سکتا ہے؟

ہمیں اس اعتراض کے وزنی ہونے میں ذرا بھی تاثر نہیں کہ معاشرہ کے موجودہ نظام میں ارباب اقتدار کے ہاتھ میں جس قدر زیادہ اختیارات ہوں گے معاشرہ میں اتنی ہی زیادہ خرابیاں پیدا ہوں گی۔ لیکن اس سے یہ دعویٰ کرنا کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ذرائع پیداوار کو قوم کی مشترکہ تحویل میں رکھا جائے۔ اگر فریب دہی نہیں تو خود فریبی ضرور ہے۔ اس موضوع پر گفتگو اس انداز سے ہونی چاہیے کہ

(۱) کیا اسلام کی رُود سے یہ جائز ہے کہ ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیت کے بجائے امت کی مشترکہ تحویل میں رکھا جائے۔

(۲) اگر یہ جائز نہیں تو پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوگا کہ حکمران صالحین میں یا فاسقین۔

(۳) اور اگر یہ جائز ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ معاشرہ کی موجودہ حالت کو پیش نظر رکھتے

ہوتے ہیں کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن سے ہم بہتر رجحان منتهی تک پہنچ سکیں۔

اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ ہم معاشرہ کے پورے نظام کو آہستہ آہستہ قرآن کریم کی عطا کردہ

اقدار کے قالب میں ڈھالتے جائیں۔ یاد رکھئے۔ اسلام زندگی کا کُل نظام عطا کرتا ہے

معاشری نظام اس کا ایک گوشہ ہے۔ اس نظام کے مختلف گوشے اپنے انسانیت ساز نتائج

اسی صورت میں مرتب کریں گے جب اسے بالکل نفاذ کیا جائے۔

اس کے کسی ایک گوشے کو، باقی نظام سے الگ کر کے، مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کئے جاسکتے۔

اسلامی سوشلزم

اب ہم اس مسئلہ کے دوسرے گوشے کی طرف آتے ہیں جو گوشہ اول سے بھی زیادہ اہم ہے اور اس کا تعلق ہے ان حضرات سے جو اس کے قائل اور مدعی ہیں کہ پاکستان میں سوشلزم کا نظام رائج ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں چند بنیادی حقائق کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) سوشلزم ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا کوئی ایک مفہوم ابھی تک متعین نہیں ہو سکا۔ اس لئے جب یہ کہا جائے کہ پاکستان میں سوشلزم کا نظام رائج ہونا چاہیے تو اس سے کوئی خاص نظام سنا مننے نہیں آتا۔

(۲) چونکہ سوشلزم کی نسبت عام طور پر روس اور اب، چین کی طرف کی جاتی ہے اس لئے اس اصطلاح سے ذہن اسی طرف جاتا ہے۔ یعنی سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ لوگ یہاں روس دیا اب، چین کی سوشلزم رائج کرنا چاہتے ہیں۔

(۳) روس اور اب، چین میں سوشلزم سے مفہوم صرف معاشی نظام نہیں۔ سوشلزم (اور اس سے آگے کمیونزم) سے مراد ہے ایک خاص فلسفہ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام ہے جو ہاں (بالخصوص چین میں) ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ چین کی تو روس سے لڑائی ہی اس بات پر ہے کہ روس نے سوشلزم کے فلسفہ حیات میں تحریف کر دی ہے۔ اسی لئے وہ اسے "بدعتی" قرار دیتا ہے۔

(۴) سوشلزم کا معاشی نظام تو قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔ لیکن سوشلزم کا فلسفہ قرآنی فلسفہ حیات سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ اس کی ضد ہے۔

(۵) ہمارے ہاں سوشلزم کے مدعی، ان دونوں بنیادی چیزوں (یعنی سوشلزم کے فلسفہ حیات اور اس کے معاشی نظام) میں تفریق نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ نظام سرمایہ داری کے حامی ہیں، وہ سوشلزم کے خدا فراموش فلسفہ حیات کو ابھار کر سامنے لے آتے ہیں اور پھر مسلمانوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا تمہارے نزدیک اس قسم کا نظام جس میں نہ خدا کو مانا جاتا ہے نہ رسول کو، نہ آخرت پر ایمان ہوتا ہے نہ وحی پر کسی طرح بھی قابل قبول

ہو سکتا ہے؟ اور نظر ہر ہے کہ اس قسم کا نظام کسی بھی مسلمان کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اس طرح وہ اپنے پراپیگنڈہ میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

(۶) اس تبلیغ (یا القیاس) کو محسوس کرتے ہوئے بعض حضرات نے یہاں اسلامی سوشلزم کی اصطلاح رائج کرنی چاہی ہے۔ لیکن ان کی طرف سے بھی متعین طور پر نہیں بتایا جاتا کہ اس سے مراد کیا ہے؟ اس سے نظام سرمایہ داری کے حامیوں کو پھر اعتراض کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے ترجمان، ہفتہ وار الشیعین (لاہور) کی ۱۶ اپریل ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں اس موضوع پر سوال و جواب کی شکل میں مودودی صاحب کے جوابات شائع ہوئے۔ وہ غور طلب ہیں۔

”سوال“ آج کل ”اسلامی سوشلزم“ کی اصطلاح کثرت سے استعمال ہو رہی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ براہ کرم وضاحت فرمائیے۔

جواب :- جو لوگ ”اسلامی سوشلزم“ کا نام لیتے ہیں، پہلے ان کا فرض ہے کہ وہ اس کی وضاحت فرمائیں، بعد میں ہم کچھ کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت صرف ”اسلامی سوشلزم“ کے الفاظ ہی سے جلتے ہیں میری نگاہ سے نہیں گذرے کسی نے اس کی وضاحت بھی کی ہو، اور اگر کہیں کچھ لوگوں نے اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے تو دو آدمیوں کی وضاحت آپس میں نہیں ملتی۔ ہر ایک نئے معنی پیش کرتا ہے۔ اب ہوائی باتوں کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔ یہ تو ”اسلامی سوشلزم“ کا نعرہ بلند کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ وضاحت سے بتائیں کہ اس سے ان کا مطلب کیا ہے؟

”میں مختصراً جو کچھ بتا سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ سوشلزم ایک خاص مسلک کی حیثیت سے دنیا میں معروف ہے اس مسلک کے اگرچہ مختلف مذاہب (SCHOOLS OF THOUGHT) ہیں مگر ان سب میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ ایک ملک کے تمام ذرائع کو نیشنلائز کر لیا جائے۔ اب اگر اس نیشنلائزیشن کو سوشلزم سے نکال دیا جائے تو اس کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا اور اگر اس مفہوم کو باقی رکھا جائے جیسا کہ وہ ہے تو اس کے ساتھ اسلامی لفظ لگانا سراسر فریب ہے۔

”اسلام میں اس طرح کی قومی ملکیت کا کوئی جواز نہیں کہ تجارت، کھیت، کارخانے، گھر حتیٰ کہ برتن، کپڑے تک سرکاری ملکیت میں ہوں اور افراد کے پاس کوئی شے نہ چھوڑی جائے۔ یہ چیز بدترین

آمریت کے سوا کچھ نہیں دیتی۔ ہمارے ہاں جو لوگ اسلامی سوشلزم کا نام لیتے ہیں وہ اپنے آپ کو جمہوریت کا قائل بھی کہتے ہیں۔ حالانکہ اگر سوشلزم کا نام کہیں رائج ہو تو جمہوریت وہاں پنپ ہی نہیں سکتی۔ سوشلزم ڈکٹیٹر شپ کے ذریعے آتا ہے یا پھر اگر جمہوریت موجود ہو تو اسے ختم کر دیتا ہے۔ تختہ دل سے غور کرنا چاہیے کہ جہاں ذرائع پیداوار قومی ملکیت میں لے لئے گئے ہوں تو وہاں کیا حال ہوگا۔ اس کا اندازہ خود لگالیں۔ سوشلزم میں زمین اور کھیت قومی ملکیت ہوتے ہیں، آپ صرف کاشتکار ہوتے ہیں۔ سارے کارخانے حکومت کے قبضے میں ہوتے ہیں، آپ صرف مزدور ہوتے ہیں۔ اظہار رائے آپ نہیں کر سکتے، اختلاف کا کوئی آپ کو حق حاصل نہیں ہوتا۔ جن قوموں پر ڈکٹیٹر شپ مسلط ہے وہ تو خدا کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ لیکن اس قوم سے زیادہ احمق کون ہوگا، جو اسے اپنی مرضی سے اپنے اوپر مسلط کرنے کی خواہش کرے۔ انسان کی معیشت آزاد نہ ہو تو اس کی ہر آزادی ختم ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں اس کا ضمیر بھی غلام ہو کر رہ جاتا ہے۔ جبکہ اسلام نے انسان کی بھلائی کا پورا سہ تجویز کیا ہے اس میں کسی زبردستی یا جبر کا تصور نہیں۔ اسلام ضمیر کی موت یا شرف آدمیت سے محرومی کی قیمت پر کسی نظام حیات کا قائل نہیں ہے۔

”میں چاہتا ہوں کہ جن پارٹیوں کے لیڈر اسلامی سوشلزم کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، وہ حقائق کی روشنی میں ان باتوں پر غور کریں۔ اس سے ان کی تمام غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ یہ تقاضا اور فریضہ ہے کہ اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ وضاحت سے بتائیں کہ اس سے ان کا مطلب کیا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔“

(۱) سوشلزم سے مراد ہے مارکس کا پیش کردہ فلسفہ حیات، روس یا چین کا معاشی نظام۔ ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ اسلامی پیوند لگ ہی نہیں سکتا۔

(۲) اگر سوشلزم سے اس کا فلسفہ زندگی نکال دیا جائے تو وہ سوشلزم نہیں رہتی بلکہ ایک سوشل سسٹم (SOCIAL SYSTEM) رہ جاتا ہے۔ اگر اسلامی سوشلزم سے مراد ہے (اسلام کا فلسفہ حیات، پس قسم کا معاشی نظام جو روس یا چین میں رائج شدہ نظام کے مماثل ہے) تو اسے آپ اسلام کا سوشل سسٹم کہہ سکتے ہیں، اسلامی سوشلزم نہیں کہہ سکتے۔ باوی النظر میں ہر دو اصطلاحات میں یونہی لفظی فرق نظر آئے گا لیکن ذرا گہرائی میں جا کر دیکھئے تو

یہی لفظی سافرن ان دونوں کے مفہوم کو الگ الگ کر دے گا۔ سوشلزم میں (ISM) کا تعلق فلسفہ حیات سے ہے۔ لیکن (سوشل سسٹم) میں فلسفہ حیات کا تصور شامل نہیں ہوتا، صرف سوشل نظام مقصود ہوتا ہے۔ لہذا، اسے۔

قرآن کا سوشل سسٹم

— کہا جاسکتا ہے۔ اس پر وہ اعتراضات وارد نہیں ہو سکیں گے جو اسلامی سوشلزم کی اصطلاح پر حسن نیت یا پراپیگنڈہ کی غرض سے (عامہ کئے جاتے ہیں۔

(۳) سوشلزم کے خلاف یہ اعتراض بھی دزنی ہے کہ یہ ڈکٹیٹر شپ کے ذریعے ہی قائم ہو سکتی ہے — یہ اس لئے کہ روس یا چین میں سوشلزم کے علمبردار شروع سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اسکی بنیاد (PROLETARIAT DICTATORSHIP) ہے۔ قرآن کے نظام معیشت پر یہ اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا.... اس لئے کہ اس کا معاشی نظام کوئی الگ نئے نہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ قرآن ایک نظام کلی دیتا ہے جو زندگی کے ہر گوشہ کو محیط ہوتا ہے۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی نظام، سب اس کئی نظام کے مختلف پہلو (FACETS) ہیں چونکہ قرآنی نظام میں ڈکٹیٹر شپ نہیں، اس کا نظام مشاورتی ہے، جس میں ساری امت شریک ہوتی ہے، اس لئے قرآنک سوشل سسٹم پر یہ اعتراض بھی نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے لئے ڈکٹیٹر شپ لازمی ہے۔

(۴) چوہدری محمد علی صاحب نے اپنے مضمون میں کہا ہے کہ سوشلزم، تشدد کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔ ان کا یہ اعتراض بھی دقیق ہے۔ سوشلزم کے مدعی اس حقیقت کو چھپا کر نہیں رکھتے کہ یہ انقلاب تشدد کے بغیر برپا نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرآن کے سوشل نظام پر یہ اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا۔ یہ انقلاب قلب و دماغ میں صالح تبدیلی سے برپا ہوتا ہے۔ ایمان، قلب و دماغ کی کامل رضامندی سے صداقت کو تسلیم کر لینے کا نام ہے۔ یہ (CONVICTION) ہے (COERCION) نہیں۔ اس میں طاقت کی ضرورت وہاں لائق ہوتی ہے جہاں اسلام کے دشمن (قریش مکہ کی طرح) اس نظام کے قیام کی راہ میں حائل ہوں یا اسے طاقت کے ذریعے مٹانا چاہیں۔

(۵) مووردی صاحب نے اعتراض کیا ہے کہ "سوشلزم میں زمین اور کھیت قومی ملکیت ہوتے ہیں۔ آپ صرف کاشتکار ہوتے ہیں۔ سارے کارخانے حکومت کے قبضے میں ہوتے ہیں، آپ صرف مزدور

ہوتے ہیں۔ یہ اعتراض اس سسٹم پر تو وارد ہو سکتا ہے جس میں "قوم" الگ ہو اور "افراد" الگ۔ یا "حکومت" اور ہو اور "رہایا" اور۔ ورت آئی نظام میں یہ شرق اور امتیاز ہوتا ہی نہیں۔ وہاں "قوم" کا وجود افراد سے الگ نہیں ہوتا۔ نہ ہی حکومت، اور رہایا درجہ اگانہ وحدتیں ہوتی ہیں۔ وہاں ہر فرد قوم ہوتا ہے، اور حکومت خود افراد کی اپنی ہوتی ہے۔ کسی غیر کی نہیں ہوتی۔ اس لئے اس میں قومی ملکیت سے مراد ہوتی ہے جملہ افراد کی مشترکہ ملکیت (بلکہ تحویل) اور حکومت سے مراد ہوتی ہے افراد کا اپنا کام کرنے کا نظام معاشرہ۔

آپ نے غور نہ کیا کہ سطح بین حضرات جسے محض اصطلاح کا لفظی فرق کہتے ہیں، وہ درحقیقت کس قدر دور رس نتائج کا حامل ہے۔ یہ وجہ ہے جو ہم اس پر زور دیتے رہتے ہیں کہ ہمیں اصطلاحات ترقی ہی استعمال کرنی چاہئیں۔

ایک اہم شہادت

باقی رہا مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ اگر سوشلزم کا مفہوم ہے نیشنلائزیشن - NATIONALIZATION - یعنی ذرائع پیداوار کو امتت کی مشترکہ تحویل میں دے دینا، تو اس کے ساتھ اسلامی لفظ لگانا سراسر فریب ہے۔ مودودی صاحب سے کسی معاملہ میں قرآن کی بنیادوں پر گفتگو کرنا بے کار ہے سو اس سلسلہ میں ہم ایک ایسی تائید پیش کرتے ہیں جسے غالباً، وہ سند تسلیم کر لیں گے۔ انھوں نے مسلمان کے سربراہ، سید قطب (مرحوم) کے متعلق ان کے جو خیالات ہیں، وہ واضح ہیں۔ وہ انہیں عصر حاضر کا عظیم مفکر اور جلیل القدر مفسر قرآن مانتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب (العدل الاجتماعیہ) میں لکھتے ہیں کہ

اسلام یہ کر سکتا ہے کہ مفاد عامہ سے متعلق ساری چیزوں کو ان نفع اندوزوں اور سٹہ بازوں کے ہاتھ سے لے کر جو قومی مفاد کا ذرا بھی پاس اور لحاظ نہیں رکھتے، قوم کے ہاتھ میں دیکھ

(صفحہ ۳۰۳)

اس سلسلہ میں اتفاق سے خود مودودی صاحب کی ایک ایسی بات سامنے آتی ہے جو ان کے تمام اعتراضات کا جواب بنیاد پر دیتی ہے۔ ان کے درس قرآن و حدیث میں کسی نے یہ سوال پوچھا کہ

آپ نے فرمایا ہے کہ آدمی بقدر کفایت پس انداز کر سکتا ہے۔ ہزار روپیہ ماہوار آمدن پانے والے آدمی کے لئے بقدر کفایت کیا رقم ہو سکتی ہے۔

اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ

اس کا فیصلہ تو آدمی خود کر سکتا ہے۔ اور صحیح فیصلہ وہی شخص کرے گا جس میں اسلامی ذوق موجود ہو۔ مغربی ذوق رکھنے والے آدمی کا انداز بالکل مختلف ہوگا۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ ایک اسلامی معاشرے میں کبھی کسی شخص کو اپنے مستقبل کی فکر نہیں ہوتی۔ یہ معاشرہ خود سارا انتظام کرتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی معاشرہ میں ہر فرد ایک دوسرے سے کٹا ہوا نظر آتا ہے اور اسے اپنے مستقبل کو خود سمجھنا پڑتا ہے اس لئے وہاں بقدر کفایت کا مفہوم اسلامی معاشرہ سے بالکل مختلف ہے۔

(ایشیا۔ موزنہ ۲۶)

بس یہی فرق قرآن کے اشتراکی معاشرہ اور نظام سرمایہ داری میں ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرہ میں ہر فرد دوسرے سے کٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اسے اپنے مستقبل (بلکہ حال اور مستقبل دونوں) کو خود سمجھنا پڑتا ہے اور قرآن کے اشتراکی معاشرہ میں کسی شخص کو اپنے (حال اور) مستقبل کی فکر آپ نہیں کرنی پڑتی۔ معاشرہ اس کا خود سارا انتظام کرتا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جب تمام افراد کے (حال اور) مستقبل کا فکر معاشرہ کو کرنا ہوگا تو معاشرہ اپنے اس عظیم فریضہ کو اسی صورت میں پورا کر سکے گا جب ذرائع پیداوار افراد کی ملکیت کے بجائے، معاشرہ کی تحویل میں رہیں۔ اسی کا نام اشتراکی نظام ربا بیت یا قرآن کا سوشل نظام معیشت ہے۔ (سوشل کے معنی ہی یہ ہیں کہ افراد ایک دوسرے سے کٹے ہوئے نہ ہوں۔ ایک وحدت کے غیر منقسم اجزاء ہوں) افراد کے متعلق معاشرہ کی یہی وہ اجتماعی ذمہ داری تھی جس کے احساس سے حضرت عمرؓ نے

سرمایہ دار تھا کہ

اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتابھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم، عمر سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔ اور اسی ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے آپ نے فیصلہ کیا تھا کہ عراق کی مفتوحہ زمینیں افراسیاب تقسیم کرنے کے بجائے مملکت کی تحویل میں رہیں گی۔ یہی وہ قرآن کا اشتراکی تصور تھا جس کی تابندہ جھلک ہمیں صحیفین کی اس روایت میں ملتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے بیان کیا کہ اشعر قبیلہ والوں کے ہاں دستور یہ تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا کھوڑا رہ جاتا، یا ان کے ہاں بال بچوں پر ویسے فالتے کی نوبت آ جاتی تو یہ لوگ اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر بٹھتے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔

اشعریوں کا یہی دستور تھا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (قرآنی راہ نمائی میں) اسلامی نظام معاشرہ کے آئین کی حیثیت سے رائج فرمایا۔ اسی کو قرآنی نظام معیشت کہا جاتا ہے جس میں پوری امت کا دسترخوان مشترک ہوتا ہے۔

ایک فریب ہے ایک حقیقت

جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے، ہم اس وقت تاریخ کے ایک بڑے نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ قریباً قرن کے سرمایہ داری کے مستبدانہ نظام کے بعد، خدا خدا کر کے یہ کیفیت پیدا ہوئی ہے کہ

زمین میر و سلطان سے بیزار ہے

سرمایہ داری نظام کی قوتوں نے ہمیشہ مذہب کو اپنا آلہ کار بنایا ہے۔ وہ آج بھی یہی کر رہی ہیں۔ اس کے لئے ان کی طرف سے اشتراکیت کی مخالفت کے لئے

BELIEVERS IN GOD UNITE TOGETHER.

کافر یا انگریز نعرہ بلند کیا جاتا ہے۔ اگر ہم اس وقت (BELIEVERS IN GOD) کے اس نعرہ کو

لے خدا کی طرف سے عطا شدہ دین کی مسخ شدہ صورت کا نام مذہب ہے۔

میں آگئے تو معلوم تاریخ میں اس قسم کا موڑ کب آئے۔ اس سلسلہ میں ہم نظام سرمایہ داری کے حمایتیوں سے تو کچھ کہنا بے کار سمجھتے ہیں، البتہ جو حضرات اپنے سینے میں "اسلام اور سوشلزم" کا درور رکھتے ہیں ان سے ضرور عرض کریں گے کہ وہ اپنے موقف کی وضاحت صاف صاف کریں تاکہ معترضین کے لئے غلط پرائیگنڈے کی گنجائش نہ رہے اور ظاہر ہے کہ یہ موقف اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ۔

(۱) اسلام ایک کئی نظام زندگی ہے جس کی بنیاد اس اصل عظیم پر ہے کہ اطاعت اور محکومیت صرف خدا کی ہو سکتی ہے جس کا عملی ذریعہ اس کی کتاب (قرآن کریم) کی اطاعت ہے۔

(۲) یہ اطاعت انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ اجتماعی طور پر، معاشرہ کے اندر ہو سکتی ہے جس معاشرہ میں اطاعت کتاب اللہ کی ہو اسے اسلامی معاشرہ کہتے ہیں۔

(۳) اسلامی معاشرہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں افراد کی بنیادی ضروریات زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہوتی ہے۔ اور معاشرہ اپنی اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ براہوں کے لئے ذرائع پیدا کرے کہ اپنی اجتماعی تحویل میں لے سکتا ہے۔ ذرائع پیداوار کے متعلق قرآن کا دیا ہوا تصور یہی ہے کہ ان پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ وہ تمام افراد کے لئے سامان زینت بنایا کرنے کا ذریعہ ہیں۔

(۴) اسلام کے اس معاشی نظام کو "سوشلزم" نہیں کہنا چاہیے۔ کیونکہ سوشلزم (SOCIALISM AS SUCH) صرف ایک معاشی نظام نہیں بلکہ ایک خاص فلسفہ زندگی

پر متفرع معاشی نظام ہے اور وہ فلسفہ زندگی، اسلامی نظریہ حیات کی نقیض ہے۔ اگر اسے قرآنک سوشل آرڈر" کہہ لیا جائے تو اس میں سوشلزم کے فلسفہ زندگی کا تصور نہیں آتا۔ قرآنی نظام زبوت اس کا صحیح مفہوم ادا کر سکتا ہے۔ یعنی ایسا معاشی نظام جو سوشلزم کے معاشی نظام کے تو ماثل ہے لیکن جو، سوشلزم کے نہیں، بلکہ قرآن کے اپنے فلسفہ حیات کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔

(۵) جہاں تک "خدا کو ماننے" کا تعلق ہے، قرآن، جماعت مومنین کے علاوہ کسی کو بھی خدا پر ایمان رکھنے والا تسلیم نہیں کرتا۔ دوسروں کے متعلق اس کا اعلان یہ ہے کہ

فان امنوا بمثل ما امنتم بہ فقد اھتدوا (۲۳۱)

اگر یہ لوگ (جو خدا پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں) اس طرح خدا پر ایمان لائیں جس طرح تم ایمان

لائے ہو، تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ صحیح راستے پر ہیں۔

لہذا، جہاں تک اسلامی آئیڈیالوجی کا تعلق ہے، خدا پر ایمان رکھنے کے مدعی (یہود و نصاریٰ) اور منکرین خدا (کمیونسٹ) ایک سطح پر ہیں۔ لیکن جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے، نظام سرمایہ داری اسلام کی ضد ہے اور اشتراکی نظام اس سے اقرب ہے۔

اسلام کے معاشی نظام کے مؤیدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے موقف کی وضاحت مذکورہ صدر انداز سے کریں تاکہ نظام سرمایہ داری کے حامیوں کے لئے، عوام کو لفظی گورکھ دھندوں میں الجھا کر فریب دہی کی گتچائش نہ رہے۔ اور وہ نظام سرمایہ داری کی حمایت کرنا چاہیں تو کھل کر سلتے آئیں۔ اس وقت ان کا انداز یہ ہے کہ وہ سوشلزم کی مخالفت میں اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ اس میں خدا و وحی رسالت۔ آخرت کا انکار ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد اسلام کے متعلق فقط اتنا کہہ دیتے ہیں کہ اس میں تمام دنیا کی مشکلات کا حل موجود ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں بتاتے کہ اسلام کا وہ نظام کیا ہے جس میں (کم از کم) انسان کے معاشی مسئلہ کا حل موجود ہے۔ وہ جب اس قسم کا مبہم دعویٰ کریں تو ان سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ بتائیں کہ وہ نظام کیا ہے جس کے متعلق وہ اس قدر بلند آہنگ دعویٰ کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ اس کا مستحق جواب ان کی طرف سے کبھی نہیں ملے گا۔

یاد رکھیے۔ انسانیت کی فلاح صرف قرآن کے اشتراکی نظام سے ہو سکتی ہے۔ اور وہ نظام اس کے نظام کلی کا ایک جزو ہے جو اس کی اپنی آئیڈیالوجی پر متفرع ہے۔
اگر بائیں نرسیدی تمام بولہبی است

(اگست ۱۹۶۷ء)



نظامِ رُبوبیت کب قائم ہوگا؟

(پرویز)

مجھ سے اکثر احباب پوچھتے رہتے ہیں رہا لہذا نہ بھی اور خطوط کے ذریعہ بھی، کہ نظامِ رُبوبیت جس کا تصور میں ایک عرصہ سے پیش کر رہا ہوں، وہ بالآخر کب قائم ہوگا؟ مجھے ان احباب کی بیانیہ تمنا کا پورا پورا احساس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ معاشرہ کے حالات جس قدر خراب ہو چکے ہیں ان سے اس طبقہ پر کیا گذر رہی ہے جو پوری پوری محنت و مشقت اور سعی و کوشش کے باوجود، اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریاتِ زندگی پوری نہیں کر سکتے۔ ان کے حالات سننا ہوں تو دل خون ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان کی ان مصیبتوں کا علاج — اتنا ہی نہیں بلکہ بے شمار خرابیوں کا علاج — قرآنی نظامِ رُبوبیت کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ نظامِ انفرادی طور پر قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ ملک کے وسائل پیداوار، تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لئے ملت کی اجتماعی تحویل میں ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ انتظام، حکومت کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے میں پہلے دن سے، نہایت صراحت اور وضاحت سے پیش کرتے چلا آ رہا ہوں۔ اور اس کے لئے میرا تو لیں مخاطب، برسرِ اقتدار طبقہ ہوتا ہے، کہ اگر بات ان کی سمجھ میں آجائے اور وہ اس قرآنی مشن کو پورا کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں تو اس نظام کے قائم ہونے میں نہ دیر لگ سکتی ہے نہ وقت پیش آ سکتی ہے۔ ہمارا دور آئینی ہے اور مملکت کے نظام میں ہر تبدیلی آئینی طور پر ہی پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس کے لئے دوسری صورت یہ ہے کہ اس تصور کو ملک میں اس قدر عام کیا جائے کہ یہ جمہور کا تقاضا بن جائے اور وہ ایسے افراد کو اپنا نمائندہ منتخب کر کے مجالسِ توائین ساز میں بھیجیں جو اس نظامِ خداوندی کی صدا پر

علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہوں اور اسے عملاً متشکل کرنے کا عزم لے کر ان مجالس میں جائیں۔ میں جو اس فکر کو اپنی بساط کے مطابق عام کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تو اس سے یہی مقصد ہے۔

۲۔ بعض احباب یہ تجویز لے کر آتے ہیں کہ جو لوگ اس تصور سے متفق ہیں وہ ایک محدود شکل میں اپنے طور پر اس نظام کو قائم کیوں نہیں کر لیتے۔ ان کی تجویز کا ملخص یہ ہوتا ہے کہ یہ احباب ایک چھوٹی سی بستی بسالیں جس میں اس تصور کو عملی شکل دے کر اپنی زندگی اس پنج پر بسر کریں۔

یہ تجویز نئی نہیں۔ یہ برسوں سے میرے سامنے لائی جا رہی ہے اور متعدد بار اس پر غور و خوض ہو چکا ہے۔ اور اسے ناقابل عمل پایا گیا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ جب آپ اس قسم کے انفرادی نظام کی آڈا بلند کریں گے، اس پر لٹیک کہنے والوں میں (زیادہ نہیں تو کم از کم) نوٹس فی صد (HAVE - NOTS) یعنی وہ لوگ ہوں گے جن کی آمدنی ان کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کفایت نہیں کرتی۔ اور (شاید) دس فی صد لوگ ایسے ہوں جو اپنی ضروریات پوری کر سکیں یا جن کے پاس ضروریات سے کچھ زائد ہو۔ میں احباب کو مایوس نہیں کرنا چاہتا لیکن میرا خیال ہے کہ میرا یہ اندازہ کبھی کچھ خوش نہیں ہی پر مبنی ہے۔ جن کے پاس ضروریات سے نائد دولت ہو، وہ بہت کم ادھر آئیں گے۔ اب آپ سوچئے کہ جو نظام ان احباب پر مشتمل ہوگا جو اپنی کمائی سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہ ہوں، اور ایسے لوگ اس میں شامل نہوں جن کے پاس ضرورت سے زیادہ ہو وہ چل کیسے سکے گا؟

اس کے بعد ایک بڑی دشواری اور سامنے آتی ہے۔ اس قسم کا نظام قائم کرنے کے لئے سمجھنا ہے کہ زائد از ضروریات دولت رکھنے والے حضرات کے افراد خاندان — ان کے بیوی بچے اور دیگر متعلقین — سب اس فکر سے متفق اور اس رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ ان کے دلی تعاون کے بغیر یہ نظام ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک الگ جماعت قائم کرنا — چہ جائیکہ ایک الگ بستی بسانا — تو میری دعوت کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ اسی سے فرقہ بندی کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر اس تجویز کو نہ اس سے پہلے کبھی قابل عمل سمجھا گیا۔ اور نہ ہی اب رد خوراعتنا سمجھا جاتا ہے۔ نامساعد حالات کے ہاتھوں پس چلنے والے احباب کی بیانیہ تمنا بجا اور درست۔ لیکن اس کا علاج پورے معاشرہ کے نظام میں تبدیلی کے سوا کچھ نہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر

عرض کیا ہے۔ ان مصیبت زدہ احباب کی داستانِ غم و الم سن کر جو کچھ میرے قلبِ حساس پر بتی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اس سے میرے سینے میں بھی جذبات کے کچھ کم تلام انگریز طوفان نہیں لٹتے۔ لیکن میں شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتا۔ رنہ ہی کسی کو ایسا قدم اٹھانے کا مشورہ دے سکتا ہوں) جس کا نتیجہ ماپوسی اور افسردگی کے سوا کچھ نہ ہو۔

۲۔ بعض حضرات یہ اعتراض بھی پیش کرتے ہیں کہ اس معاشی نظام کو قانون کے ذریعے نافذ کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمانوں کو ایک خاص قسم کا نظام قبول کرنے کے لئے مجبور کیا جائے گا۔ یہ کیسے درست ہو سکتا ہے؟

سوال یہ ہے کہ یہ نظام، اسلام کا تجویز کردہ ہے یا نہیں۔ اگر یہ اسلامی نظام نہیں تو اسے قانوناً نافذ کرنا تو ایک طرف، اگر مسلمان اسے بطیبِ خاطر بھی اپنے ہاں راج کرنا چاہیں تو ان کا یہ اقدام سراسر غلط ہوگا اور ایک اسلامی حکومت کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس کی روک تھام کرے۔ لیکن اگر یہ نظام، اسلام کے مطابق ہے، تو پھر اس کا قانوناً نافذ کرنا مسلمانوں پر جبر کرنے کے مراد نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ بطیبِ خاطر اس کا اقرار کرتا ہے کہ وہ ہر اسلامی فیصلہ کو قبول اور اختیار کرے گا۔ مثلاً شرابِ زخم کا استعمال اسلام میں ممنوع ہے۔ اگر حکومت، اس کا استعمال از روئے قانون نا جائز قرار دیدے تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ حکومت نے ان مسلمانوں پر جبر کیا ہے جو شراب نہیں پھوڑنا چاہتے تھے۔ مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر قرآنی فیصلہ کے سامنے تسلیم خم کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تو اس کے لئے یہ راستہ کھلا ہے کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے۔

لہذا، قرآن کے معاشی نظام کا، قانون کی رو سے نفاذ، مسلمانوں پر جبر نہیں کہلا سکتا۔ ایسے ہی جیسے کسی کمیونسٹ پر کمیونزم کے معاشی نظام کا قانوناً نفاذ، جبر نہیں کہلا سکتا۔ میری کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں پر اس حقیقت کو واضح کر دیا جائے کہ نظامِ ربوبیت، قرآن کریم کا تجویز کردہ نظام ہے اور اس کا اپنے ہاں راج کرنا عین اسلام کا تقاضا۔

۳۔ اس سلسلہ میں، میں اتنا اور عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میری دعوت صرف نظامِ ربوبیت کا قیام نہیں۔ یہ تو اس دعوت کا ایک گوشہ ہے۔ میری دعوت کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ

اسلام، جو خدا کے عطا کردہ دین کے بجائے، انسانی ذہنوں کا تراشیدہ مذہب بن کر رہ گیا ہے، اسے پھر سے اس کی اصلی اور حقیقی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، اور اس طرح قرآن کی شمع آسمانی کو جس پر انسانوں کے خود ساختہ تصورات، نظریات، معتقدات اور رسوم و رواج کے دبیر پردے پڑ چکے ہیں، پھر سے وجہ تباہی، محفل انسانیت بنایا جائے۔ اگر دین اپنی حقیقی شکل میں مسلمانوں کے سامنے آجائے تو پھر نظام ربوبیت کا قیام اس کا فطری نتیجہ ہوگا۔ اس وقت اس کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے خود ساختہ "مذہب" کا وجود ہے۔ یہ ہے میری بنیادی دعوت اور یہ ہے میری تمام کوششوں کا منہتی ردِ قصور۔ اس نے صرف ہمارے نظامِ معیشت میں تبدیلی آئے گی بلکہ زندگی کا ہر گوشہ خوشگوار آسمانی انقلاب سے ہم آغوش ہوگا، جس سے پھر وہ انسانیت ساز فضا و جہ برومندی دل و دماغ ہوگی تو ایک باز سرزمین حجاز میں، محمد رسول اللہ والذین معہ (رض) کے مقدس ہاتھوں آئینہ پوش ہوئی تھی اور جسے دوبارہ دیکھنے کیلئے انسانیت کی آنکھیں ترس رہی ہیں۔ اللہ الحمد کہ اس باب میں مجھے جو کامیابی ہوئی ہے وہ میری توقعات سے کہیں بڑھ کر ہے۔ میں جب اُس فضا پر نگاہ ڈالتا ہوں جس میں یہ آواز آج سے پچیس تیس برس پہلے بلند کی گئی تھی، پھر اپنی بے سرد سامانی پر نظر ڈالتا ہوں، اور اس کے بعد یہ دیکھتا ہوں کہ آج کس طرح ملک کے گوشے گوشے تک یہ آواز پہنچ چکی ہے اور اس نے کس طرح فضا میں ایک خوشگوار ارتعاش اور امید افزا تحریک پیدا کر لیا ہے، تو میرا سہر نیاز بارگاہِ ایزدی میں، ستانہ وار جھک جاتا ہے۔

(ماؤج ۱۹۶۵ء۔ باضاد ستمبر ۱۹۶۶ء)